ہم کہ ٹھہرے اجنبی
حمیدی
PAK Society
LIBRARY OF PAKISTAN
ONE SITE ONE COMMUNITY
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

رضیہ سلطانہ

انتساب

میری دوسری کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔!

میرے بچوں سعادت علی، تسنیم علی

عائشہ شہزادا ور ننھی سی گڑیا سمعیہ کے نام

جن کا وجود میرے لئے سرمایہ حیات ہے۔

فہرست

ابتدائیہ

ایک مصور جب تصویر بناتا ہے تو اس میں اپنے جذبات خیالات اور تاثرات سب ہی کچھ شامل کرتا ہے تب کہیں جا کر ایک شاہکار بنتا ہے۔ سنگتراش ایک مجسمے میں اپنی تمام تر کاوشیں بروئے کار لا کر اپنی تخلیق پر نازاں ہوتا ہے کہ لوگ اسے خراج تحسین پیش کریں گے اور وہ شہرت کی بلندوں کو چھو لے گا، یہ وہ کارنامے ہیں جو انسان سرانجام دیتا ہے۔

لیکن جب مالک کائنات انسان کی تخلیق کرتا ہے تو اس میں اس کا پرتو شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اسم اعظیم ننانوے ہیں یعنی وہ غفور بھی ہے رحیم بھی قہار بھی ہے تو جبار بھی، رحم و کرم کرنے والا ہے تو کبھی کبھی جلال بھی دکھاتا ہے۔ اگر ننانوے کا عدد نکالیں تو نو کا ہندسہ بنتا ہے۔ اس طرح عددوں میں سب سے بڑا عدد نو کا ہے۔ اپنے اعتبار سے نو کا عدد جلالی ہے۔ سات کا ہندسہ روحانیت کی علامت ہے۔ اس عدد کے حامل افراد روحانیت پر اسرا علوم اور علم غیب سے تعلق رکھتے ہیں۔ دنیا میں عزت شہرت بھی حاصل کرتے ہیں۔ حساس اور خدمت خلق کے جذبے سے سرشار ہوتے ہیں۔

ہر انسان میں ان ننانوے اسم اعظم میں سے کچھ نہ کچھ صفات کسی حد تک ضرور ہوتی ہیں کیونکہ انسان کو پیدا کرنے والی ہستی ننانوے صفات کی حامل ہے۔ مثلاً کوئی ظالم ہے یعنی قہار تو کوئی بہت زیادہ رحم و کرم کرنے والا نیک صفت بھی ہوتا ہے، کوئی سخی کہلاتا ہے تو کوئی اصول وضابطے اور عدل سے مبرا ہوتا ہے یوں کہنا چاہئے کہ ہر انسان میں دو تین یا چھ سات خوبیاں ہوتی ضرور ہیں۔ نبیوں اور پیغمبروں میں یہ خوبیاں یا صفات زیادہ ہوتی ہیں اس لئے وہ عام لوگوں سے ہٹ کر اور منفرد کردار کے حامل ہوتے ہیں اور ان کا رتبہ بلند ترین ہوتا ہے۔ ان کی پہچان ان کا کردار، گفتار اور طرز زندگی ہوتا ہے جس کی پیروی کرنا لوگ اپنی خوش قسمتی سمجھتے ہیں

بعض اوقات کچھ لوگوں میں کچھ خوبیاں یا صفات بہت زیادہ ہوتی ہیں جس کی وجہ سے وہ تاریخ کا حصہ بن گئے ہیں۔ مثلاً چنگیز خان، ہلاکو خان، ہٹلر، مسولینی، روس کا ظالم حکمراں پیٹر دی گریٹ، سوتیلا نہ، اس کے علاوہ سخت حکمران کے طور پر حجاج بن یوسف جس نے ڈیڑھ لاکھ باغیوں کو قتل کیا اور موجودہ دور میں امریکہ

کا صدر بش جس کی وجہ سے عراق میں تقریباً اب تک سات لاکھ افراد لقمہ اجل بنے۔ افغانستان میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد اس میں شامل نہیں ہے۔ ایسے لوگ بھی گزرے ہیں جن میں جذبہ حب الوطنی کے علاوہ رحم و کرم محبت اور شفقت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا جیسے بنو امیہ کے دور میں عمر بن عبدالعزیز بیسوی صدی میں مدر ٹریسا، نیلسن منڈیلا اور موجودہ دور میں ستار ایدھی کو ہم عظیم انسانوں میں شامل کرتے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوا کہ ہر انسان میں مختلف خوبیاں ضرور ہوتی ہیں اور وہ مالک کائنات کی ان خوبیوں کی عکاسی کرتی ہیں کہ انسان ایک مکمل نناوے صفات پر مشتمل پاک ذات ہستی کی تخلیق کردہ مخلوق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات کہا تو شیطان کو اعتراض ہوا کہ آگ سے پیدا کئے گئے فرشتے پر مٹی سے پیدا کئے گئے انسان کو فوقیت دی گئی۔ اس نے حکم عدولی کی تو قیامت تک کے لئے اسے ابلیس کا لقب دے کر اس کے برسوں کی عبادت و ریاضت کو زیرو کر دیا گیا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان افضل ہے۔ وہ اللہ کا نائب ہے، انسان کی عبادت، ریاضت اس کی ہر نیکی اللہ کو پسند ہے اس کے قدم ڈگمگاتے ہیں تو تنبیہ کے طور پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ خواہ قحط ہو، زلزلہ، طوفان، یا وبائی امراض، یہ سب کچھ سنبھلے، سدھرنے اور عبرت حاصل کرنے کیلئے ہوتا ہے مکمل ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اسکی اطاعت ہمارا ایمان ہے۔ توحید، نماز، روزے، زکوٰۃ، حج یہ سب ایک مسلمان پر فرض ہیں۔ ان پانچ ارکان میں سے ایک بھی دیدہ و دانستہ یا مصلحتاً کم کیا جائے گا۔ تو وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہو جائے گا۔ یہ اللہ کا فرمان ہے۔

اس دنیا میں جہاں کہیں بھی ہیں وہ نماز، روزہ، اس کے علاوہ زکوٰۃ، حج اور عمرہ بھی کرتے ہیں ایسے مومن بھی ہیں جو اب بھی مشکل ترین حالات میں جہاد کر رہے ہیں۔ کس کی نماز قبول ہوگی، کس کے روزے قبول ہو جائینگے۔ اس کے علاوہ حج اور عمرہ کس کا معتبر مانا جائے گا، یہ اللہ اور بندے کے آپس کا معاملہ ہے۔ دنیا میں ایسا کوئی پیمانہ ایجاد نہیں ہوا جو یہ ثابت کر دے کہ کون سا بندہ اللہ کے نزدیک پیارا ہے، وہ کسے کس انداز میں نواز رہا ہے، وہ کس بندے کو کیا توفیق عطا کرتا ہے، وہ جس سے جو کام لینا چاہتا ہے وہ لے لیتا ہے، کسی دوسرے کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔

بعض اوقات ایسے واقعات بھی سننے اور دیکھنے میں آئے ہیں کہ ایک شخص بہت ہی برا اور ظالم تھا مگر اچانک ہی وہ بدل گیا، متقی اور پرہیز گار بن گیا۔ یہ منجانب اللہ ہی تھا۔ پتہ نہیں اس بندے سے وہ کیا کام لینا چاہتا تھا کہ اسے راہ راست پر لے آیا۔ بسا اوقات ایک نیک، متقی اور پرہیز گار شخص بہک گیا اور برائیوں میں مبتلا ہو گیا، ایسے واقعات عام ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ زیادہ پڑھ لکھ کر کمیونسٹ، سوشلسٹ اور دہریے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ناقص عقل سے اپنا راہ خود ہی متعین کر لیتے ہیں۔ مغرب کی تقلید میں اپنے دین اور مذہب کو فرسودہ سمجھ کر ماڈرن کہلوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں، یہ ان کے ایمان اور کردار کی کمزوری ہے۔ ہمیں اپنے ایمان اور کردار کو مضبوط بنانے کی ضرورت ہے۔ جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی علوم کے ساتھ ساتھ کتاب اللہ کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے دنیا اپنے منطقی انجام کو پہنچ رہی ہے۔ دنیا کا جغرافیہ تبدیل ہو گیا ہے۔ جہاں بہت سردیاں پڑتی تھیں وہاں گرمیاں پڑنے لگی ہیں اور جہاں سردیاں برائے نام ہوتی تھیں وہاں زیادہ سردیاں پڑ رہی ہیں۔ تقریباً تمام دنیا میں بارشیں اور قدرتی آفات بہت بڑھ گئے ہیں دنیا میں حادثات یعنی فضائی حادثے اس کے علاوہ روڈ ایکسیڈنٹ کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا ہے قسم قسم کی بیماریوں نے لوگوں کو اپنے حصار میں لینا شروع کیا ہے یعنی برڈ فلو، ڈینگی وائرس، کانگو وائرس یہ بیماریاں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ کینسر اور ایڈز جیسے موذی امراض پہلے ہی سے موجود ہیں۔ یہ تمام امراض قدرت کی طرف سے انسانوں کو عبرت حاصل کرنے اور ان کے گناہوں کے بوجھ کو کم کرنے کی وارننگ کہے جا سکتے ہیں۔ قطبین کی برف مسلسل پگھل رہی ہے جس کی وجہ سے سطح سمندر کی بلندی میں اضافہ ہو رہا ہے۔ یہ برف درجہ حرارت کے بڑھنے کی بناء پر پگھل رہی ہے۔ درجہ حرات میں اضافہ انسان خود کر رہا ہے۔ صنعتی ترقی ماحول کی آلودگی کا سبب بن رہی ہے۔ اس کے علاوہ دنیا بھر میں ایٹمی تجربات، بموں اور میزائلوں کی بارش نے فضاء کو پراگندہ کر دیا ہے۔ جس دن سمندر بپھر گئے تو تمام دنیا کو اپنے اندر سموں لیں گے۔

موجودہ دور نفسانفسی کا ہے۔ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کے چکر میں ہم تیز سے تیز دوڑے چلے جا رہے ہیں۔ ہمارے پاس اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں دیکھنے کا وقت نہیں ہے۔ عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ اگر چند لمحے بھی رک کر غور کیا جائے کہ ہم کیا کر رہے ہیں تو شاید یہ کچھ سنبھل جانے کا

موقع مل جائے اس وقت ہمیں اپنے اطراف کے حالات اور واقعات کے مطالعے کی ضرورت ہے تحمل، ثابت قدمی اور عقلمندی سے آنے والے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔فلسفۂ اسلام کو سمجھ کر عام کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے۔ جان اور مال کی سلامتی ہمارے مذہب کا طرۂ امتیاز ہے ''نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملاّ خطرہ ایمان' والی کہاوت سے گریز کرنا ہوگا۔ والدین اپنے فرائض کو سمجھیں اور یہ دیکھیں کہ ان کے بچوں کا رجحان کہاں ہے۔ وہ غلط لوگوں کے ساتھ تو راہ رسم نہیں بڑھا رہے ہیں۔ ناظرہ قرآن کی تعلیم دینے والے ان کی برین واشنگ تو نہیں کر رہے ہیں مگر صحیح تربیت میں ''ماں'' کا کردار اولیت کا حامل ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو صحیح معنوں میں اسلام کی عظمت اور بلندی کے متعلق بتائیں۔ اسلامی جنگی معرکوں میں ہمارے نبیؐ اور صحابہ کرام نے انسانی جانوں کے تحفظ کا بہت خیال رکھا۔ خاص طور پر عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو چھونے تک کی ممانعت کی تھی۔ اس کے علاوہ کھیتوں اور کھلیانوں کو تباہ و برباد کرنے سے روکا تھا پھر وہ کون سے نوجوان ہیں جو خود کش دھماکوں کو اسلام کی سربلندی کہہ کر زندہ درگور ہو جاتے ہیں وہ جنتی نہیں بلکہ جہنمی ہیں وہ نیم ملا کون ہیں جو معصوم کم عمر نوجوانوں کو گمراہ کر کے ہلاکت پر مجبور کر دیتے ہیں؟ اس طریقے سے اسلام کو بدنام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نماز پڑھنے اور داڑھی رکھنے والوں کو دیکھ کر غیر ملکی اور خود دیگر ممالک کے مسلمان خوفزدہ ہو جاتے ہیں کیا ہمارے نبیؐ نے ہمیں یہ سبق دیا تھا؟ نہیں! ہرگز نہیں! ہم نے مذہب اسلام کا نظریہ کیوں تبدیل کر دیا۔ دہشت گردی کا لیبل خود پر چسپاں کرا دیا۔

ان تمام باتوں اور واقعات میں ارباب اقتدار بھی شامل ہیں۔ انہوں نے تعلیمی میدان میں کبھی دلچسپی نہیں لی۔ وڈیروں، جاگیرداروں اور ملکوں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے عام لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روکا۔ غریب دو وقت کی روٹی کیلئے غیر ملکی ایجنٹوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔ کم علمی کے باعث ان کی برین واشنگ ہوتی رہی۔ روپے کی چمک دمک اور جذباتیت نے کم عمر نوجوانوں کو باغی بنا دیا اور انہوں نے اسے معاشرے سے اپنا انتقام لینے کا ایک ذریعہ بنا لیا، اگر چھوٹے چھوٹے گاؤں، دیہاتوں میں تعلیم عام ہوتی تو ان میں روشن خیالی اور ذہنی وسعت پیدا ہوتی پھر اس طرح کے دل ہلا دینے والے واقعات نہ جنم لیتے۔ ابھی حال ہی میں شمالی وزیرستان میں اساتذہ کو تعلیم دینے سے وہاں کے چند انتہا پسندوں نے روک دیا ہے۔ یہ

وہی بیج ہے جو ہمارے حکمرانوں نے بویا اور آج ہماری نسلیں اسے کاٹ رہی ہیں۔ یہ بات غور طلب ہے۔

نظریات اور خیالات زور زبر سے تبدیل نہیں ہوتے اور نہ ہی چڑھائی کر دینے سے مقصد حاصل ہوتا ہے۔ ان تمام حساس معاملات کو پیار و محبت سے مذاکرات سے حل کرنے کی ضرورت ہے۔ فوجی آپریشن سے حالات بگڑنے اور الجھنے کا سبب بن سکتے ہیں جبکہ ان کو اس انداز میں سلجھانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔

میں نے اپنی پچھلی کتاب...... ''بول کے لب آزاد ہے تیرے'' میں مندرجہ بالا بہت سی باتوں کی عکاسی کی تھی اور اس کا تجزیہ کیا۔ میری یہ موجودہ کتاب مختلف افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں معاشرے کے چھوٹے بڑے مسائل کو میں نے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس میں کس حد تک کامیاب ہوں یہ فیصلہ قارئین کریں گے۔ اس مجموعے میں تین افسانے ایسے ہیں جس میں حقائق اور اہم واقعات کو میں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ''ایک معمہ ہے'' یہ افسانہ میں نے زلزلہ زدہ علاقوں کو دیکھنے کے بعد لکھا، وہاں کے سنگین اور دل ہلا دینے والے واقعات، حالات اور مسائل کو قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی ہے تاکہ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی اس سانحے کو سمجھیں اور محسوس کریں کہ زلزلے کے بعد کی ہولناکی کتنی بھیانک ہوتی ہے۔ اجڑا ہوا شہر کتنی مدتوں بعد آباد ہوگا اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے جبکہ برسوں کی محنت اور کثیر سرمائے سے تعمیر کی گئیں عمارتیں پلک جھپکتے زمین بوس ہوگئیں۔ یہ حکومت کے ساتھ ساتھ وہاں کے مکینوں کیلئے بھی ایک چیلنج ہے۔

ایک اہم افسانہ ''بیس سال بعد'' یہ افسانہ کراچی اور حیدرآباد میں پیش آنے والے خونیں فسادات کی عکاسی کرتا ہے جس میں ہزاروں افراد اور نوجوانوں کو دیدہ و دانستہ شہید کیا گیا۔ یہ سندھ خاص طور پر کراچی اور حیدرآباد کی بیس سال پر محیط ایک ایسی تاریخ ہے جو کبھی بھی نہیں بھلائی جا سکتی۔ 1947ء میں قیام پاکستان کے بعد ہزاروں نوجوانوں کے قتل عام کا واقعہ ان فسادات نے تازہ کر دی تھی۔ جس پر آج بھی ہر آنکھ اشکبار ہے۔

''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' یہ افسانہ میں نے 1999ء میں لکھا۔ یہ مسلمان لڑکی کی کہانی ہے جس میں ایک ہندو نوجوان اچانک اس کی زندگی میں آ جاتا ہے مگر مذہب اور معاشرے کی وجہ سے وہ اپنا راستہ بدل لیتی ہے کردار کی مضبوطی، ایمان اور تربیت کی پختگی اسے اپنے مسلک سے ہٹنے نہیں دیتی۔ اس میں میں نے ہندو

اور مسلمان معاشرے اوران کی طرز زندگی کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔اس افسانے میں انسانی فطرت کے نرم و گداز گوشے بھی ہیں جو بہکنے کا سبب بن سکتے تھے مگر کردار نے لغزش پیدا نہیں ہونے دی۔اس کو پڑھ کر قاری اس ماحول میں کھو جائے گا۔

اس کے علاوہ افسانہ "روپ بہروپ" میں نے 1978ء میں لکھا جب میں سات رنگ ڈائجسٹ کی مدیرہ تھی۔چونکہ بنیادی طور پر میں ایک صحافی ہوں۔گذشتہ بیس پچیس سالوں سے میں اس شعبے سے وابستہ رہی ہوں لہٰذا کئی افسانے میں نے صحافت کے پس منظر میں لکھے،جس میں،میں نے صحافیوں کے مختلف مسائل اوران کی کارکردگی کو تفصیل سے قلمبند کرنے کی جرأت کی ہے۔کامیابی کا فیصلہ آپ قاری خواتین و حضرات کریں گے۔

اس کے علاوہ کئی افسانے انسانی نفسیات کی مبنی ہیں جس میں،میں نے انسانی فطرت اور جذبات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔افسانوں کے کردار تو فرضی ہیں مگر حالات و واقعات حقائق پر مبنی ہیں۔زیادہ تر وہ حالات ہیں جس سے ہم سب گزر چکے ہیں۔کردار کے بغیر اردگرد کے ماحول کا تجزیہ کرنا ناممکن ہے۔افسانے انسانی معاشرے ہی میں جنم لیتے ہیں۔خیالی قصے وہ کہانیاں ہوتی ہیں جو ہم پشت در پشت اپنے بچوں کو سناتے چلے آرہے ہیں،جیسے بادشاہ اور جن بھوتوں کی خیال کہانیاں،مگر افسانے معاشرے میں جنم لینے والی وہ حقیقت ہوتی ہے،جس کی تلخی اور مٹھاس ہمارے وجود میں سمجھا جاتی ہے۔جس کے سبب انسان کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی اداس،یہی خوشی اور اداسی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ہمیں اسے صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرنا ہوتا ہے اور ہم کرتے ہیں،کیونکہ یہی زندگی ہے۔آپ کا کیا خیال ہے؟

18 اکتوبر 2006ء

کچھ بیان اپنا

بچے تین شخصیات سے بہت مرعوب ہوتے ہیں اور ان سے والہانہ پیار کرتے ہیں۔ ''ماں'' وہ شخصیت جس کی محبت کی نہ کوئی حد ہوتی ہے اور نا ہی اس کا نعم البدل اس کے بعد ''باپ'' جس کا وجود اور سایہ بچے کی نشونما کے ساتھ ساتھ اسے معاشرے میں مقام دلانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ علاوہ ازایں مالی استحکام حاصل کرنے کے لئے وہ خود کو فنا کر دیتا ہے۔ چار دیواری کا تقدس مرد کی بدولت ہی قائم رہتا ہے۔ وہ بچے جن کے ماں باپ کا سایہ ان کے سروں پر قائم ہے وہ زمانے کی نرمی اور گرمی کا مقابلہ آسانی سے کرتے ہیں جبکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی ایک کسی وجہ سے موجود نہ ہو تو ایسے بچوں کی پوری شخصیت بکھر کر رہ جاتی ہے اور وہ معاشرے میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے نبی ﷺ نے یتیموں کی خاص طور پر دیکھ بھال کر کرنے اور شفقت سے پیش آنے کا حکم دیا ہے۔

''استاد'' اہم ترین شخصیت اور بچوں کا آئیڈیل ہوتی ہے بہت سے بچے اپنے استاد یعنی ٹیچر کی کاپی کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کاپی کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ وہ اپنے استاد کو پسند کرتے ہیں۔ ماں باپ کے بعد بچوں کی زندگی میں سب سے زیادہ اثرات یہی اساتذہ مرتب کرتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ زمانے کی اونچ نیچ اور اچھے برے کی تمیز ''استاد'' ہی بتاتے ہیں، لہٰذا ایک بچے کی پوری زندگی ان ہی تین شخصیات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ معاشرے میں عزت اور مقام حاصل کرنے کے لئے ان تینوں شخصیات کا احترام کرنا لازمی ہے۔ اللہ اور ہمارے نبی ﷺ کا بھی یہی فرمان ہے۔

مجھے بھی میرے ابو سے بہت محبت تھی۔ تمام بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھی اس لئے مجھے ان سے قریب اپنے اور زیادہ عرصے ساتھ گزارنے کا موقع ملا۔ وہ بہت زیادہ محنتی، ایماندار، اصول کے پابند اور سچ بولنے والے انسان تھے۔ وہ سادگی سے زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ہمیں بھی سادگی اپنانے کی تلقین کرتے تھے۔ تقریباً نو سال قبل ان کا انتقال ہوا۔ زندگی کا ایک طویل عرصہ ان کے ساتھ گزارا مگر آج بھی ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ حساس طبیعت کی بناء پر میں کبھی بھی ان کو نہ بھلا سکی۔

میری ننھیال، ددھیال اور سسرال ان تینوں کا تعلق مذہبی گھرانے سے ہے۔ مذہب سے ان کی وابستگی ایسی نہیں کہ انہیں بنیاد پرست کہا جائے۔ صوم وصلوٰۃ کی پابندی، اللہ اور رسول اکرمؐ سے عقیدت ومحبت کے علاوہ پردے کی پابندی پر سختی سے کاربند رہنا، یہ ہمارے تینوں گھرانوں میں مشترک ہے۔ میں نے پردے کی پابندی کبھی نہیں کی، ہاں البتہ ذہنی اعتبار سے میں نے ہمیشہ اسلام کے اصولوں، ضابطوں پر عمل کیا۔ کسی کی دل آزاری نہیں کی نہ زیادتی کی اور نہ ہی کسی کے ساتھ زیادتی ہونے دی۔ سچ کہا اور سچ لکھا۔ میں نے اپنے ضمیر اور قلم کی بے توقیری کبھی نہیں کی، جو دیکھا، محسوس کیا وہ لکھا۔ یہ حوصلہ اور جرأت مجھے اپنے مذہب اور خاندان سے ورثے میں ملی۔

میرا تعلق ہندوستان کی ریاست میسور سے ہے۔ اس سرزمین سے جو سلطان ٹیپو شہید سے منسوب ہے، جن کا ایک ہی قول اس سرزمین سے تعلق رکھنے والوں کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہے

یعنی "گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"

شیر کی زندگی جینے والے گیدڑ کی موت مرنا اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ سچ لکھ کر مرنا زیادہ بہتر ہے کہ جھوٹ کی لفاظی سے اپنے ضمیر اور شخصیت کی پراگندہ کیا جائے۔ میری ننھیال کا روحانی سلسلہ رہا ہے۔ یہ روحانیت کم وبیش مجھ تک بھی منتقل ہوئی۔ بچپن سے جوانی اور جوانی سے آج تک بے شمار/خواب اور حیرت انگیز واقعات مجھ پر آشکار ہوتے رہے۔ آنے والے واقعات کا علم مجھے اکثر پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ اس حوالے سے رئیس امروہوی مرحوم نے 1977ء میں مجھ پر روزنامہ جنگ میں لگاتار دو جمعہ اپنا کالم لکھا۔ میرا بچپن زیادہ تر ان کی ادبی محفلوں میں گزرا۔ وفاق کی زیادتی، صوبوں کے ساتھ عدم توجہی، خاص طور پر صوبہ سندھ سے وفاقی حکومت کی لاتعلقی نے مہاجروں کی تحریک کو رئیس امروہوی کے گارڈن ایسٹ کے وسیع لان نے جلا بخشی، جہاں روزانہ مختلف سیاسی، سماجی، ادبی شخصیات شام کے وقت اکٹھی ہو کر اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتیں۔ ان میں سید محمد تقی مرحوم کا بھی خاص کردار رہا، جب مہران رائٹر گلڈ بنائی گئی تو اس کے صدر رئیس امروہوی مرحوم تھے جبکہ جنرل سیکریٹری مرحوم اختر فیروز اور میں جوائنٹ سیکریٹری تھی۔

مہران رائٹرز گلڈ سے قبل رئیس صاحب نے بنگلہ دیش سے ہجرت کر کے آنے والے بہاریوں کے

لیے اورنگی ٹاؤن میں رئیس امروہوی کالونی بنوائی۔ اس حوالے سے ان کی بڑی خدمات ہیں۔

ستر کی دہائی کے بعد نو ستاروں کا اتحاد بنا تھا جو کہ اس دور کی حکومت کے خلاف تھا۔ اس دور میں ''اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے'' رئیس امروہوی مرحوم کا ضرب المثل مصرعہ تھا جو ایک سیاسی نعرہ اور ترجمان بن گیا۔

5 جولائی 1977ء کو جب فوجی آمر ضیاء الحق نے اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالی اور نوے دن بعد الیکشن کروانے کا وعدہ کیا۔ ان کے اقتدار سنبھالنے کے ایک ہفتہ بعد رئیس امروہوی کے ہاں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا۔ اس میں کئی سیاسی اور ادبی شخصیات موجود تھیں۔ ان میں میرے شوہر ضیاء شہزاد جو کہ اس وقت سات رنگ ڈائجسٹ کے مدیر اعلیٰ تھے وہ بھی شریک تھے۔

رئیس امروہوی نے تمام افراد سے باری باری ضیاء الحق کی شخصیت اور ان کے وعدے پر تبصرہ کرنے کیلئے کہا۔ ان میں سے کئی نے ضیاء الحق کی باتوں کا اعتبار کرتے ہوئے، کہا کہ وہ الیکشن ضرور کروائیں گے اور کچھ نے کہا شاید الیکشن نہ کروائیں۔ جب میری باری آئی تو انہوں نے مجھ سے میری رائے مانگی۔ میں نے اس وقت ان سے کہا تھا کہ ضیاء الحق دس سال سے پہلے نہیں جاتے، میں یہی محسوس کرتی ہوں۔ اس کے علاوہ نوے دن بعد الیکشن کروانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ دس سال بعد بھی خود نہیں جائیں گے۔ انہیں اللہ ہی لے جائے گا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور وقت نے ثابت کیا کہ وہ کیسے گئے؟

1977ء میں ضیاء الحق نے ذوالفقار علی بھٹو کو ایک فرضی مقدمے میں ملوث کرانے کے بعد پابندِ سلاسل کیا تو اس وقت میری لیڈی ڈاکٹر حمیدہ سلطانہ میمن جو جسٹس عبدالحفیظ میمن کی بیوی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ بھٹو کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس وقت میں نے ان سے کہا تھا کہ بھٹو کو پھانسی ہوگی۔

ڈاکٹر حمیدہ نے میری بات کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ وہ بھٹو کی زبردست فین تھیں۔ جب 4 اپریل 1979ء کو بھٹو کو پھانسی ہوئی تو انہیں میری بات پر یقین آیا۔ وہ آج بھی اس بات کو دہراتی ہیں کہ تمہاری پیشنگوئی صحیح ثابت ہوئی، اس دوران انہوں نے ضیاء الحق کے متعلق بھی پوچھا تھا کہ ضیاء کا انجام کیا ہوگا؟ میں نے برجستہ کہا تھا کہ بھیانک ہی ہوگا اور وہی ہوا۔۔۔ مجھے بچپن ہی سے پراسرار علوم سے ہمیشہ دلچسپی رہی۔

پامسٹری سے لگاؤ رہا مگر میری زیادہ تر پیشنگوئیاں ہاتھوں کے پرنٹ کے حوالے سے نہیں رہیں۔بس ذہن میں یکدم سے کوئی بات آئی، وہ کہہ دی پھر وہ سچ ثابت بھی ہوگئی۔ مجھے خود نہیں معلوم کہ میں یہ باتیں کیسے کہہ دیتی ہوں۔ یہ اللہ کی مہربانی ہے۔ایسی صلاحتیں اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے۔یہ باتیں انسان کے بس میں کہاں ہوتی ہیں۔ذرے کو آفتاب صرف وہی بنا سکتا ہے۔

میری صحافتی زندگی کا آغاز روزنامہ مساوات سے ہوا۔میں اس زمانے میں تعلیم بھی حاصل کر رہی تھی اور وہاں بھی مصروفیات رہتی تھیں پھر پاکیزہ ڈائجسٹ میں کام کیا اس کے بعد سات رنگ ڈائجسٹ، داستان ڈائجسٹ اور امنگ میگزین کی ایڈیٹر رہنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

1996ء میں اسلام آباد کے معروف روزنامہ اساس کی کراچی میں بیورو چیف کی حیثیت سے اور اس کے بعد ریذیڈنٹ ایڈیٹر کے طور پر صحافتی فرائض انجام دینے کا موقع ملا۔جب روزنامہ اساس کراچی سے شائع ہوا تو کچھ عرصے بعد میں یہاں بھی ایڈیٹر مقرر کر دی گئی۔

نومبر 1997ء میں سیاسی تجزیوں پر مبنی ایک کتاب ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے'' لکھی جس سے مجھے کافی عزت و مقام حاصل ہوا۔اس کتاب کو ڈاکٹر قدیر خان نے بے حد پسند کیا۔انہوں نے تعریفی خط روانہ کیا۔اس کے علاوہ مرزا اسلم بیگ اور جنرل حمید گل نے بھی سراہا۔کتاب کی پذیرائی میں شریک روزنامہ جنگ کے ایڈیٹر محمود شام، پروفیسر غفور احمد، حسین حقانی، آغا مسعود، میر نواز خاں مروت، شوکت زیدی اور غوث متھراوی نے میرے تجزیوں کو بہت پسند کیا۔

میری حوصلہ افزائی کرنے والوں میں راجہ ظفر الحق، صدیق الفاروق، دوست محمد فیضی، جاوید جبار اور ناصر بیگ چغتائی پیش پیش رہے۔23 مارچ 1998ء کو میں نے اپنا ذاتی اخبار ''روزنامہ قومی اتحاد' جاری کیا۔اس سلسلے میں مجھے کافی سے زیادہ مسائل درپیش تھے۔ملک کے بڑے اخبارات کے ایڈیٹرز اور پبلیشرز کے علاوہ ہاکرز ایسوسی ایشن کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ ایک خاتون کا اخبار جاری کرنا اور اخبار کی قیمت ان کی مرضی کے مطابق نہ رکھنا انہیں گوارا نہیں ہوا۔شام کے ایک اخبار نے میرے اخبار کو ڈمپ کرنے کے بدلے بھاری رقم میرے اخباری ایجنٹ کو ادا کی تا کہ میں اخبار شائع کرنے سے باز رہوں۔اس طرح مجھے

بھاری مالی نقصان پہنچایا۔ میں نے یہ نقصان بھی صبر و تحمل سے برداشت کیا۔

ہاکرز برادری سے معاملات طے کرانے کے سلسلے میں روزنامہ جنگ کے میر شکیل الرحمٰن نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ انہوں نے مجھ سے دو طویل میٹنگ کیں اور بارہا فون کالز پر تبادلہ خیال کرتے رہے۔

روزنامہ خبریں کے ضیاء شاہد اور قومی اخبار کے الیاس شاکر کی بھی یہی خواہش تھی کہ میں اپنے اخبار کی قیمت بڑھا دوں مگر میں نے حامی نہیں بھری۔ نتیجے کے طور پر ہاکرز ایسوسی ایشن کو ہار ماننا پڑی اس طرح میری جیت ہوئی۔

اس تمام عرصے کے دوران روزنامہ ایکسپریس کے سلطان لاکھانی، روزنامہ امت کے رفیق افغان، پرچم کے زاہد قریشی، پاکستان آبزرور کے زاہد ملک اور خطیب صاحب نے میرا بہت ساتھ دیا۔ خاص طور پر سابق کمشنر سیسی موجودہ۔ ڈی۔ سی۔ او۔ جامشورو ڈاکٹر خاور جمیل، عبداللہ بلڈر کے عرفان قریشی، صبا رشید، سندھ انجینئرنگ کے سابقہ ایم۔ ڈی۔ کرنل (ر) اکبر اور یحییٰ برہان نے میری بڑی ڈھارس بندھائی اور وہ مجھے اپنے مشورے دیتے رہے۔ میری ہمت بندھانے میں سابق گورنر معین الدین حیدر، مشاہد حسین سید، میرے بہنوئی کمال احمد رضوی، میری بہن عشرت کمال، مارکس مین کے قادر ایم خان اور اقبال آزاد بھی پیش پیش رہے اس کے علاوہ حبیب بینک کے شجاعت علی بیگ نے اخبار کے حوالے سے میرا عملاً بہت ساتھ دیا۔ ''روزنامہ اساس'' سے ''روزنامہ قومی اتحاد'' تک میرے اخبار کو اشتہارات کے سلسلے میں جس شخصیت نے سب سے زیادہ مدد دی وہ پاک سوزوکی کے سابقہ ڈپٹی مینجنگ ڈائریکٹر (ر)، کیپٹن بشیر احمد جن کی میں زندگی بھر احسان مند رہوں گی۔ اس کے بعد نیشنل بینک کے سینئر ایگزیکٹیو وائس پریذیڈنٹ شاہد انوار خان، مسلم کمرشل بینک کے کفیل برنی، حبیب آئل کی تابندہ لاری، پی آئی اے کی سمینہ پرویز اور بشیر صاحب، اس کے علاوہ کراس چیک کے شاہد رسول، ناصر حسین، زاہد حسین، حیدر علی اینڈ کمپنی کے سی۔ ای۔ او۔ حیدر علی اور زاہد اشرفی، فرنٹ لائن کے راحت صاحب کی بے حد ممنون ہوں اس کے علاوہ اسٹیٹ لائف کے مظفر صاحب اور عارف الیاس کی شکر گزار ہوں اگر میں NEC کے عبدالحق کا تذکرہ نہ کروں تو یہ دوستی کی سب سے بڑی توہین ہوگی انہوں نے دام، درم اور سخن میرا بہت ساتھ دیا جو میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

میری دوستوں میں میڈیا ویمن اینڈ جرنلسٹس کی صفیہ رشید خان، ڈان کی خورشید حیدر، ماہنامہ سطور کی دردانہ شہاب، نوائے وقت کی صوفیہ یزدانی اور عبرت اخبار کی کوثر جاوید نے ہر قدم پر میرا ساتھ نبھایا۔ ''روزنامہ قومی اتحاد'' جوں جوں ترقی کرتا رہا مجھ پر بیرونی دباؤ بہت بڑھنے لگا اور میں شدید ٹینشن کا شکار ہوگئی پھر ایک دن میرے دفتر کے چیمبر میں اچانک دل کی تکلیف شروع ہوئی، یوں اسپتال منتقل ہونا پڑا۔ ڈاکٹر اور گھر والوں کے بے حد اصرار پر میں نے اخبار اپنے شوہر کے دوست کفیل احمد کو دے دیا اور تبدیلی آب وہوا کے لئے بچوں سمیت باہر چلی گئی، ورنہ میرا بچنا مشکل تھا۔ تین ماہ بعد واپس آئی۔ کافی عرصے آرام کیا پھر کچھ دنوں بعد دوبارہ ''روزنامہ اساس'' سے وابستہ ہوگئی لیکن جلد ہی یہاں کے ماحول سے گھبرا گئی کیونکہ بگ باس یہاں نہ ہونے سے معاملات دگرگوں تھے لہٰذا میں نے جانا ہی مناسب سمجھا اور خاموشی سے وہ ادارہ چھوڑ کر ''روزنامہ امروز'' میں آ گئی اور اب تک اس اخبار سے وابستہ ہوں۔ اسی کے ساتھ ہی میں نے ایک سال تک فون میگ کے لئے بھی کہانیاں لکھیں جو لوگوں نے بے حد پسند کیں۔ میں ان کی شکر گزار ہوں۔ اس کے علاوہ میں میڈیا ویمن اینڈ جرنلسٹس فاؤنڈیشن کی میڈیا کوآرڈینیٹر بھی رہی۔ اس سلسلے میں، میں نے اپنی چند جرنلسٹس ساتھیوں کے ساتھ مل کر بہت سے تعمیری کام کئے۔

اخبار سے وابستگی کی بناء پر میں نے اپنا ذاتی روزنامہ جاری کیا تھا اس حوالے سے بہت سی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ اپنے اسٹاف کے علاوہ دیگر بڑے اخبارات کی محاذ آرائی ڈپریشن کا سبب بنتی رہی۔ ان تمام تر باتوں کے باوجود میں نے اپنے اسٹاف کو تنخواہیں وقت پر ادا کیں۔ پہلی یا دو تاریخ سے زیادہ میں نے کسی ایک کو بھی تنخواہ کے سلسلے میں انتظار نہیں کرایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مارکیٹ میں میری ساکھ بحال ہے۔ اخبار صحت کی خرابی کی بناء پر کفیل احمد کو دیا اس وقت میں نے تمام لائبیلیٹی کلیئر کر دی تھی۔ اس سلسلے میں کسی ایک کو بھی مجھ سے شکایت نہیں تھی۔

ہمارے زمانے میں اخبار کا ایک معیار تھا۔ مستند صحافی اپنی ذمہ داریاں عبادت سمجھ کر نبھایا کرتے تھے۔ موقع پر رپورٹنگ کی جاتی تھی۔ آج بھی ایسے صحافی حضرات موجود ہیں جو اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو ہر قسم کے خطرات کے باوجود نبھانے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ موجودہ دور میں دہشت گردی کا خطرہ ہر لمحہ

موجو ہے۔ آج کا صحافی پہلے کی نسبت زیادہ غیر محفوظ ہے پھر بھی وہ خطروں کی پرواہ کئے بغیر اپنے فرائض کو بخوبی انجام دیتا ہے۔ خواہ وہ الیکٹرونک میڈیا سے تعلق رکھتا ہو یا پرنٹ میڈیا سے۔

گزرے دور میں اخبار جاری کرنے کا مقصد ''ایک مشن'' ہوا کرتا تھا۔ پڑھے لکھے پروفیشنل لوگ ہی اخبار جاری کرتے تھے۔ ان کی صحافت سے وابستگی دیوانگی کی حد تک ہوا کرتی تھی۔ وہ اپنے ماتحت کام کرنے والے صحافیوں کی ضروریات اور مشکلات کو سمجھتے تھے لہٰذا تنخواہوں کی ادائیگی وقت پر کی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں تھوک کے حساب سے اخبار شائع ہو رہے ہیں۔ ان اخبارات کے زیادہ تر پبلیشرز اپنے غیر قانونی دھندوں کو تحفظ فراہم کرنے کیلئے اخبار کا سہارا لیتے ہیں۔ وہ حکومت اور لوگوں کو بلیک میل کر کے سمجھتے ہیں کہ ہم نے اخبار نکالنے کا حق ادا کیا۔ کئی اخبارات ایسے ہیں جہاں سے صحافیوں کو اور اشتہارات پر کام کرنے والے کئی افراد کو کئی کئی ماہ کی تنخواہیں ادا نہیں کی گئیں۔ ایسے اخبار مالکان کے خلاف ایسا کوئی قانون وضع ہونا چاہئے کہ وہ اگر اسٹاف کی تنخواہ ادا نہیں کر سکتے تو اخبار بند کر دیں اور دوسروں کے جذبات سے نہ کھیلیں۔ اخبار جاری کرنے کی پالیسی آسان ہونا چاہئے مگر اب ایسا بھی نہیں کہ سبزی فروش اور دودھ فروش اخبار جاری کریں۔ یہ صحافت اور صحافیوں کی توہین ہے۔ ایک بے ایمان اور نان پروفیشنل اخبار مالکان کے ماتحت کوئی بھی ذمہ دار صحافی اپنی غیر جانب دار وابستگی کیسے نبھائے؟ آزاد صحافت کے راستے میں یہ ضمیر کا بوجھ ذہنی صلاحیتوں کو دیمک کی طرح چاٹ جاتا ہے، اسے مقام عبرت کہنا چاہئے۔ اس مسئلے پر غور کرنا ضروری ہے۔

نومبر 1997ء میں سیاسی تجزیوں پر مبنی جو کتاب لکھی اس کا نام تھا۔ ''بول کے لب آزاد ہیں تیرے'' اب یکم اگست 2007ء میں افسانوں کا مجموعہ ''ہم کہ ٹھہرے اجنبی'' پیش کر رہی ہوں، اسے پڑھنے کے بعد آپ ہی یہ فیصلہ کریں کہ میں اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئی ہوں۔

آخر میں، میں آواری ٹاور اور بیچ لگژری کی معروف شخصیت، بہرام ڈی آواری کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہوں گی جن کی وجہ سے میری کتاب کی پذیرائی ممکن ہو سکی، وہ ایک عظیم اور علم دوست انسان ہیں۔

رضیہ سلطانہ

یکم اگست 2007ء

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

کیلاش نے قریب بیٹھی ہوئی عورت پر ایک نگاہ ڈالی جو ایک منٹ پہلے کنداپور سے بس میں سوار ہوئی تھی اس کے ایک ہاتھ میں پرس اور دوسرے ہاتھ میں شولڈر بیگ تھا جو اس نے اپنی سیٹ کے اوپر والے اسٹینڈ پر رکھ دیا اور خود سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی پھر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں وہ کافی تھکی تھکی سی لگ رہی تھی۔ وہ گورے رنگ کی ایک خوش شکل عورت تھی عمر اندازاً پچیس اور چھبیس سال کے درمیان تھی ہلکے گلابی رنگ کی ساری میں وہ بہت اسمارٹ نظر آرہی تھی اس کے دونوں ہاتھوں میں گلابی رنگ کا ایک ایک کڑا تھا اس کے علاوہ اس کے کانوں میں چھوٹے چھوٹے سے گلابی رنگ کے ٹوپس تھے جو اس نے ساری سے میچ کر کے پہن رکھے تھے۔ کیلاش یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ آیا وہ ہندو ہے یا مسلمان۔

بس مینگلور جارہی تھی۔ مینگلور کرناٹک کا ایک خوبصورت اور اہم شہر ہے۔ دس منٹ کے وقفے کے بعد بس اسٹارٹ ہوئی۔ اس وقت شام کے چار بجے تھے موسم خوشگوار تھا، آسمان پر ہلکے ہلکے بادلوں کا راج تھا۔ بس کی رفتار بڑھتی جارہی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف کاجو کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ اس کے علاوہ ہرے بھرے کھیت تھے اونچا نیچا پہاڑی راستہ بل کھاتا جارہا تھا۔ تاحد نگاہ ہریالی ہی ہریالی تھی، موسم بھی خوبصورت، منظر بھی حسین، یہ تمام کیفیات ہر انسان پر ایک سرور کی کیفیت طاری کرتی ہیں۔ کیلاش بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ وہ بار بار کنکھیوں سے قریب بیٹھی ہوئی عورت کو دیکھتا اور پھر باہر کے نظاروں سے محظوظ ہوتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس طرح اپنی ہم سفر سے مخاطب ہو اسی شش و پنج میں کافی وقت بیت گیا۔

اچانک بس جھٹکے سے رک گئی غالباً سامنے کوئی بیل گاڑی آگئی تھی مگر وہ کسی خوفناک حادثے سے بچ گئی۔ بس کے جھٹکے سے عورت کا بیگ ٹھیک کیلاش کے سر پر آگرا اور اس کے منہ سے نکلی ''سی'' کی آواز نے عورت کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔

''آئی ایم سوری۔'' عورت نے شرمندگی سے کہا۔

''نیور مائنڈ'' کیلاش نے سر کو سہلاتے ہوئے جواب دیا۔ اس طرح قدرت نے کیلاش کی مشکل حل کر دی جو وہ

اپنے ہم سفر کے متعلق جاننا چاہ رہا تھا۔

''آپ کا شبھ نام؟'' کیلاش نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''جی! میرا نام سیما ہے۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''مجھے کیلاش کہتے ہیں۔'' بغیر پوچھے ہی اس نے اپنا تعارف کرایا۔

''آپ مسلم ہیں؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جی ہاں!'' جواب مختصر تھا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟'' مزید معلومات کی خاطر اس نے پوچھا۔

''میں کاروار میں گورنمنٹ اسکول کی ٹیچر ہوں۔'' سیما نے وضاحت کی۔

کاروار بھی کرناٹک کا ایک اہم شہر ہے۔ جہاں تمام اہم سرکاری ادارے ہیں۔

''مگر آپ تو کنداپور سے سوار ہوئی تھیں۔'' کیلاش نے پوچھا۔

''جی ہاں! میں یہاں اپنی ایک دوست کے پاس آئی ہوئی تھی، اب یہاں سے اپنی خالہ کے پاس جا رہی ہوں کیونکہ تین دن پہلے اسکول کی چھٹیاں ہوگئی ہیں۔ اس لئے پندرہ بیس دن میں وہیں رہوں گی۔'' سیما نے تفصیل سے جواب دیا۔

''آپ کیا کرتے ہیں؟'' سیما کی جانب سے پہلا سوال تھا۔

''میں بزنس کرتا ہوں یعنی امپورٹ ایکسپورٹ۔'' کیلاش نے وضاحت کی۔

''میری کار کی بیٹری ڈاؤن ہوگئی تھی اس لئے مجھے بس سے مینگلور جانا پڑ رہا ہے اور آج ہی جانا ضروری تھا۔'' کیلاش نے مزید تفصیل بیان کی۔

''آپ اردو بہت صاف بولتے ہیں۔'' سیما نے تعجب سے کہا۔

''بات یہ ہے کہ میں زیادہ تر بزنس حیدر آباد، مینگلور، دہلی اور بمبئی میں کرتا ہوں، وہاں میرے زیادہ تر دوست ہندی بولنے والے ہیں یا اردو۔ لہٰذا میں مشکل محسوس نہیں کرتا۔'' کیلاش نے سیما کی حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کہاں رہتے ہیں؟'' سیما نے مزید پوچھا۔

''میں اپنے ماتا پتا کے ساتھ مینگلور سٹی اسپتال کے پاس رہتا ہوں۔ میرا مکان کافی بڑا ہے۔'' اس نے بات مکمل کی۔

''میں کاروار میں تھمس اپ فیکٹری کے پاس رہتی ہوں۔ فیکٹری کو چھوڑ کر دسواں بنگلہ ہمارا ہے۔'' سیما نے بغیر پوچھے ہی کیلاش کو اپنے مکان کا حدود اربع بتا دیا۔

''آپ کتنے بہن بھائی ہیں۔''؟ سیما نے پوچھا۔

''بس میں اور ایک میری دیدی ہیں۔ دیدی کی شادی ہو چکی ہے، وہ بمبئی مالا بارہل کے پاس رہتی ہیں۔ آپ اپنے متعلق بھی کچھ بتائیں۔'' کیلاش نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں بس اکلوتی ہوں، اس کے علاوہ ایک چھوٹا خالہ زاد بھائی ہمارے ساتھ رہتا ہے دراصل اس کی والدہ اس کی پیدائش کے فوراً بعد ہی انتقال کر گئی تھیں لہٰذا طلال جب سے ہمارے ہی پاس ہے۔ میری ماں نے اسے گود لے لیا تھا۔'' سیما نے پوری تفصیل بیان کی۔

بس تین منٹ کے لئے ایک چھوٹے سے اسٹاپ پر رکی۔ اتنے میں ایک بارہ تیرہ برس کا بچہ ہاتھ میں پھولوں کا گجرا لئے آواز لگاتا ہوا بس میں داخل ہوا۔ ایک لمحے کے لئے موتیے کی بھینی بھینی خوشبو دماغ کو معطر کر گئی۔ کیلاش نے لڑکے کو پانچ روپے کا نوٹ دے کر ایک گجرا لیا اور سیما کی طرف بڑھا دیا۔

''میں اس گجرے کا کیا کروں گی؟'' سیما نے تعجب سے پوچھا۔

''اپنے بالوں میں لگا لیں۔'' کیلاش نے معصومیت سے جواب دیا۔

''مگر میں یہ گجرا بالوں میں نہیں لگا سکتی۔ پلیز آپ یہ اپنے پاس ہی رکھیں۔'' سیما نے گجرا لوٹاتے ہوئے کہا۔

''گجروں کو جوڑے میں لگانے کا رواج تو ہمارے کلچر میں بھی ہے اور آپ کے کلچر میں بھی ۔۔۔۔۔۔ پھر یہ انکار کیوں؟ شاید میں ہی کچھ زیادہ فری ہو گیا آپ سے ۔۔۔۔'' کیلاش نے شرمندگی سے کہا۔

''بات وہ نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں ۔۔ دراصل میرے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔'' سیما نے نظریں جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

کیلاش نے سیما کا چہرہ بغور دیکھا، وہ تروتازہ تھا اور کہیں سے بھی یہ احساس نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے یا وہ بیوہ ہو چکی ہے۔اس کے چہرے کی تازگی ہنوز برقرار تھی اس کے علاوہ وہ بہت معصوم لگتی تھی۔

''مجھے شما کیجئے ۔۔۔۔ میں نے بنا جانے آپ کو گجرا دیا۔انجانے میں مجھ سے ایسی غلطی ہوگئی۔'' کیلاش نے جھینپتے ہوئے کہا۔

''کوئی بات نہیں کسی کے ماتھے پر کچھ نہیں لکھا ہوتا نا۔'' سیما نے تلخی سے جواب دیا۔اس کی تلخی کو کیلاش نے بھی محسوس کیا۔کیلاش کے دل پر ایک چوٹ سی لگی جیسے اس کے شریر کا کوئی حصہ زخمی ہو گیا ہو یا پھر اس کے دل پر کسی نے گھاؤ لگا دیا ہو۔وہ سوچنے لگا کہ اس کے دل کی یہ کیفیت ایک اجنبی عورت کے لئے کیوں پیدا ہو گئی ہے جبکہ وہ اس کی ذات برادری کی بھی نہیں ہے۔ مسلمان ہے۔اس نے اپنے ذہن کو جھٹکنے کی خاطر بس سے باہر جھانکا۔دور پہاڑوں کی اوٹ میں سورج غروب ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔بادلوں کے سفید سفید گالے سورج کو اپنے اندر چھپانے کی کوشش میں مصروف تھے۔ ہرا بھرا جنگل، چھوٹی چھوٹی ندیاں بڑی تیزی سے پیچھے کی جانب بھاگتی محسوس ہو رہی تھیں، مسرور کن ٹھنڈی ہوائیں بس کی کھڑکی سے اندر آرہی تھیں، اس پر موتیے کی معطر خوشبو کیلاش کے دل میں گدگدی سی پیدا کر رہی تھی۔

''اے بھگوان! میں کیا کروں، یہ سمے تو بڑا کٹھن ہے۔'' اس نے دل میں کہا۔

وہ پندرہ بیس منٹ تک باہر کے نظاروں میں غرق رہا۔اس نے کسی حد تک خود کو نارمل کرنے کی کوشش کی تھی پھر اسے سیما کا خیال آیا۔اس نے پلٹ کر سیما کو دیکھا۔وہ اپنی سیٹ پر سر ٹکا کر سو رہی تھی۔اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کشش تھی جو دیکھنے والوں کو نظریں ہٹانے نہیں دیتی تھیں۔

شام کے سات بج رہے تھے اب مینگلور شہر کا نواحی علاقہ شروع ہو چکا تھا۔ پہلے بندرگاہ کا علاقہ پڑتا تھا اس کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کی فیکٹریاں اور کارخانوں کی قطاریں تھیں۔تقریباً تیس منٹ کی مسافت کے بعد مینگلور کا بس اسٹینڈ آگیا، یہ بس ٹرمینل بہت کشادہ تھا، یہاں سے پورے ساؤتھ کے علاقوں کیلئے بس سروس کا معقول انتظام تھا۔

بس کے رکتے ہی کیلاش اور سیما اپنا اپنا سامان لئے اترے۔کیلاش نے اخلاقاً سیما سے ڈراپ

کرنے کے لئے کہا جو اس نے شکریے کے ساتھ قبول کر لیا چونکہ یہ بس ٹرمینل کافی بڑا تھا اس لئے باہر آتے آتے دس منٹ لگ گئے۔ کیلاش نے اشارے سے ایک ٹیکسی روکی اور پھر دونوں اپنا سامان لئے ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ٹیکسی پین کٹا اسٹریٹ کے چوراہے سے دس قدم آگے رکی۔ وہاں بنارسی ساریوں کی بہت سی دکانیں تھیں۔ ان دکانوں کی اوپری منزل پر سیما کی خالہ کا مکان تھا۔ اس نے اشارے سے اس فلیٹ کی نشاندہی کی جہاں اس کی خالہ مقیم تھیں۔ اس نے اخلاقاً کیلاش کو اپنے ساتھ خالہ کے پاس چلنے کے لئے کہا مگر وہ پھر کبھی آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا، جاتے جاتے اس نے اپنے مکان کا فون نمبر سیما کو دے دیا۔

سیما اپنا شولڈر بیگ لئے زینے طے کر کے اپنی خالہ کے فلیٹ پر پہنچی۔ یہ فلیٹ چار کمروں پر مشتمل تھا۔ دو بیڈ روم ایک ڈرائنگ ڈائننگ اور ایک کامن روم تھا۔ یہ فلیٹ باہر سے اتنا اچھا نہیں لگتا تھا جتنا وہ اندر سے آراستہ تھا۔

کال بیل کی آواز پر وسیم نے دروازہ کھولا۔ وسیم سیما کا خالہ زاد بھائی تھا۔ عمر میں وہ سیما سے صرف ایک سال بڑا تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ مینگلور سٹی میں اس کی ریڈی میڈ گارمنٹ کی دکان تھی۔ وسیم کی چھوٹی بہن ناصرہ کی شادی ہو چکی تھی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ بینگلور میں مقیم تھی۔ مینگلور میں سیما کی خالہ اور وسیم ہی رہتے تھے۔ اس کے خالو کا دو سال قبل ایک حادثے میں انتقال ہو چکا تھا۔ جس وقت سیما اندر داخل ہوئی اس کی خالہ نماز پڑھ رہی تھیں وہ وسیم کو سلام کر کے خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئی۔ نماز سے فارغ ہونے کے بعد اس کی خالہ نے سیما اور اس کے والدین کا حال احوال پوچھا پھر ان کی خیریت دریافت کی اس کے بعد رات کے کھانے کا اہتمام کرنے چلی گئیں، اس دوران سیما نے فون کے ذریعے اپنے والدین کو اپنی خیریت سے مینگلور پہنچنے کی اطلاع دیدی اور باتھ روم میں گھس گئی۔ کپڑے وغیرہ بدلنے کے بعد وہ بالکل فریش ہو گئی۔ نیلے رنگ کی شلوار قمیض میں وہ بہت چارمنگ لگ رہی تھی۔

وسیم بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ آج سیما اسے بہت اچھی لگ رہی تھی، وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ وہ بلاوجہ سیما سے شادی نہ کر سکا حالانکہ سیما کے والدین چاہتے تھے کہ وسیم اور سیما کی شادی ہو۔ اس کے انکار کرنے پر ہی سیما کی شادی کہیں اور کر دی گئی تھی۔ شادی کے دو سال بعد اس کے شوہر کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ

دریا میں نہاتے ہوئے گہرے پانی میں ڈوب گیا تھا۔ ڈوبنے کے دو دن بعد اس کی لاش ملی تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد سے سیما نے اسکول میں سروس کر لی تھی تاکہ خود کو مصروف رکھ سکے۔

دراصل وسیم اپنے ایک دوست کی بہن کے عشق میں گرفتار تھا مگر وہ ہرجائی نکلی۔ اس کے چکر میں اس نے سیما سے شادی نہیں کی تھی نتیجے کے طور پر وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وسیم اور اس کی والدہ سیما سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے پھر سیما اور اس کی خالہ ایک ہی بیڈ روم میں لیٹے مگر وسیم دوسرے بیڈ روم میں سونے کے لئے چلا گیا۔

سفر کی تھکن کے باعث سیما لیٹتے ہی سو گئی مگر تقریباً صبح چار بجے کے قریب اچانک اس کی آنکھ کھل گئی، اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی، چاروں طرف اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی مگر وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ اس کی خالہ اس سے تھوڑے سے فاصلے پر گہری نیند سو رہی تھی۔ سیما کی نیند اچاٹ ہو گئی۔ وہ بستر سے اٹھی لائٹ آن کر کے فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی اور گلاس میں انڈیل کر ایک ہی سانس میں پی گئی۔ کچھ نارمل ہونے کے بعد اس نے لائٹ آف کر دی اور دوبارہ آکر بستر پر دراز ہو گئی۔ دفعتاً اسے کیلاش یاد آیا پھر اسے گجرے والی بات بھی یاد آ گئی، دیکھنے میں وہ بڑا ہینڈسم تھا لمبا قد، گندمی رنگ گھنگھریالے بال خاص طور پر اس کی آنکھیں بڑی غضب کی تھیں، اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی، گفتگو کرنے کا انداز بھی اچھا، اردو بھی صاف بولتا تھا، کہیں کہیں ہندی الفاظ استعمال کرتا تھا ان تمام اچھائیوں کے باوجود جو بات سیما کے لئے تکلیف کا باعث تھی وہ تھی اس کی قومیت یعنی وہ ہندو مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ سیما کا ذہن اس سے آگے نہ سوچ سکا۔ اس نے اپنے خیالات کے دھارے کو وسیم کی طرف موڑ دیا۔

وسیم اس کا خالہ زاد بھائی تھا۔ بچپن ہی سے وہ دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وسیم بھی مسحور کن شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی باتوں میں بڑی مٹھاس تھی، ہر وقت مسکراتا رہتا۔ اس کی شکل وصورت اور شخصیت ایسی تھی کہ کوئی بھی لڑکی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتی۔

شادی سے قبل سیما اسے دل ہی دل میں پسند کرتی تھی، مگر چونکہ وہ کسی اور لڑکی میں دلچسپی لیتا رہا۔

اس لئے سیما نے اپنی پسند اور چاہت کو خاموشی سے دل میں دفن کر دیا تھا۔ یہ بات اس کے علاوہ کوئی اور جان ہی نہ سکا۔ پھر اس کی شادی ہوگئی لیکن وہ دو سال بعد بیوہ بھی ہوگئی۔ اپنے بیوہ ہونے کا اسے کوئی خاص دکھ نہ تھا اور نہ ہی اسے اپنے شوہر سے کوئی لگاؤ تھا حالانکہ اس کا شوہر اسے بہت چاہتا تھا مگر یہ چاہت صرف یک طرفہ تھی بقول اس کے وہ صرف ایک عام سا انسان تھا اور کوئی متاثر کن شخصیت بھی نہیں تھی۔ سیما اسے عام بیویوں کی طرح ڈیل کر رہی تھی۔ اس کے دل میں وقار کے لئے کبھی محبت اور چاہت کا نرم گوشہ پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ اس کے اس رویے کو وقار بھی محسوس کرتا تھا۔

مختلف خیالات کی یلغار نے اسے سونے نہیں دیا لہٰذا صبح سات بجے کے قریب وہ سوئی اور دس بجے تک سوتی رہی جب اس کی خالہ نے اسے ناشتے کے لئے جگایا تو اس وقت تک وسیم اپنی دکان پر جا چکا تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ تیار ہوئی اور خالہ سے اجازت لے کر بازار کی طرف روانہ ہوگئی۔ خالہ کے گھر کے نیچے بہت بڑا بازار تھا جہاں ریشمی ساڑیاں ریڈی میڈ گارمنٹ اور کاسمیٹک کی تمام اشیاء کی دکانیں تھیں۔ سیما کو کئی ساڑیاں خریدنی تھیں اپنی والدہ کے لئے، ایک دوست کے لئے اور خود اپنے لئے بھی۔ وہ پہلے ایک دکان میں گئی وہاں سے اپنی والدہ اور دوست کے لئے چار ساڑیاں خریدیں اپنے لئے اس نے کچھ نہیں خریدا پھر آگے بڑھ گئی۔ تقریباً چند گز دور پہنچ کر اس کی نظر ایک بہت بڑی دکان پر پڑی وہاں اسے کافی ورائٹی نظر آئی لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ اپنے لئے وہ اسی دکان سے ساریاں خریدے گی۔

دوسرے ہی لمحے وہ مذکورہ دکان میں موجود تھی۔ سیلز مین نے کئی ساڑیاں اسے دکھائیں اسے نیلے رنگ کی ایک پلین ساڑی پسند آئی جو اس نے سیلز مین کو پیک کرنے کے لئے کہا پھر اس نے دوسری ساڑی پسند کی، یہ بسنتی کلر کی بہت خوبصورت ساڑی تھی جس کا بارڈر لال تھا، مگر یہ کافی قیمتی تھی۔ تھوڑی سی دیر کے لئے سیما سوچ میں پڑ گئی کہ آیا اسے خریدے یا نہ خریدے دوسرے ہی لمحے اس نے فیصلہ کیا وہ صرف نیلی ہی ساری خریدے گی کیوں کہ بسنتی کلر کی ساڑی اس کی گنجائش سے زیادہ قیمتی تھی، جب وہ کاؤنٹر پر پہنچی تو سیلز مین نے ساڑیوں کے دونوں ڈبے پیک کر کے اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے۔ اس نے حیرت سے سیلز مین کی طرف دیکھا۔ سیلز مین نے حیرت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی پشت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میڈم! آپ کے ساتھی نے ان ساڑیوں کی پے منٹ کر دی ہے''۔

سیما نے مڑ کر دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کیوں کہ اس کے پیچھے کیلاش کھڑا تھا۔اچانک کیلاش کو مدمقابل پا کر سیما بوکھلا گئی اور بمشکل خود پر قابو پایا۔

''آپ نے پے منٹ کیوں کی؟ یہ اچھا نہیں کیا۔اتنی بے تکلفی میں پسند نہیں کرتی۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے''۔سیما نے منہ بنا کر کہا

''سیما جی! آپ میرے متعلق غلط رائے قائم نہ کریں۔میں آپ کو صرف ایک اچھا دوست سمجھتا ہوں اس کے علاوہ میرے شہر میں آپ مہمان ہیں اور بس'' کیلاش نے صفائی پیش کی۔

کیلاش کی صفائی پیش کرنے کے باوجود سیما کے دل و دماغ میں شک وشبہ نے جگہ لینا شروع کر دی۔اس کی چھٹی حس نے آنے والے کسی خطرے کا آلارم دیا۔اس کی خوبصورت کشادہ پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں جسے کیلاش محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

''پلیز! آپ مائنڈ نہ کریں۔میرے خلوص کو محسوس کریں۔آپ سندر ہیں، یہ ساڑی خاص طور پر بسنتی کلر کی آپ کی سندرتا کو چار چاند لگائے گی''۔کیلاش نے اتنی انکساری اور معصومیت سے کہا کہ سیما سے انکار نہ ہو سکا۔

دونوں دکان سے باہر نکلے اور قریب کے ایک ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے چائے پی پھر تھوڑی دیر گپ شپ کی اور اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

دوپہر کو دو بجے کے قریب وہ خالہ کے گھر پہنچی۔کھانے پر خالہ کے علاوہ وسیم بھی اس کا انتظار کر رہا تھا۔وسیم عموماً دوپہر کا کھانا گھر پر ہی کھاتا تھا۔کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خالہ اور وسیم نے اس کی لائی ہوئی ساڑیاں دیکھیں اور انہیں پسند کیا۔خاص طور پر بسنتی کلر کی ساڑی انہیں بے حد پسند آئی۔جس کی قیمت تقریباً دو ہزار روپے تھی۔

''تم پر یہ ساری بہت خوبصورت لگے گی''۔پہلی بار وسیم کا انداز تعریفی تھا مگر نہ جانے کیوں سیما کو وسیم کے جملے سے زیادہ کیلاش کی تعریف کا انداز پسند آیا تھا۔وہ زیر لب مسکرا کر رہ گئی۔

وسیم کھانے کے تھوڑی دیر بعد اپنی دکان پر چلا گیا۔خالہ نماز سے فارغ ہو کر آرام کرنے چلی گئیں۔سیما ایک فلمی

میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی۔ تقریباً پانچ بجے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیما نے رسیو کیا تو دوسری طرف کیلاش کی آواز تھی۔

''ہیلو! کیا ہو رہا ہے؟'' کیلاش نے بے ساختہ پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ بس یونہی میگزین دیکھ رہی تھی۔'' سیما نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''سنڈے کا کیا پروگرام ہے اگر مائنڈ نہ کریں تو لنچ میرے ساتھ کریں۔'' کیلاش نے التجا کی۔

''مگر۔۔۔ کہاں اور کیسے؟'' سیما کا انداز سوالیہ تھا۔

''دو پہر ایک بجے کے قریب آپ مجھ سے ہوٹل پونجا انٹرنیشنل کے گیٹ پر ملنا، میں وہاں انتظار کروں گا۔ مایوس نہ کرنا ورنہ مجھے بہت دکھ ہوگا''۔ اس کی باتوں میں انکساری کے ساتھ ساتھ دل میں چھپے کسی جذبے کی عکاسی صاف ظاہر تھی، پھر اس نے بائی بائی کہہ کر فون بند کر دیا۔

فون کے بعد سیما ذہنی طور پر کشمکش کا شکار ہوگئی۔ سارے واقعات اتنی تیزی سے وقوع پذیر ہو رہے تھے کہ سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں مل رہی تھی۔ وہ سنڈے کو جائے یا نہ جائے، یہ فیصلہ کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ بہت گھبرا رہی تھی جیسے وہ کوئی بہت بڑا جرم کرنے جا رہی ہو۔ بالآخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ آخری بار کیلاش سے ضرور ملے گی۔

اتوار کے دن اس نے صبح ہی اپنی خالہ سے کہہ دیا کہ وہ سٹی اسپتال کے پاس اپنی ایک دوست کے گھر دوپہر کے کھانے پر جائے گی حالانکہ وسیم نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی تاکہ وہ اس کے ساتھ کوئی انڈین موی دیکھنے جائے مگر سیما نے انکار کر دیا۔ پونے ایک بجے کے قریب وہ تیار ہو کر رکشے کے ذریعے ہوٹل پونجا انٹرنیشنل کے گیٹ پر پہنچی جہاں کیلاش سرمئی کلر کے سوٹ میں ملبوس اس کا انتظار کر رہا تھا۔ سیما کو دیکھتے ہی وہ کھل اٹھا۔ سیما نیلے رنگ کی خوبصورت پلین ساڑھی میں بہت دلکش لگ رہی تھی۔ ہلکا سا میک اپ اس کے حسن پر آفت ڈھا رہا تھا۔

''آپ ٹھیک وقت پر پہنچی ورنہ مجھے بوریت ہوتی۔'' اس نے چہک کر کہا پھر کیلاش اسے ساتھ لئے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہوا۔ ہال میں چاروں طرف مدہم مدہم سی روشنی تھی اس کے علاوہ ہلکی ہلکی دھن پر مغربی

موسیقی روح کی گہرائیوں تک اترتی محسوس ہو رہی تھی۔انہوں نے ایک ٹیبل کا انتخاب کیا اور وہاں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔اتنے میں ویٹر مینو کارڈ لے آیا۔

''آپ کیا لیں گی ویجی ٹیرین یا نان ویجی ٹیرین؟'' کیلاش نے خوش دلی سے پوچھا۔

''میں چائنیز کھاؤں گی۔'' سیما نے برجستہ کہا۔

کیلاش کو سیما کی یہ بے تکلفی اچھی لگی۔کھانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ دونوں رسمی گفتگو کرنے لگے۔

''آج ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔'' سیما نے جملے میں وزن پیدا کر کے کہا۔

''مگر کیوں؟'' کیلاش نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

''آپ سمجھنے کی کوشش کریں، ہمارے درمیان جو بنیادی فرق ہے وہی اس سوال کا جواب ہے۔'' سیما نے وضاحت کی۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے میرے نزدیک ذات پات کی کوئی اہمیت نہیں' میں انسانیت پر وشواس رکھتا ہوں۔'' کیلاش نے تقریری انداز میں کہا۔

''مگر۔۔۔ میں اس معاملے میں کنزرویٹو ہوں۔ہمارے درمیان صرف دوستی کا مقدس رشتہ ہی قائم رہ سکتا ہے، اس سے آگے نہ میں سوچ سکتی ہوں اور نہ ہی سوچوں گی۔'' سیما کا انداز فیصلہ کن تھا۔سیما کے ان واضح خیالات نے کیلاش کو افسردہ کر دیا۔وہ بجھ سا گیا اور اس نے نظر اٹھا کر سیما کی طرف دیکھا مگر اس کی خوبصورت آنکھوں میں سوائے بیگانگی کے اور کچھ بھی نہیں تھا۔

ویٹر نے میز پر قرینے سے کھانا لگا دیا اور واپس چلا گیا۔کافی دیر تک دونوں خاموشی سے کھانا کھاتے رہے، اس دوران گفتگو جاری رکھنے کا کوئی سلسلہ بن ہی نہیں رہا تھا۔دفعتاً سیما کو بڑے زور سے چھینک آئی جس سے کیلاش چونک سا گیا۔آس پاس بیٹھے جوڑے بھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔سیما شرمندہ سی ہو کر کیلاش کی طرف دیکھ کر مسکرائی، اس کی جان لیوا مسکراہٹ کیلاش کے زخموں پر مرہم کا کام کر گئی جواب میں وہ بھی مسکرا کر رہ گیا۔

''سیما جی! کیا ہم دونوں صرف دوست تو رہ سکتے ہیں نا؟'' کیلاش نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہاں۔ہاں۔بھلا کیوں نہیں۔''سیما نے آہستگی سے کہا۔

''اب کب ملیں گی؟''کیلاش نے مایوسانہ انداز میں پوچھا۔

''دوبارہ ملنا تو مشکل ہے۔ہاں!البتہ فون ضرور کرلیا کروں گی۔''سیما نے وعدہ کیا۔

کھانے کے بعد دونوں ہوٹل سے باہر نکلے اور ٹیکسی لی۔پھر سیما کو اس نے راستے میں ڈراپ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

شام چار بجے وہ خالہ کے گھر پہنچ چکی تھی مگر خالہ گھر پر موجود نہ تھی،وہ کسی سے ملنے گئی ہوئی تھی،ہاں البتہ وسیم موجود تھا۔سیما کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر خوشی کی لہر سی دوڑ گئی۔وہ سکون سا محسوس کرنے لگا۔

''بہت دیر لگادی میں پریشان ہورہا تھا۔''وسیم نے والہانہ انداز میں کہا۔

''دراصل کافی عرصے بعد میری اور نازیہ کی ملاقات ہوئی تھی نا،اس لئے باتوں ہی باتوں میں وقت کا اندازہ نہ ہوسکا۔''سیما نے جھوٹ کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

''سیما!میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں اور یہ بات میں امی کے سامنے نہیں کہنا چاہتا تھا۔میں نے سوچا پہلے تم سے پوچھ لوں بعد میں امی سے کہوں گا۔''وسیم نے سیما کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔سیما کا دل دھک دھک کرنے لگا اس کی چھٹی حس نے آگاہی دی کہ کوئی خاص بات ضرور ہوگی۔

''میں تمہیں شریک سفر بنانا چاہتا ہوں،اس سلسلے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''وسیم نے تھوڑی سی جھجک کے بعد مدعا بیان کیا۔سیما نے حیرت سے وسیم کا چہرہ دیکھا پھر اس کے چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی دفعتاً اسے یاد آیا کہ ماضی میں اس نے کسی لڑکی کی خاطر اسے ٹھکرادیا تھا،اس کے دل میں چھپے جذبے کو نہ جان سکا تھا،جس کی بناء پر اس کی پوری شخصیت ٹوٹ پھوٹ کر رہ گئی۔محبت کا ننھا سا پودا پروان چڑھنے سے پہلے ہی مرجھا چکا تھا جو جذبہ سرد پڑ چکا تھا اب دوبارہ اس کو بیدار کرنا مشکل تھا۔

''فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔سوچ کر بتاؤں گی''۔اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔وسیم کے چہرے پر تاریکی چھا گئی۔

''کیا میں اس قابل نہیں کہ تم اپنے دل میں جگہ دے سکو؟''وسیم نے کسی امید پر پوچھا۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں دراصل میں ہی اس قابل نہیں رہی کہ آپ کے گھر کی زینت بن سکوں''۔ اس نے درشت لہجے میں جواب دیا۔ اس کا اشارہ اپنے بیوہ ہونے کی طرف تھا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں ایسی فرسودہ باتیں نہیں سوچتا جو کچھ ہوتا ہے من جانب اللہ ہی ہوتا ہے، تمہیں اتنا کمپلیکس کیوں ہے؟'' وسیم نے اس سمجھانے کی کوشش کی۔

''مجھے کوئی کمپلیکس نہیں ہے میرے سلسلے میں پہلا اعتراض آپ کی امی کو ہی ہوگا، وہ بھی نہیں چاہیں گی کہ ان کا بیٹا کسی بیوہ سے شادی کرے۔'' سیما نے جل کر کہا۔

''امی کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے آخر تم ان کی بھانجی ہو کوئی غیر تو نہیں ہو اور میری مرضی کے خلاف وہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتیں۔'' وسیم نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''بہر حال، مجھے سوچنے کا موقع دیں، اس وقت میں کوئی فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں''۔ سیما نے روکھے انداز میں کہا اور اندر بیڈ روم کی طرف چل دی۔ وسیم اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہ گیا۔ سیما کی بے اعتنائی اس کی سمجھ سے بالاتر تھی، اس کے اس رویے سے وہ تلملا اٹھا۔ اپنی خفت مٹانے کیلئے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد سیما نے ساڑی تبدیل کی اور کاٹن کا ایک خوبصورت سوٹ پہن لیا اور بستر پر دراز ہوگئی اسے بیتے دن یاد آنے لگے جب وہ چپکے چپکے وسیم کو اپنے دل میں بسا چکی تھی چونکہ وسیم کی طرف سے کوئی پہل یا انتظار نہ ہونے کی وجہ سے اپنی یکطرفہ محبت کو دل ہی میں دبانا پڑا، اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا پھر اسے کیلاش کی یاد آئی مگر وہ سلسلہ تو بالکل ہی انہونا تھا۔ اس پر سوچنا بھی فضول تھا۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہونے لگا تو آہستہ آہستہ غنودگی چھانے لگی اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

خالہ کی آواز پر وہ بیدار ہوئی تو رات کی تاریکی چھانے لگی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی منہ ہاتھ دھونے کے بعد وہ ڈائننگ روم میں آئی جہاں میز پر چائے تیار تھی۔ وسیم بھی چائے پینے میں مصروف تھا۔ اس نے خاموشی سے اپنی پیالی میں چائے انڈیلی اور کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ گئی۔ ترچھی نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ اسے نظر انداز کئے ٹی وی دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے بھی اپنی نظریں ٹی وی پر مرکوز کر دیں جہاں ایک انڈین فلم دکھائی

جا رہی تھی۔ فلم کی کہانی بھی اس کے حسب حال تھی۔

سیما کی لاتعلقی وسیم کیلئے نا قابل برداشت تھی مگر وہ محتاط ہو گیا تھا۔ اب وہ اس سے غیر ضروری باتیں نہیں کرتا تھا۔ ایک سرد جنگ جو جاری تھی۔ خالہ کو بھی کچھ کچھ سن گن ہو گئی تھی مگر وہ بظاہر نظر انداز کئے ہوئے اپنے کاموں میں مصروف تھی۔ دو تین دن یونہی ویران ویران سے گزر گئے۔ ایک دوپہر سیما کھانے سے فارغ ہو کر آرام کرنے کی غرض سے اپنے کمرے میں لیٹی ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی کہ فون کی گھنٹی خلل انداز ہوئی۔ اتفاق سے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔ سیما نے بڑھ کر فون ریسو کیا۔ دوسری جانب سے کیلاش تھا۔

''ہیلو! آپ کیسی ہیں؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں'' جواب مختصر تھا۔

''آپ کو میری یاد نہیں آئی؟'' سوال روایتی تھا، مگر کسی امید کے سہارے کیلاش نے کر ہی لیا۔

''ان دنوں بہت مصروفیت رہی لہٰذا خیال ہی نہیں آیا''۔ اس نے صاف گوئی سے جوابدیا۔ سیما کی صاف گوئی نے کیلاش کے جذبات کا خون کر دیا۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ آپ اس وقت بھی مصروف ہی ہیں'' اس نے چوٹ کی، سیما سہم گئی۔

''آپ سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' ناامید ہوتے ہوئے بھی اس نے آخری بار کوشش کی۔

''ضرور ہو سکتی ہے''۔ سیما نے برجستہ کہا۔ کیلاش کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کہ وہ اس سے دوبارہ ملنے پر آمادہ ہو جائے گی۔ سیما کی شخصیت کا تضاد اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس کے موڈ کا کچھ پتا نہیں تھا۔

''کل شام چار بجے پونجا انٹرنیشنل پہنچ جانا میں ریسٹورینٹ میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' کیلاش نے خوش دلی سے کہا۔

''او کے۔'' سیما نے مسکراتے ہوئے رضامندی ظاہر کر دی۔

دوسرے دن شام چار بجے سیما اپنی خالہ سے شاپنگ کا بہانہ کر کے ہوٹل پہنچی۔ ریسٹورینٹ میں داخل ہو کر اس نے مدہم مدہم روشنی میں کیلاش کو تلاش کیا، وہ اسے ایک طرف کونے کی میز کے قریب محو انتظار ملا۔ وہ مسکراتی ہوئی اس کی طرف بڑھی۔ کیلاش سیما کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔ سیما شکریہ ادا

کرتے ہوئے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

آج وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی شام کی مناسبت سے اس نے گہرے کاسنی کلر کی پلین ساڑی پہن رکھی تھی۔ اس ساڑی اور کلر میں اس کا رنگ روپ نکھرا نکھرا لگ رہا تھا۔ اس پر اس نے ہلکے پھلکے زیورات پہن رکھے تھے۔ کیلاش اس کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ آس پاس بیٹھے چند نوجوان جو اپنی اپنی دوستوں کے ساتھ تھے وہ بھی اپنی دوستوں کو بھول کر اس میں کھو گئے، یہ بات کیلاش نے بھی نوٹ کی۔ اس لئے وہ مزید اکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ خود کو آکاش کی بلندیوں پر محسوس کر رہا تھا۔ سیما کے سحر نے اسے بالکل ساکت سا کر دیا تھا کہ ویٹر کی آواز نے جمود توڑا۔

''سر کیا لیں گے؟'' ویٹر نے خوش اخلاقی سے پوچھا۔

''فی الحال دو لیمن جوس لے آؤ۔'' کیلاش نے آرڈر دیا۔

''آپ بہت سندر اور اسمارٹ ہیں۔ شاید اپسرائیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔'' اس نے تعریفی انداز میں کہا۔

''تھینک یو۔'' سیما نے شرماتے ہوئے کہا۔

''آپ کے آنے کا مجھے یقین نہیں تھا۔ اس کیلئے میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں ورنہ میں بہت ہرٹ ہوتا'' کیلاش نے دل کی بات روانی سے کہہ دی۔

''اچھا! آپ ہرٹ بھی ہوتے ہیں۔'' سیما نے شوخی اختیار کی۔ کیلاش کے چہرے پر تاریکی سی چھا گئی اسے یوں لگا جیسے وہ خوابوں کی وادیوں سے حقیقت کی دنیا میں لوٹ آیا ہو۔ اس کی ساری خوشی کافور ہو چکی تھی۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی کے آثار نمایاں ہو گئے اور وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''نہیں میں ہرٹ نہیں ہوتا کیونکہ میں روبوٹ ہوں اور ہرٹ صرف انسان ہوتے ہیں''۔ اس کا انداز طنزیہ تھا۔ اس کے طنز کو محسوس کر کے سیما بھی سیریس ہو گئی۔

''آپ بمبئی کب جا رہے ہیں؟'' اس نے ماحول کو خوشگوار بنانے کیلئے کیلاش کی توجہ دوسری جانب مبذول کر دی۔

''اگلے ہفتے جانے کا ارادہ ہے''۔ جواب مختصر تھا۔

''واپسی کب ہوگی؟'' سیما نے معلومات کی خاطر پوچھا۔

''معلوم نہیں کب واپس آؤں۔'' لہجے میں مایوسی تھی۔

''کیوں معلوم نہیں؟'' سیما نے حیرت سے پوچھا۔

''میں نے سوچا ہے کہ اب میں بمبئی میں پر مستقل رہوں گا، زیادہ تر باہر رہنے سے میرا بزنس کافی ڈسٹرب ہو گیا ہے۔'' کیلاش نے وضاحت کی حالانکہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک مینگلور سٹی میں نہیں رہے گا جب تک سیما یہاں موجود ہے۔ ویٹر تھوڑی دیر بعد دوبارہ آرڈر لینے کیلئے آیا اس نے جوس کے خالی گلاس ٹرے میں رکھے اور انتظار کرنے لگا چونکہ کیلاش کا موڈ خراب ہو چکا تھا لہٰذا اس نے زیادہ دیر ٹھہرنے سے گریز کیا اور اسے بل لانے کیلئے کہا۔ سیما حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی مگر وہ نظر انداز کئے کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ چند منٹ بعد ویٹر بل لے آیا، اسے کلیئر کرنے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیما سے معذرت کرنے لگا کہ اسے ضروری کام سے جانا ہے۔ وہ دونوں ہوٹل سے باہر نکلے۔ کیلاش نے پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور سیما کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ سیما کچھ سوچ نہ سکی۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے مطلوبہ مقام پر پہنچ کر اس نے گاڑی روک دی اور سیما کی طرف دیکھنے لگا۔ سیما نے کار کا دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی پھر جھک کر اس نے گاڑی میں بیٹھے کیلاش کو مخاطب کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی گھر کی جانب روانہ ہو گئی۔ تمام راستے وہ کیلاش کے متعلق سوچتی رہی کہ آج اس نے یہ کیسی حرکت کی پھر خود کو اس کا ذمہ دار سمجھ کر اپنے خیالات جھٹک دئے۔ وہ جب گھر میں داخل ہوئی تو شام کے چھ بج رہے تھے۔

''کوئی چیز خریدی نہیں'' خالہ نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں، پیسے گھر میں بھول گئی تھی لہٰذا ونڈو شاپنگ کرتی رہی، کئی سوٹ پیس دیکھے ہیں کل پرسوں خریدوں گی''۔ سیما نے جھوٹ بولا۔

سیما کی لاتعلقی کی بناء پر وسیم راتوں کو دیر سے آنے لگا تھا۔ وہ بغیر کسی مقصد کے مختلف دوستوں کے ساتھ گھومتا پھرتا اور دیر سے آ کر سو جاتا۔ سیما بھی اس کی ان حرکتوں سے بخوبی واقف تھی مگر بظاہر انجان بنی ہوئی تھی۔ اب

سیما کو بوریت محسوس ہونے لگی کیونکہ کیلاش اس سے بددل ہو کر کنارہ کشی اختیار کر چکا تھا اور وسیم اسے نظرانداز کیئے اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھا۔ خالہ کم گو ہونے کی وجہ سے سیما سے صرف رسمی ہی باتیں کرتی تھیں ورنہ ان کا گھریلو کاموں سے فارغ ہو کر عبادت میں اپنا وقت گزرتا تھا۔ سیما اکیلی بور ہوتی رہتی کیونکہ گھر میں جتنی کتابیں اور میگزین تھے وہ ان سب کو چاٹ چکی تھی۔ اب اس کیلیئے وقت گزارنا مشکل ہوتا جا رہا تھا لہٰذا اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دو تین دن میں کاروار روانہ ہو جائے گی، اسی خیال کے پیش نظر اس نے اپنا سامان جو مختلف کمروں میں بکھرا پڑا تھا، ان سب کو یکجا کر کے ایک طرف رکھ دیا تا کہ روانگی کے وقت تلاش کرنے میں دقت نہ ہو، کچھ مزید چیزیں بھی خرید لی تھیں جو کاروار میں دستیاب نہیں تھیں۔

ایک صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اچھی خاصی بارش ہو رہی تھی، ٹھنڈ کے باعث اس کا جسم سن سا ہو رہا تھا، وہ کسی کمبل یا چادر کی تلاش میں سارے کمرے کا طواف کرتی رہی، اسی تلاش میں وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی وسیم کے کمرے میں داخل ہوئی وہاں نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اسے الماری پر کمبل نظر آیا حالانکہ وہ خود چادر اوڑھے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ بہت خاموشی سے چھوٹی ٹیبل اٹھا لائی اور اس پر چڑھ کر کمبل اتارنے لگی۔ دفعتاً ٹیبل کا بیلنس بگڑ گیا اور وہ دھڑام سے نیچے گر گئی، ساتھ ہی کونے میں رکھا ہوا گلدان بھی چھناکے سے ٹوٹ گیا۔ سیما کی چیخ سن کر وسیم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے جیسے ہی لائیٹ جلائی تو اس کی نظر سیما پر پڑی جو کراہ رہی تھی، وہ ایک لمحے کیلیئے معاملہ سمجھنے کی کوشش کرنے لگا پھر دوڑ کر سیما کے قریب آیا اور اسے اٹھا کر اپنے بستر پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں چوٹ آئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنی الماری میں سے فرسٹ ایڈ بکس نکال لایا اور مرہم پٹی کرنے لگا پھر اس پر کمبل ڈالنے کے بعد باورچی خانے میں جا کر گرم کافی لے آیا۔ اس کے بعد وہ سیما کی طرف دیکھنے لگا، اسی دوران اس نے سہارا دے کر سیما کو اٹھایا اور پیالی اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ وہ خاموشی سے چھوٹے چھوٹے سپ بھرنے لگی۔

''تمہیں کس بے وقوف نے کہا تھا کہ چھوٹی ٹیبل پر چڑھ کر کمبل اتارو''۔ وسیم کے لہجے میں غصے کے ساتھ پیار کی جھلک بھی موجود تھی۔

''مجھے ٹھنڈ لگ رہی تھی''۔ سیما نے دھیمے سے جواب دیا۔

''مجھے جگا دیتیں''وسیم نے نرمی سے کہا۔

''میں آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتی تھی''۔اس نے صفائی پیش کی۔

''تمہاری اس بے وقوفی سے تم ہی کو نقصان پہنچا''۔وہ بڑبڑاتا رہا۔سیما کو وسیم کا یہ انداز بہت اچھا لگا،اس میں اپنائیت کی جھلک صاف موجود تھی۔وہ آنکھیں موندے خاموش پڑی رہی۔وسیم اسے بغور دیکھتا رہا پھر وہ یکدم جذباتی ہوگیا اس نے جھک کر سیما کی پیشانی چوم لی۔سیما نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور وسیم کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں۔اس کا مفہوم وسیم کی سمجھ سے بالاتر تھا۔وہ تیزی سے باہر نکل گیا پھر وہ دوبارہ پلٹ کر آیا بستر سے اپنی چادر اٹھالی اور بغیر کچھ کہے سنے واپس چلا گیا۔سیما نے ایک گہری سانس لی اور کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگی مگر درد کی شدت سے نیند اڑسی گئی تھی پوری رات یونہی کروٹ بدلتے گزرگئی صبح کے قریب نیند کی دیوی نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

صبح جب خالہ کی آنکھ کھلی تو بستر پر سیما نہیں تھی وہ پریشان سی ہوگئیں اور اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آئی آگئیں وہاں وسیم چادر اوڑھے صوفے پر سو رہا تھا۔خالہ کی حیرت میں مزید اضافہ ہوگیا۔اب خالہ کا رخ وسیم کے کمرے کی طرف تھا جب وہاں بستر پر سیما کو سوتے دیکھا تو انہیں تشویش ہوئی،آگے بڑھ کر انھوں نے اس کا کمبل سرکایا تو اس کے ہاتھوں پر بینڈج لگی دیکھی اس کے علاوہ کچھ خراشیں تھیں اور ورم بھی نظر آیا،وہ مزید پریشان ہوگئیں اور واپس ڈرائنگ روم میں آکر وسیم کو جگانے لگیں۔ماں کے جگانے پر وسیم اٹھ بیٹھا اور تمام روداد سنائی جو رات بیتی تھی۔انہوں نے حکم دیا کہ صبح سیما کو ہر صورت میں ڈاکٹر کو دکھائے تاکہ اطمینان ہوجائے۔بیٹے کو ناشتے سے فارغ کرنے کے بعد وہ سیما کے پاس آئیں اور اسے جگانے لگیں۔سیما نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور اٹھنے کی کوشش کی مگر اس سے نہیں اٹھا گیا تو خالہ نے سہارا دے کر اٹھایا اور باتھ روم جانے میں اس کی مدد کی۔اس کے بعد خالہ نے اسے ناشتہ کرایا اور وسیم کو کہا کہ وہ ڈاکٹر کو گھر ہی پر لے آئے۔

ماں کے کہنے پر وسیم ڈاکٹر سریش کو اپنے ساتھ لے آیا۔ڈاکٹر سریش ان کا فیملی ڈاکٹر تھا اور بہت خوش مزاج بھی تھا۔اس نے آتے ہی سیما کی نبض دیکھی،بلڈ پریشر چیک کیا،اس کے بعد چوٹ کا معائنہ کیا پھر ایک انجکشن لگا دیا اور کچھ دوائیں لکھ دیں پھر سیما کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہنے لگا کہ گھبرانے کی کوئی بات

نہیں وہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گی مگر یہ بات بھی واضح کر دی کہ آرام ضروری ہے۔ ڈاکٹر کی فیس وسیم نے ادا کر دی اور اسے واپس کلینک چھوڑ آیا۔ واپسی پر کچھ دوائیں اس کے ہاتھ میں تھیں جو اس نے اپنے ہی سامنے سیما کو استعمال کرائیں۔

اگلے دن وسیم دیر سے اپنی دکان گیا تھا، اس کا دل نہیں لگ رہا تھا۔ رہ رہ کر سیما کا خیال اس پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس کی اس بے چینی کو اس کے ملازمین بھی نوٹ کر رہے تھے مگر انہیں سیما کے متعلق کوئی معلومات نہیں تھیں۔ وسیم کیلئے وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر تین بجے کے قریب وہ کھانے کی غرض سے گھر آیا تو دروازہ کھلا پایا، حیران ہوا کہ دروازہ کیوں کھلا ہوا ہے۔ اندر داخل ہوا تو کمرے میں کوئی بھی نہ تھا۔ آہٹ سے اندازہ ہوا کہ واش روم میں کوئی ہے۔ وہ انتظار کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد سیما باہر نکلی مگر اسے چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وسیم نے بڑھ کر سہارا دیا اور اسے بستر تک پہنچنے میں مدد کی۔

''امی کہاں ہیں؟'' اس نے حیرانگی سے پوچھا۔

''سودا لینے گئی ہیں''۔ اس نے نقاہت سے جواب دیا۔

''تم نے کھانا کھایا؟'' وسیم نے پیار بھرے انداز سے پوچھا۔

''ہاں۔'' جواب مختصر تھا۔

''چلو تم لیٹ جاؤ، تکلیف زیادہ تو نہیں ہو رہی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''پہلے سے کچھ کم ہے''۔ سیما نے وضاحت کی۔

''اچھا تم آرام کرو میں کھانا کھا لوں، بہت بھوک لگ رہی ہے''۔ وسیم یہ کہتا ہوا باورچی خانے کی طرف چل دیا۔ کھانے سے فارغ ہو کے وہ دوبارہ سیما کے کمرے میں آیا تو وہ لیٹے لیٹے اخبار کا مطالعہ کر رہی تھی۔ آہٹ پا کر اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔

''رات بھر بارش ہوتی رہی صبح سے تھم گئی ہے مگر آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے ہیں، لگتا ہے مزید بارش ہوگی''۔ وسیم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''اس موسم میں ٹہلنا اچھا لگتا ہے مگر میں مجبور ہوں''۔ سیما نے مایوسی سے کہا۔

''کوئی بات نہیں پھر کبھی سہی''۔وسیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''اچھا چلو بور مت ہو میں تمہیں بالکونی تک لے جاتا ہوں، تم وہاں سے باہر کا نظارہ کرلو، طبیعت بہل جائے گی''۔وسیم نے تجویز پیش کی۔

اس نے سہارا دے کر سیما کو بالکونی تک پہنچایا پھر وہاں رکھی کرسی پر اسے بٹھا دیا۔اکثر وسیم کی والدہ اکیلے پن سے گھبرا کر یہاں سے باہر کا نظارہ کیا کرتی تھیں۔سیما نے باہر جھانکا تو تازہ ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں نے اس کا استقبال کیا۔یہ موسم کی دلفریبی ہی تھی کہ اس کی نقاہت میں کمی آگئی اور اسے جسم میں تراوٹ سی محسوس ہونے لگی۔ماحول کی رنگینی نے فضاء کو دلکش بنا دیا تھا، وہ اپنے اطراف سے بے خبر نہ جانے کہاں کھوگئی تھی حالانکہ وسیم نے دو تین بار اسے آواز بھی دی تھی۔آخر تنگ آکر اس نے سیما کو جھنجھوڑا تو وہ خیالات کے بھنور سے نکل آئی۔

''سیما جان! تم کیا سوچ رہی ہو''وسیم نے بے اختیار کہا۔

لفظ''جان''پر سیما چونک سی گئی، یہ لفظ اس کیلئے بالکل انجانا تھا۔اس لفظ کو سننے کیلئے اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔وسیم اس کے اتنے قریب ہوجائے گا اسے اندازہ نہیں تھا۔اس کے اندر خوشی کی ایک لہر سی دوڑ گئی مگر خوشی کے اس احساس کو اس نے اپنے چہرے سے ظاہر ہونے نہیں دیا بظاہر اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا، اس پر کسی قسم کے کوئی تاثرات نہیں تھے۔

''کچھ یادیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں انسان کبھی نہیں بھول پاتا اور وہ ناسور بن جاتی ہیں۔بہت کوشش کرتی ہوں کہ انہیں فراموش کردوں مگر کامیابی نہیں ہوتی''۔سیما نے تلخی سے کہا

''تلخیوں کو بھول جانا ہی بہتر ہے۔زندگی قدرت کا بہترین عطیہ ہے اس کی قدر کرو اور انجوائے کرو''وسیم نے اپنائیت سے کہا۔

ایک لمحہ کے لئے سیما نے سوچا کہ وسیم صحیح کہتا ہے، وہ اگر دل ہی دل میں اسے چاہتی تھی تو وسیم کا اس میں کیا قصور تھا، وہ اس کے دلی جذبے سے بالکل ہی لاعلم تھا، بذات خود وہ بھی کسی لڑکی کی بے وفائی کا شکار ہو چکا تھا۔ دراصل دونوں ہی زخم خوردہ تھے۔

سیما نے اپنے رویے میں تھوڑی سی لچک پیدا کی اور ذہنی طور پر وسیم سے مفاہمت پر آمادہ ہوگئی۔

''آپ جسے چاہتے تھے وہ بہت خوبصورت تھی''۔ پہلی بار سیما نے اس سے بہت ہی پرسنل سوال کیا۔

''ہاں! بہت حسین تھی اور اکھڑ بھی۔'' وسیم نے مردہ دلی سے جواب دیا۔

''پھر ایسی کیا بات ہوئی کہ آپ کی شادی اس سے نہ ہو سکی''۔ سیما نے بات مزید آگے بڑھائی۔

''دراصل اس کے نزدیک انسان سے زیادہ دولت کی اہمیت تھی۔ میں مالی اعتبار سے اتنا مستحکم نہیں تھا جتنا وہ چاہتی تھی جیسے ہی اسے مطلوبہ شخصیت ملی، اس نے مجھے خیر آباد کہہ دیا''۔ وسیم نے خلاؤں میں گھورتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی اس حالت پر سیما کو بہت افسوس ہوا، اس کے دل میں وسیم کیلئے جتنی بھی نفرتیں جگہ بنا چکی تھیں وہ ختم ہونے لگیں۔ وہ سوچنے لگی کیا بعض لڑکیاں مال و دولت کی خاطر محبت و خلوص کو اتنی آسانی سے قربان کر دیتی ہیں۔ یہ کیسی سوچ ہے، وہ خود تو ایسا نہیں سوچتی اگر یہ حقیقت ہے تو بہت تلخ ہے۔ اس کے دل میں وسیم کے لئے ہمدردی کا جذبہ بیدار ہونے لگا۔ اس نے پچھلی ساری باتیں فراموش کر دیں۔

''مجھے تھکن محسوس ہو رہی ہے''۔ سیما نے نقاہت سے کہا۔

''چلو میں تمہیں بستر پر لٹا دوں''۔ وسیم نے سہارا دیتے ہوئے اسے بستر پر لٹا دیا۔

سیما خاموشی سے آنکھیں موندے پڑی رہی۔ وسیم تھوڑی دیر اس کی کیفیت جاننے کی کوشش کرتا رہا پھر قریب پڑی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

''سیما میں تمہیں ہمیشہ کے لئے اسی گھر میں رکھنا چاہتا ہوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟'' وسیم نے جھجکتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں؟ اس سلسلے میں آپ امی سے بات کر لیں''۔ اس نے دھیمے سے جواب دیا۔

''وہ تو خیر میں بات کر ہی لوں گا مگر تمہاری رضامندی بھی ضروری ہے''۔ وسیم نے وضاحت کی۔

''اگر میری رضامندی نہ ہو تو پھر کیا ہوگا؟'' سیما نے اسے ٹٹولا۔

''تمہارا انکار میں برداشت نہیں کر سکوں گا اگر یہ صرف مذاق ہے تو بھی بہت تکلیف دہ ہے''۔ وسیم نے افسردگی سے کہا۔

سیما کو اندازہ نہیں تھا کہ وسیم اس کو اتنی زیادہ اہمیت دے گا یا چاہے گا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس کے دلی جذبات کی ترجمانی کررہے تھے۔ یکا یک سیما کا دل پسیج گیا اور اس کے چہرے پر خوشی کا رنگ جھلکنے لگا وہ مسروری ہوگئی۔ اس کی یہ کیفیت وسیم سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔

رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد وسیم نے اپنی والدہ کو اپنے کمرے میں کسی بہانے سے بلایا اور ان سے سیما کے متعلق اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ والدہ کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا، وہ تو دل سے چاہتی تھی کہ سیما ان کی بہو بنے کیونکہ وہ بہن کی بیٹی ہونے کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور تعلیم یافتہ بھی تھی۔ وسیم کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اس کی والدہ اتنی جلدی سیما سے شادی کے لئے مان جائیں گی لہٰذا وہ بہت خوش ہوا۔ وسیم نے سیما کو خوشخبری سنائی تو وہ بھی بہت خوش ہوئی۔

وسیم کی والدہ نے بیٹے کی خواہش کے مطابق دوسرے ہی دن سیما کی والدہ کو کاروار شہر میں فون کر کے تمام صورت حال سے آگاہ کیا پھر سیما کے چوٹ لگنے کی وجہ بھی بتائی۔ شادی کے سلسلے میں سیما کی والدہ کو کوئی اعتراض نہیں تھا بلکہ انہیں تو سیما کی فکر ہی کھائے جارہی تھی۔ ان کی تو مراد ہی بھر آئی۔ انہوں نے حامی بھر لی اور تاکید کی کہ سیما کو جلد کاروار روانہ کردیں تا کہ شادی کے سلسلے میں تیاریاں کی جاسکیں۔ اب مزید اس کا وہاں رہنا مناسب بھی نہ تھا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد وسیم سیما کو کاروار چھوڑ آیا۔ واپسی پر اس کے خوشی اور غم کے ملے جلے جذبات تھے کیونکہ شادی دو ماہ بعد ہونی تھی۔ دونوں گھرانے تیاریوں میں لگ گئے۔ وقت تیز رفتاری سے گزرتا رہا۔

آخر کار وہ دن بھی آ ہی گیا، جس دن سیما دلہن بن کر وسیم کے گھر آ گئی۔ وسیم بہت خوش تھا کیونکہ خاندان کا ہر لڑکا اس کی قسمت پر رشک کررہا تھا۔ سیما ان کے خاندان کی سب سے حسین لڑکی تھی۔ شادی کے ایک ہفتے بعد وسیم نے ہنی مون کا پروگرام بنایا۔ وسیم شملہ اور دارجلنگ جانے پر بضد تھا مگر سیما بینگلور اور گوا جانے کو ترجیح دے رہی تھی۔ بالآخر وسیم سیما کی خواہش کے مطابق بینگلور اور گوا کے لئے رضامند ہوگیا۔

اتوار کی صبح نو بجے سیما اور وسیم ٹورسٹ بس کے ذریعے مینگلور سے بینگلور کے لئے روانہ ہوگئے۔ شام چار بجے کے قریب وہ بینگلور پہنچ گئے۔ یہ خوبصورت شہر جہاں کی سرسبز وشادابی زندگی کے لمحات کو حسین تر کر دیتی

ہے۔ بینگلور میں انہوں نے ہوٹل ٹیپو سلطان کا انتخاب کیا اور اس میں ایک کمرہ لے لیا۔ ایک گھنٹہ ستانے کے بعد تقریباً چھ بجے کے قریب تیار ہو کر دونوں ٹہلنے کی غرض سے ہوٹل سے باہر نکلے۔ سیما نے شوخ گلابی کلر کی پلین ساڑی جس پر ہلکا سا سلور کام تھا پہن رکھی تھی اور اسی مناسبت سے چاندی کا خوبصورت سیٹ پہنے ہوئے تھی۔ اس لباس میں اس کا حسن کافی نکھر آیا تھا۔ ہر کوئی اس جوڑے کو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا حالانکہ راستے میں کئی جوڑے خوشنما لباس میں ملبوس چہل قدمی کر رہے تھے مگر سیما کی بات ہی اور تھی۔ وسیم اور وہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اپنی دھن میں مگن مختلف راستوں اور بازاروں سے ہوتے ہوئے چلتے ہی چلے جا رہے تھے کہ ایک مانوس آواز نے سیما کو چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو مہاروتی کار میں کوئی بیٹھا ہوا اسے اپنی طرف بلا رہا تھا۔ وہ دونوں کار کی جانب بڑھے۔ بلانے والا کوئی اور نہیں بلکہ کیلاش تھا۔ ایک لمحہ کے لئے سیما کا چہرہ فق ہو گیا مگر دوسرے ہی لمحہ بغیر کسی جھجک کے اس نے وسیم سے کیلاش کا تعارف کرایا اور مختصر طور پر مینگلور آتے ہوئے راستے میں جو ملاقات ہوئی وہ بتا دی۔ اس کے بعد سیما نے کیلاش سے وسیم کا تعارف یہ کہہ کر کرایا کہ وہ اس کے شوہر ہیں۔ کیلاش کی حالت قابل دید تھی۔ بظاہر اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا تھا مگر وہ اندر سے بری طرح مجروح ہو چکا تھا۔

''آپ یہاں کب آئے؟'' سیما نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ کیلاش کو سیما کی مسکراہٹ اس وقت بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ اس کا وجود وسیم کے ساتھ وہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔

''چلیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں آپ کو شادی کی خوشی میں کھانا بھی کھلا دیں گے''۔ کیلاش کی آفر میں ہلکی ہلکی طنز کی جھلک بھی تھی۔ سیما جانے کے موڈ میں نہیں تھی مگر وسیم کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ چکا تھا۔ مجبوراً سیما کو بھی بیٹھنا پڑا۔ اتفاق سے کار میں جو ٹیپ چل رہا تھا اس میں آشا بھونسلے کا ایک خوبصورت گانا بج رہا تھا۔ جس کے بول کچھ یوں تھے

جایئے آپ کہاں جائیں گے
یہ نظر لوٹ کے پھر آئے گی

آخری بول پر کیلاش نے ونڈ اسکرین سے سیما کی جانب دیکھا جو نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ وہ بھی کچھ پریشان

سی لگ رہی تھی ۔کار کی رفتار اچانک کم ہوگئی ۔سامنے تاج محل ہوٹل تھا کار اس میں داخل ہوگئی ۔کار کے رکتے ہی سیما بھی اپنے خیالات کے مدوجزر سے باہر نکل آئی اور اس کے ساتھ وہ سب کار سے باہر نکل آئے ،اب ان کا رخ ڈائننگ ہال کی جانب تھا وہاں ایک میز کا انتخاب کر کے کیلاش نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود سیما کے مقابل بیٹھ گیا۔اب وہ با آسانی سیما کو دیکھ سکتا تھا۔سیما نے بھی محسوس کیا کہ کیلاش جان بوجھ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا ہے۔وہ بار بار نظریں چرا رہی تھی ۔وسیم ان تمام باتوں سے بے خبر ہال کے خوابیدہ ماحول میں کھویا ہوا تھا۔

اچانک وسیم اٹھ کھڑا ہوا کیلاش نے اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔اس نے اشارے سے بتایا کہ وہ واش روم جانا چاہتا ہے۔سیما نہیں چاہتی تھی کہ وسیم اسے کیلاش کے پاس تنہا چھوڑ دے۔وہ آج بہت گھبراہٹ محسوس کر رہی تھی جیسے ہی وسیم نظروں سے اوجھل ہوا تو جیسے کیلاش کو اسی کا انتظار ہی تھا۔

''شادی مبارک ہو! اچانک ہی ہوئی ہوگی؟'' وہ طنزیہ بولا۔

''نہیں تو! باقاعدہ دو مہینے کا وقت تھا۔شادی اچانک نہیں ہوئی نہ میں کہیں بھاگی جا رہی تھی اور نہ ہی وسیم''۔سیما نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''مجھے کیوں دعوت نامہ نہیں بھیجا؟'' کیلاش نے شکایتاً کہا۔

''میرے پاس آپ کا ایڈریس نہیں تھا سوائے فون نمبر کے ورنہ بھجوا دیتی'' سیما نے بیزاری سے جواب دیا۔

''شادی کے بعد آپ اور بھی سندر ہوگئی ہیں ،لگتا ہے آپ بہت خوش ہیں''۔اس نے مایوسی سے کہا

''کیوں خوش نہ ہوتی آخر وسیم میرا کزن بھی ہے اور بچپن کا دوست بھی''۔اس کا انداز سلگانے والا تھا۔

''میں بھی تو آپ کا دوست تھا''۔کیلاش نے نہ جانے کس جذبے کے تحت کہا۔

''ضروری نہیں کہ جو دوست ہو وہ جیون ساتھی بھی بنے اور پھر ہمارا کوئی ایسا تعلق بھی نہیں تھا، میں نے کوئی وعدہ بھی نہیں کیا تھا،سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرا تعلق مسلمان گھرانے سے ہے۔یہ اہم بنیادی فرق آپ کو یاد رکھنا چاہیے۔پلیز! آئندہ ایسی بات نہ کریں۔اب میں ایک شادی شدہ عورت ہوں''۔سیما نے آخری جملے پر زور دے کر اپنی بات مکمل کی۔کیلاش کا چہرہ سرخ ہوگیا۔دفعتاً اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا دل ہی دل میں وہ

خود کو ملامت کرنے لگا کہ بلاوجہ اس نے ہلکی بات کہہ کر اپنا امیج خراب کیا۔ تھوڑی دیر بعد وسیم آ گیا اور اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''سوری آپ لوگ بور ہو گئے ہوں گے''۔ اس نے معذرت کی۔

''بالکل نہیں''۔ کیلاش نے خفت مٹانے کی کوشش کی۔

ویٹر آرڈر لینے آیا تو سیما اور وسیم کی پسند پر چائنیز کھانے کا آرڈر دیا گیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گرین ٹی پی گئی۔ اس طرح رات نو بجے کے بعد فراغت ہوئی۔ واپسی پر کیلاش نے انہیں ان کے ہوٹل ڈراپ کیا اور پھر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ بینگلور میں وہ اپنے کسی دوست آنند کے گھر مقیم تھا۔ آنند بھی غیر شادی شدہ تھا اور وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ سیما کو ڈراپ کرنے کے بعد کیلاش بجائے وہاں جانے کے اپنی کار میں بلا کسی مقصد ڈرائیو کرتا ہوا ایک سڑک سے دوسری سڑک گھومتا رہا۔ وہ ذہنی طور پر بالکل آؤٹ تھا، کچھ محرومی کچھ رقابت اور کچھ کھونے کے احساس نے اس کے اعصاب پر برا اثر ڈالا تھا۔ آخر رات تقریباً دو بجے کے قریب وہ تھکا ہارا آنند کے گھر پہنچا۔ آنند کیلاش کی طرف سے فکر مند دروازے پر ہی ملا، اور اس سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

تمام رات سیما کروٹیں بدلتی رہی۔ رہ رہ کر اسے کیلاش کی باتوں پر غصہ آتا رہا کہ خواہ مخواہ وہ اس کے پیچھے ہی پڑ گیا ہے۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر اس نے وسیم کو مجبور کیا کہ وہ گوا جائے گی۔ وسیم نے ہوٹل کاؤنٹر سے دو سیٹیں گوا کے لئے لگژری بس میں بک کروالیں، پھر دوپہر کھانے کے بعد وہ دونوں گوا کے لئے روانہ ہو گئے۔ بے خیالی میں سیما نے کیلاش کی بسنتی کلر کی وہ ساڑی پہن لی جو اس نے مینگلور میں لے کر دی تھی۔ اچانک بس میں بیٹھے بیٹھے ساڑی کی طرف نظر پڑی تو اسے یاد آیا کہ یہ ساڑی تو کیلاش کا تحفہ تھی، اس کا موڈ مزید آف ہو گیا۔ وسیم نے بھی یہ بات نوٹ کی کہ سیما گزشتہ روز سے کچھ پریشان سی ہے، وہ سمجھ نہیں پایا کہ آخر قصہ کیا ہے۔

''سیما! کیا بات ہے کل سے تم کچھ پریشان ہو؟ ہنی مون منانے آئی ہو یا بور ہونے؟'' وسیم نے سنجیدگی سے کہا۔

''کوئی خاص بات نہیں، بس کبھی کبھی میرے سر میں شدید درد سا ہو جاتا ہے اس کی وجہ سے طبیعت اچاٹ سی ہو جاتی ہے'' سیما نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

"اگر سر میں درد تھا تو گوا آنے کی اتنی جلدی کیا تھی، ایک دن ریسٹ کر لیتیں"۔ وسیم بھی کھوج لگانے کے موڈ میں تھا۔

"میں نے دوا کھالی ہے، ابھی تھوڑی دیر میں آرام آجائے گا۔ گوا خوبصورت جگہ ہے وہاں کا حسن طبیعت کو بحال کر دے گا"۔ سیما نے زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وسیم کسی حد تک مطمئن ہو گیا تھا، مگر اس کے ذہن میں سوالات ابھر رہے تھے۔ بس تیزی سے اپنی منزل پر رواں تھی، اور جوں جوں شام ہوتی جا رہی تھی باہر کا منظر خوب سے خوب تر ہوتا جا رہا تھا۔ چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی، اونچے اونچے پہاڑ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی ندیاں، ہرے بھرے باغات، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بنے خوبصورت مکانات، ماحول میں رچی بسی سوندھی مٹی کی خوشبو، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں طبیعت میں ہیجان پیدا کر رہی تھی۔ سیما کا موڈ بھی دھیرے دھیرے نارمل ہو رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے اپنا سر وسیم کے کندھے سے ٹکا دیا اور آنکھیں بند کئے مستقبل کے حسین سپنوں میں کھو سی گئی۔ بس میں ویڈیو آن ہوا اور گیت مالا شروع ہو گیا۔ تمام مسافر اپنی اپنی سیٹوں پر سنبھل کر بیٹھ گئے اور ان کی نظریں بس میں لگے ٹی وی پر مرکوز ہو گئیں۔ ایک لمحہ کے لئے سیما نے آنکھیں کھول کر ٹی وی کو دیکھا اور دوبارہ وسیم کے کندھے سے لگ کر سو گئی۔ وسیم نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا پھر وہ خود بھی سیٹ سے سر ٹیک کر ٹی وی میں کھو گیا۔ رات کے قریب وہ گوا پہنچے۔ سیما یہاں پہلی بار آئی تھی، اس کے لئے یہاں کا ماحول بالکل ہی اجنبی تھا۔ تمام کے تمام لوگ رومن کیتھلک کرسچن تھے۔ خوبصورت حسین اور دلکش خواتین، لڑکیاں جینز، جیکٹ اور مڈی میں ملبوس اپنے شوہروں، بوائے فرینڈز کے ساتھ چہل قدمی کر رہی تھیں۔ سیاح بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ یہاں کا ماحول یورپ کے ماحول سے مطابقت رکھتا ہے۔ جیسے ہی سیما اور وسیم اپنے ہوٹل کے لئے پہنچے، ایک نو دس سال کے لڑکے نے خوبصورت گلدستہ ان کے آگے بڑھا دیا۔ سیما نے وہ گلدستہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وسیم نے لڑکے کو بیس روپے دیئے، وہ تھینک یو کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

سیما کا موڈ کافی حد تک بہتر ہو چکا تھا، شاید وہ ماحول کا بھی اثر تھا۔ اب وسیم نے کمرے میں قدم رکھا تو حیران رہ گیا۔ کمرہ بڑی نفاست سے سجا ہوا تھا۔ عموماً یہاں شادی شدہ جوڑے ہنی مون کی غرض سے قیام کرتے تھے۔

سیما بھی کمرے کو آراستہ دیکھ کر خوش ہوئی۔ اس نے آگے بڑھ کر پردے کو سرکایا، سامنے غضب کا منظر تھا۔ وہ سحر زدہ سی کھڑی تکتی رہی۔ قدرت کے اس حسین نظارے کو اس نے پہلی بار دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

''سیما کیا دیکھ رہی ہو؟'' وسیم نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ بھی دیکھیں، کتنا حسین منظر ہے۔ جی چاہتا ہے یہیں رہوں، یہاں کی زندگی میں کتنا رومانس ہے''۔ سیما نے خوشی کا اظہار کیا۔

چونکہ دونوں تھکے ہوئے تھے لہٰذا انہوں نے کھانا کمرے میں ہی منگوالیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سیما بالکونی میں جا کھڑی ہوئی، وہاں سے وہ ہوٹل آنے جانے والوں کا نظارہ کرتی رہی۔ اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ فضاء میں رات کی رانی اور موتیے کی ملی جلی مہک تھی، اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ وہ دبے پاؤں آکر بستر پر دراز ہوگئی۔

صبح ویٹر کی دستک سے سیما کی آنکھ کھلی تو نو بجے کا وقت تھا، اس نے وسیم کو جگایا اور خود تیار ہونے لگی۔ وسیم اور وہ تیار ہو کر ڈائننگ ہال میں آگئے، وہاں بہت سارے جوڑے پہلے ہی سے موجود تھے۔ ڈائننگ ہال آراستہ تھا باہر کا منظر بے حد حسین تھا۔ انہوں نے ساؤتھ انڈین ناشتے مسالا ڈوسے کا آرڈر دیا۔ یہ ساؤتھ کی خاص ڈش ہے۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں باہر چہل قدمی کے لئے نکل پڑے اور ٹہلتے ہوئے بازار کی طرف آگئے۔ سیما سفید رنگ کی ساڑی میں جس پر لال بارڈر تھا چارمنگ لگ رہی تھی، جہاں سے بھی گزرتی لوگ اسے نوٹ کر رہے تھے، وہ ان تمام باتوں سے بے خبر گوا کی دلکشی میں کھوئی چلی جا رہی تھی۔ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شاپنگ اسپاٹ بنے ہوئے تھے، وہاں تنکوں سے بنی ہوئی ٹوکریاں، فروٹ، باسکٹ، ہیٹ اور دیگر ہینڈی کرافٹ فروخت ہو رہی تھیں۔ اس کے علاوہ سیپ کی بنی خوبصورت چیزیں جن میں ڈیکوریشن پیس کے علاوہ زیورات بھی تھے۔ یہاں کافی تعداد میں اینگلو انڈین بھی آباد تھے۔ ساحلی علاقہ ہونے کی وجہ سے ساحل کے قریب کچھ خواتین تیراکی کے مختصر لباس میں چھتریوں کے سائے میں بیٹھی اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ کچھ تیر رہی تھیں۔ جگہ جگہ ناریل کے باغات تھے، کئی ایک مقام پر رک کر سیما اور وسیم نے کچے ناریل کا پانی بھی پیا۔ ان علاقوں میں گلوکوز کا نعم البدل ناریل کا پانی ہوتا ہے۔ تقریباً دو

تین گھنٹے کے بعد دونوں واپس ہوٹل آ گئے، کیونکہ انہیں بھوک لگ رہی تھی۔

دوپہر کے کھانے میں دونوں نے مچھلی چاول لیا پھر اپنے کمرے میں آ گئے اور آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہو گئے۔ وسیم تو سو گیا مگر سیما ایک فلمی میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی پھر شام کے لباس کا انتخاب کر کے سوٹ کیس میں سے کپڑے نکالے، ویٹر کو بلوا کر استری کے لیئے دیئے اور خود بھی لیٹ گئی۔

شام کے قریب وہ دونوں تیار ہو کر پکنک اسپاٹ پر روانہ ہوئے۔ سیما نے بلیک کلر کی پلین ساڑی باندھی اور کامدار بلیک بلاؤز اس سے میچ کر کے پہن لیا تھا۔ وسیم نے اس کو کئی بار فخریہ انداز میں دیکھا، یہ اس کے لئے اعزاز تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اس کی بیوی ہے۔ جیسے ہی وہ پکنک اسپاٹ پہنچے ایک پروفیشنل فوٹو گرافر ان کی طرف بڑھا۔

''ہیلو میم صاحب! میں آپ کا ایک پوز بنالوں؟'' فوٹو گرافر نے پرامید ہو کر پوچھا۔

''ہاں ٹھیک ہے ایک پوز آپ میم صاحبہ کی بنالیں اور دوسرا پوز ہم دونوں کا اکٹھا بنائیں''۔ وسیم نے خوشگوار انداز میں کہا۔

فوٹو گرافر نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے سیما کو پھولوں کی کیاریوں کی جانب جانے کے لئے کہا۔ سیما کیاریوں کے درمیان کھڑی ہو گئی۔ اس کے بعد فوٹو گرافر نے اس کی تصویر بنالی پھر ایک پوز دونوں کے ساتھ بنا دیا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد اس نے دونوں تصویریں تیار کر کے ان کو پیش کر دیں۔ سیما کی تصویر بہت خوبصورت تھی۔ وسیم نے تصویر بنوانے کا معاوضہ فوٹو گرافر کی ڈیمانڈ سے زیادہ ہی دیا۔ تصویریں سیما نے اپنے پرس میں رکھ لیں پھر ایک کونے میں خالی بینچ پر بیٹھ گئی۔ وسیم کچھ کھانے پینے کی چیزوں کی تلاش میں کافی دور نکل گیا۔ اب سیما اکیلی ہی بیٹھی سستا رہی تھی۔

''کیا نام ہے تیرا؟'' ایک موٹی بھدی مگر گوری رنگت کی خاتون نے اسے متوجہ کیا۔

''سیما! کیوں کوئی خاص بات ہے؟'' اس نے الٹا سوال کر ڈالا۔

''تو بہت لکی ہے، تجھے کوئی بہت زیادہ چاہتا ہے''۔ خاتون نے آنکھوں میں چمک پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں! وہ میرا شوہر ہے۔ وہ مجھے بہت چاہتا ہے''۔ سیما نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''مگر آپ کو کیسے معلوم کہ وہ مجھے چاہتا ہے؟'' سیما نے چونک کر کہا۔

''وہ تیرا پتی نہیں ہے جو تجھے چاہتا ہے بلکہ وہ کوئی اور ہے، کہیں دور رہتا ہے''۔ خاتون نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

سیما نے خاتون کا جائزہ لیا۔ وہ صورت شکل سے برہمن لگتی تھی۔ عمر کوئی پچاس اور ساٹھ سال کے درمیان تھی وہ سفید رنگ کی ساڑی باندھے ہوئے تھی، منہ میں پان دبا ہوا تھا، اس کے ہاتھ میں پرس کے علاوہ ایک بڑی سے مالا تھی جس میں رنگ برنگے موتی تھے۔

''بھگوان کی کرپا ہے، مجھے بہت سارے اندر کے بھید معلوم ہو جاتے ہیں۔ تو بہت سیدھی ہے بچ کر چل۔ اعتبار ہر کسی پر مت کرنا، پچھتائے گی۔ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے واپس چلی جا، میری بات یاد رکھ''۔ آخری جملے پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا اور بڑبڑاتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

سیما کچھ پریشان سی ہو گئی، خوف کی ایک لہر آئی اور اس کے اعصاب شل سے ہونے لگے۔ اسی دوران وسیم کھانے پینے کی چیزیں لے کر پہنچ گیا۔

''کیا بات ہے جانو؟ کچھ پریشان سی لگ رہی ہو؟ خیریت تو ہے؟'' وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

سیما نے تمام تفصیل بیان کی جو اجنبی خاتون نے اس سے کہی تھی البتہ اس نے کسی اور کے چاہنے کی بات کو چھپا لیا تھا یہ حالات کا تقاضا بھی تھا۔

سیما عورت کی کہی ہوئی باتوں سے خوف زدہ سی ہو گئی تھی حالانکہ وہ علم نجوم یا پیش گوئی وغیرہ پر یقین نہیں کرتی تھی مگر وہ پھر بھی پریشان ہو گئی۔ اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ وہ وسیم کو مجبور کر کے واپس ہوٹل آ گئی۔ رات کا کھانا بھی انہوں نے جلدی منگوا کر کھا لیا تھا۔ کھانے سے فراغت کے بعد سیما نے وسیم سے واپس مینگلور چلنے کو کہا جبکہ وسیم نہیں جانا چاہتا تھا۔ سیما کی پریشانی دیکھتے ہوئے اس نے حامی بھر لی۔

اگلی صبح انہوں نے مینگلور جانے والی بس پکڑ لی اور روانہ ہو گئے۔ اتفاق سے اس دن موسم بہت رومانٹک تھا۔ ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، بس ڈرائیور بھی اچھے موڈ میں تھا۔ اس نے موسم کے لحاظ سے فلمی گانوں کا کیسٹ لگا رکھا تھا جو پوری آواز سے بج رہا تھا۔ سیما نے اورنج کلر کی بہت خوبصورت ساڑی باندھی ہوئی تھی گو کہ وہ سنجیدہ

تھی مگر اس کے باوجود حسین لگ رہی تھی ۔ وسیم بار بار پہلو بدل بدل کر اس کو تکے جا رہا تھا لیکن وہ اپنے خیالوں میں مگن تھی ۔ وسیم اس بات پر حیران تھا کہ آخر سیما برہمن عورت کی پیشنگوئی کو کیوں اتنی سنجیدگی سے لے رہی ہے۔ آہستہ آہستہ اس کے ذہن میں شادی کے بعد سے اب تک کے تمام واقعات گردش کرنے لگے اور وہ کڑی سے کڑی ملانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان تمام تر واقعات کو ملانے کے بعد بھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ تھک ہار کر اس نے خود کو اس رومانٹک ماحول میں شامل کر لیا اور انجوائے کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد سیما بھی نارمل ہونے لگی، کسی حد تک اس کا اندرونی خوف کم ہونے لگا۔ جوں جوں سفر طے ہوتا گیا اس کا موڈ بہتر سے بہتر ہونے لگا۔ اب وہ بات بے بات قہقہے بھی لگانے لگی۔ اس کی اس تبدیلی پر وسیم نے سکون کا سانس لیا۔

دوپہر کے کھانے کے لئے بس بینگلور رکی۔ وہ دونوں بھی دیگر مسافروں کے ساتھ ہوٹل میں داخل ہوئے۔ انہوں نے نان ویجی ٹیرین کھانا کھایا پھر چائے پی کر واپس بس میں اپنی سیٹ پر چلے گئے۔ یہاں بس تقریباً ایک گھنٹہ رکی اس کے بعد اپنے بقیہ سفر پر روانہ ہوئی۔ موسم بھی لاجواب ہو گیا تھا۔ سیما بھی خوش تھی۔ وسیم اور وہ مسلسل باتیں کرتے رہے۔

”سیما! تم عجیب ہو، کبھی خوش دکھائی دیتی ہو اور کبھی سنجیدہ، میں آج تک تمہارے اس تضاد کو نہیں سمجھ سکا آخر اس کی کیا وجہ ہے؟“ وسیم نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

”کوئی خاص وجہ نہیں، قسمت سے ڈر لگتا ہے۔ پہلی بار شادی ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہوئی۔ میں مزید کسی حادثے یا واقعہ کو برداشت نہیں کر پاؤں گی“۔ سیما نے وضاحت کی۔

”تم بالکل باؤلی ہو۔ حادثات بار بار نہیں ہوتے۔ ایک واقعے کو بیس بنا کر پوری زندگی اندیشوں میں گزارنا حماقت ہے“۔ اس نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”پتا نہیں کیوں مجھے ہر وقت ایک انجانا سا خوف لگا رہتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے، لاکھ کوشش کے باوجود میں اس خوف کو دل سے نہیں نکال سکتی“۔ سیما نے جھرجھری لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

وسیم نے اسے تسلی دینے کے لئے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا تو وہ بالکل ٹھنڈے ہو رہے تھے، وہ واقعی پریشان ہو گیا۔

''اچھا یہ بتاؤ! امی کے پاس کب جانا ہے؟ میری مراد تمہارے میکے سے ہے''۔ وسیم نے اس کی توجہ دانستہ دوسری طرف مبذول کر دی۔

''آٹھ دس دن بعد جاؤں گی کیونکہ مجھے ان کیلئے کچھ شاپنگ بھی کرنی ہے''۔ اس نے دھیمے سے کہا۔

''اچھا اب ساری باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تم مجھے کتنا چاہتی ہو؟'' وسیم نے پیار بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''اس سلسلے میں مجھے لفاظی نہیں آتی، ہاں البتہ آنے والا وقت اس بات کی گواہی ضرور دے گا، قبل از وقت میں کسی بلند و بانگ دعوے کی عادی نہیں''۔ آخری جملے پر زور دیتے ہوئے اس نے بات صاف کی۔ اس کے جواب میں وسیم مطمئن ہو گیا پھر وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتیں رہے۔

''تم مجھ سے کتنی محبت کرتے ہو؟'' اچانک سیما نے سادگی سے پوچھا۔

ایک لمحے کے لئے وسیم بھی اس مختصر سے سوال کا جواب تلاش کرتا رہا۔

''جتنا تم مجھ کو چاہتی ہو، میں اس سے بڑھ کر چاہوں گا، یہ میرا وعدہ ہے''۔ اس نے پر عزم لہجے میں بات مکمل کی سیما نے اس کے جواب پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا اور بس سے باہر کے ماحول میں کھو گئی۔

شام ہو چلی تھی مگر موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے وقت کا تعین مشکل تھا۔ سبزہ دھلا دھلا، پھول کھلے کھلے معلوم ہو رہے تھے۔ ہرے بھرے اونچے اونچے پہاڑوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ بس پوری رفتار سے اپنی مسافت طے کر رہی تھی۔ اچانک بس کا ایک ٹائر دھماکے سے پھٹ گیا، ڈرائیور نے پوری قوت سے بریک لگایا۔ بس نے تیزی سے جھٹکا کھایا اور سیدھی سائیڈ پر کھیتوں میں اتر گئی۔ خوش قسمتی سے الٹنے سے بچ گئی۔ ایک ایک کر کے تمام مسافر بس سے باہر آ گئے۔ سیما بھی ساڑی کا پلو اٹھاتی ہوئی باہر نکلی۔ وہ شام کے اس منظر میں دلکش لگ رہی تھی۔ مسافروں کے چہروں پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر دوسرا وہیل تبدیل کرنے میں لگے رہے۔ اس سلسلے میں مسافروں نے بھی مدد کرنا شروع کی۔ اس وقت بارش رک چکی تھی مگر سڑک گیلی ہو رہی تھی۔ دور سے ایک دوسری بس آتی ہوئی دکھائی دی۔ تمام لوگوں کی نظریں اس پر لگی رہیں۔ جب وہ بس قریب آ گئی تو اس نے اپنی اسپیڈ کم کی۔ ڈرائیور وجہ جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دوران

تیزی سے ایک سرخ رنگ کی کار قریب آئی، اس میں سے ایک لمبے قد کا نوجوان باہر نکلا، اس کا رخ بھی بس کی ہی طرف تھا دیگر لوگوں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی کیونکہ ان کی دلچسپی صرف متاثرہ بس سے تھی۔ وسیم بھی جھک کر ٹائر کی تبدیلی کو دیکھ رہا تھا۔ سیما تھوڑے فاصلے پر کھڑی بس ہی کو دیکھ رہی تھی۔ کار سے نکلنے والا اجنبی نوجوان سیما سے تھوڑے فاصلے پر خاموش کھڑا ہو گیا حالانکہ سیما نے اسے دیکھ لیا تھا مگر بظاہر دونوں نے ایک دوسرے کو نظر انداز کیا۔ وہ سرخ رنگ کی کار پیچھے ہی کھڑی تھی مگر اس کی ہیڈ لائٹس آن تھیں جبکہ تاریکی نہیں تھی۔ کار کی رفتار آہستہ آہستہ بڑھنے لگی جیسے ہی وہ سیما کے قریب پہنچی، اجنبی نوجوان نے سیما کو کار کا دروازہ کھول کر اندر کی طرف دھکیل دیا اور خود دوسری طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آ بیٹھا چونکہ کار پہلے ہی سے اسٹارٹ تھی اس لئے اسپیڈ بڑھانے میں دشواری نہیں ہوئی۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ کوئی بھی سیما کی مدد کو نہیں پہنچ سکا، خود سیما بھی ہکا بکا رہ گئی۔ وسیم دیوانوں کی طرح کار کو جاتا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اب تمام مسافر وسیم کے گرد جمع ہو گئے اور سوالات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہ حیران و پریشان لوگوں کے درمیان نیم پاگل سا ہو رہا تھا۔ وہاں دو بسوں کے علاوہ دوسری کوئی اور سواری نہیں تھی جو اس کار کا تعاقب کرتی۔ پچھلی بس کا ڈرائیور اپنی بس سے اتر آیا اور وسیم کو مدد کی پیش کش کرنے لگا۔ وسیم نے اس سے صرف اتنا کہا کہ وہ اگر پہلے کسی ہوٹل وغیرہ کی طرف جائے اور پولیس اسٹیشن قریب پڑے تو وہاں اطلاع کر دینا۔

وہ بس روانہ ہو گئی۔ پانچ منٹ بعد وسیم کی بس بھی روانہ ہوئی۔ وسیم بادل نخواستہ اپنی سیٹ پر بیٹھا۔ اسے یہ احساس ہی کھائے جا رہا تھا کہ وہ اکیلا جا رہا ہے، اس کی محبوب بیوی سیما اس کے ساتھ نہیں تھی۔ اس کی کیفیت پاگلوں کی طرح تھی اور آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسے اپنی بے بسی پر رونا آ رہا تھا کہ وہ اس وقت کتنا مجبور ہے کہ اسے اسی بس پر انحصار کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کا بس چلتا تو وہ پر لگا کر اڑتا اور سیما کو تلاش کر کے لے آتا۔ وہ حیران تھا کہ آخر سیما کو کون اور کیوں لے گیا ہے؟ دفعتاً اسے اس نجومی خاتون کی بات یاد آ گئی اور وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بس میں بیٹھے دو مسافر آگے بڑھے اور وسیم کو تسلی دینے لگے مگر اس کو کسی بھی طور قرار نہیں آ رہا تھا۔ سفر ہنوز جاری تھا۔ رات تقریباً گیارہ بجے کے قریب کا سرکوٹ نام کا ایک گاؤں آیا۔ وسیم اپنے سامان سمیت وہاں اتر گیا اور سیدھا پولیس اسٹیشن پہنچا پھر تمام صورت حال تھانہ انچارج کو بتائی اس کے بعد وہاں سے اس نے مینگلور اپنی

والدہ سے بات کی اور تمام تفصیل گوش گزار کی۔ تھانہ انچارج کی مدد سے اس نے ایک پرائیویٹ کار کرایہ پر حاصل کی یوں مینگلور کی طرف روانہ ہوا۔ صبح چار بجے کے قریب وہ مینگلور سٹی پہنچ گیا۔ جب وہ گھر میں داخل ہوا تو اس کی والدہ کی حالت غیر ہو چکی تھی پھر اس نے فون پر رابطہ قائم کر کے سیما کے والد کو بھی اس واقعہ سے آگاہ کیا۔ انہوں نے کاروار پولیس کے ڈی۔ سی۔ کو فون کر کے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا کیونکہ ڈی۔ سی۔ کاروار ان کا دوست تھا۔ سیما کے اغواء کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی۔ وسیم اور ان کے خاندان کے بقول دشمنی کی بھی یہ کوئی واردات نہیں تھی۔ اسے لے جانیوالے بھی شکل سے کوئی مجرم نہیں لگتے تھے پھر کیا وجہ تھی، یہ بات عقل سے بالاتر تھی۔

سیما کی آنکھ کھلی تو صبح کی سپیدی پھیل چکی تھی۔ اس نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی تو رسٹ واچ صبح کے نو بجا رہی تھی۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا، وہ ایک خوبصورت بیڈ پر تھی جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ کل شام اسے دو نوجوان سب لوگوں کی موجودگی میں اٹھا لائے تھے، یہ تمام واقعہ اتنی جلدی میں ہوا کہ خود اس کو بھی مزاحمت کا موقع نہیں مل سکا تھا۔ اس کو صرف اتنا یاد رہا کہ وہ گاڑی میں ڈال دی گئی ہے۔ اس کے بعد اس پر غنودگی چھانے لگی تھی غالباً وہ یا تو بے ہوش رہی تھی یا اسے کوئی خواب آور چیز دی گئی تھی۔ بہر حال اسے نہیں معلوم کہ وہ اب تک کیسے غفلت سے سوئی رہی تھی۔ وہ کون لوگ تھے اور کس مقصد کے تحت اسے یہاں لائے تھے وہ نہیں جانتی تھی۔ خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگی، خود کو اور اپنی عزت کو آنے والے لمحوں میں غیر محفوظ سمجھ کر کانپنے لگی۔ اب اس نے کمرے کا طائرانہ جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرہ سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا بالکل نیٹ اور کلین تھا۔ وہ خاموشی سے بستر سے اتر گئی اس کا رخ واش روم کی طرف تھا۔ واش بیسن پر لگے آئینے میں اس نے اپنا چہرہ دیکھا۔ زیادہ سونے کی وجہ سے چہرے پر ہلکا ہلکا سا ورم آ گیا تھا۔ بال بے ترتیب الجھے ہوئے تھے۔ ساڑی پر شکنیں پڑی ہوئی تھیں۔ ان تمام کیفیات کو محسوس کر کے اسے چکر سے آ گئے۔ اس نے تازگی کے لئے منہ ہاتھ دھویا اور وہاں رکھے برش سے بال سنوارنے لگی پھر باہر نکل کر اس نے دروازے کو کھولنا چاہا تو وہ باہر سے بند تھا یعنی اس بیڈ روم سے وہ باہر نہیں جا سکتی تھی، کئی جگہ پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس نے ایک ایک کر کے ان کو سرکانے کی کوشش کی مگر اسے بالکونی کہیں بھی نظر نہیں آئی صرف

درمیان میں ایک کھڑکی نظر آئی اس پر بھی جالیاں لگی ہوئی تھیں۔ باہر کا منظر صاف نظر آرہا تھا۔ وہاں سے لان اور اطراف میں بنی باڑ صاف نظر آرہی تھی۔ ہاں البتہ ایک گارڈ کھڑا نظر آیا، اس نے مایوس ہو کر دوبارہ پردوں کو درست کیا۔ کمرے کی وضع قطع سے اسے اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ وہ کسی مسلمان کی تحویل میں ہے یا ہندو کی۔ وہ پریشانی کے عالم میں ٹہلنے لگی۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور ایک ملازم ہاتھ میں ناشتے کی ٹرے لئے داخل ہوا۔ سیما دوڑ کر دروازے کی طرف گئی کہ باہر نکل سکے مگر دروازے کے باہر وہی گارڈ کھڑا تھا جو تھوڑی دیر قبل اسے نیچے گیٹ پر نظر آیا تھا، ناچار وہ واپس گئی اور قریب پڑے ہوئے صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ بھوک، ڈر اور خوف ساری کیفیات اس پر غالب آگئیں، وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''سیما! سیما!''۔ کسی نے اسے پکارا۔ نیم غنودگی میں اسے ایسا لگا جیسے یہ آواز کہیں دور سے آرہی ہے۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی بالآخر اس نے آنکھیں کھولیں، حیرت سے اس نے اپنے مدمقابل کو دیکھا اور دیکھتی ہی رہی کیونکہ وہ کوئی اور نہیں کیلاش تھا۔ کیلاش کو دیکھتے ہی سیما کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ غصے میں یک دم بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تو یہ آپ کا کارنامہ تھا۔ بہت بہادری کا ثبوت دیا آپ نے۔ اس کارنامے پر تو آپ کو گولڈ میڈل دینا چاہئے''۔ سیما نے نفرت سے کہا۔

''سوری سیما! میں دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ آپ وشواس کریں، آپ کی شادی کا سن کر میں کتنا اپ سیٹ ہوں، آپ سوچ بھی نہیں سکتیں''۔ کیلاش نے اعتراف کرتے ہوئے اپنے جذبات کی عکاسی کی۔

''کم از کم آپ اتنا ہی سوچ لیتے کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں، اس سے آپ کو حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا بلکہ میرے دل میں آپ کے لئے جو احترام تھا وہ بھی ختم ہوگیا۔ اب میرے دل میں آپ کے لئے نفرت کے علاوہ کچھ بھی نہیں رہا''۔ سیما نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''سیما! پلیز ایسا مت کہنا، میں سب کچھ برداشت کرلوں گا مگر آپ کی نفرت برداشت نہیں ہوگی''۔ کیلاش نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

''آپ کی ان تمام فضول باتوں کا کیا مطلب ہے؟ میں نے شروع ہی سے واضح کر دیا تھا کہ میں پہلے مسلمان

ہوں اوراب ایک شادی شدہ خاتون ہوں۔ بچپن سے آج تک وسیم سے محبت کی اوراب بھی کرتی ہوں، اس سے آگے میں نے نہ پہلے کبھی سوچا نہ ہی سوچوں گی لہٰذا آپ میرا پیچھا کرنا چھوڑ دیں۔ان تمام باتوں سے کچھ بھی حاصل نہیں ہونا ہے بلکہ نقصان زیادہ ہے۔خاص طور پر آپ کیلئے، آپ کے خلاف اغواء کا کیس بن سکتا ہے ساتھ ہی ساتھ بدنامی میری بھی ہوگی'' ۔سیمانے تفصیل سے حقیقت کی جانب اشارہ کیا۔

کیلاش کا چہرہ فق ہوگیا۔اسے امید نہیں تھی کہ سیما اتنی درشتگی سے پیش آئے گی۔

''میں آپ کے معاملے میں ایموشنل ہوگیا ہوں جو جی میں آیا کرگزرا، انجام سوچا ہی نہیں۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے محبت کرنے والے انجام کی پروانہیں کرتے'' ۔کیلاش نے صفائی پیش کی۔

''محبت یک طرفہ اور شادی شدہ سے نہیں ہوتی اور نہ ہی محبت کرنیوالے کسی کو زبردستی اٹھا کر لے آتے ہیں، یہ جرم ہے'' ۔سیمانے تنگ آکر کہا۔

''مجھے واقعی اپنی غلطی کا احساس ہے۔ مجھے ایسا غلط کام نہیں کرنا چاہئے تھا۔اب بتائیں میں کیا کروں؟''اس نے سوالیہ نظروں سے سیما کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بس اتنی مہربانی کریں، مجھے میرے شوہر کے پاس بھجوادیں، پتا نہیں وہ کتنے پریشان ہوں گے'' ۔اس نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے آپ ناشتہ وغیرہ کرلیں اور تیار ہوجائیں۔ میں بندوبست کرواتا ہوں'' ۔کیلاش نے رضامندی ظاہر کردی مگر سیما خوش نہیں تھی۔ وہ آنے والے واقعات کو اچھے پس منظر میں نہیں دیکھ رہی تھی۔اسے اندازہ تھا کہ اس کا اچانک مینگلور پہنچ جانا کسی قیامت سے کم نہ ہوگا۔راستے میں چیکنگ لازمی ہوگی کیونکہ وسیم اور اس کے والد نے مقدمہ درج کرایا ہوگا۔کیلاش اس کے ساتھ جا نہیں سکتا تھا کیونکہ ٹارگٹ وہی تھا۔اگر وہ خود بخود بھی پہنچ جائے تو بھی اس کی پوزیشن مشکوک ہوجاتی، کوئی تدبیر، کوئی صورت نہیں بن پارہی تھی۔ وہ مزید افسردہ ہوگئی۔

''کیا سوچ رہی ہیں؟ ناشتہ کرلیں'' ۔کیلاش نے قریب آتے ہوئے کہا۔سیمانے چونک کر ناشتہ کی ٹرے دیکھی جو بیڈ کے قریب ٹیبل پر رکھی تھی۔اس میں کچھ پوریاں، آلو کی ترکاری، چند سلائیس اور مکھن کے ساتھ جام بھی

پلیٹ میں سجا کر ترتیب سے رکھا گیا تھا۔ ناشتہ کو دیکھ کر سیما کی بھوک مزید چمک اٹھی۔ وہ فوراً ناشتہ کرنے لگی۔ اس نے اخلاقاً بھی کیلاش کو ناشتے کے لئے نہیں پوچھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے اپنا حلیہ صحیح کیا اور کیلاش کا انتظار کرنے لگی کیونکہ وہ اپنے کسی دوست سے رابطہ کرنے گیا تھا۔ تقریباً گیارہ بجے کے قریب کیلاش کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بہت بجھا بجھا سا تھا، کچھ شرمندگی، کچھ کھو جانے کے احساس نے اسے بالکل ہی نڈھال کر دیا تھا۔ سیما بھی پریشان تھی۔ اس کی پریشانی بجا تھی۔ وہ گھر جا کر کیا بتاتی۔ کوئی واضح اور مربوط جواب اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

''آپ نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اپنے گھر والوں اور پولیس والوں کو کیا جواب دوں؟ کیا جواز پیش کروں؟'' سیما نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں، میں نے اپنے دوست اشوک اور اسی کی بیوی کرن کو تیار کر لیا ہے۔ وہ اپنے طور پر آپ کو پولیس اسٹیشن لے جائیں گے اور وہاں اپنے بیان میں یہ کہہ دیں گے کہ دولڑکے اس عورت کو لے کر جا رہے تھے، شور مچانے پر راستے میں چھوڑ کر بھاگ گئے چونکہ رات بارش ہو رہی تھی لہٰذا ہم اب پولیس اسٹیشن لے کر آئے ہیں۔ وہ دونوں نیچے گاڑی میں بیٹھے ہیں، میں ان سے آپ کا پری چے (تعارف) کرادوں''۔ کیلاش نے تفصیل بتائی، وہ سیما کو لے کر نیچے گاڑی کی طرف آیا۔ سیما نے دیکھا وہ ایک لحیم شحیم سا شخص تھا مگر نقوش اچھے تھے البتہ اس کی بیوی کرن نازک سی خوبصورت عورت تھی۔ سیما کو دیکھتے ہی وہ دونوں کار سے باہر نکلے اور سیما کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔

''مجھے اشوک کہتے ہیں اور یہ میری پتنی ہیں کرن''۔ اشوک نے انکساری سے کہا۔

''جی مجھے سیما کہتے ہیں، میں آئی نہیں بلکہ لائی گئی ہوں''۔ اس نے وضاحت کی۔

''ہمیں معلوم ہے کیلاش نے بڑی بے وقوفی کی ہے''۔ کرن نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔

''پہلے تم ہمارے گھر چلو، اسے دیکھ لو تا کہ جو بھی بیان پولیس کو دیا جائے اس میں فرق نہیں ہونا چاہئے ورنہ پرابلم ہو جائے گی''۔ کرن نے تجویز پیش کی پھر کرن نے کار کا پچھلا دروازہ کھولا اور سیما کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ خود اگلی سیٹ پر شوہر کے برابر بیٹھ گئی۔

کیلاش نے کار میں بیٹھنے کی کوشش کی تو اشوک نے منع کیا اور کار اسٹارٹ کر دی۔گاڑی کا رخ اشوک کے گھر کی طرف تھا، تمام راستے سیما مختلف قسم کے خیالات میں غرق رہی،اتنے میں اشوک کا مکان آ گیا یہ ایک خوبصورت اور دو منزلہ مکان بڑی نفاست اور خوبصورتی سے بنا ہوا تھا۔مکان کے چاروں طرف ہریالی ہی ہریالی تھی، کچھ پھولوں اور پھلوں کے درخت کے علاوہ کیاریاں بھی بنی ہوئی تھیں۔مکان کے ایک طرف کشادہ گیراج بنا ہوا تھا۔اشوک نے کار وہاں پارک کی پھر سب ہی کار سے اترے۔کرن نے سیما کو آگے آنے کا اشارہ کیا۔سیما اندر داخل ہوئی تو حیران رہ گئی۔مکان باہر سے جتنا خوبصورت تھا اندر سے وہ اتنا ہی آراستہ تھا۔کرن اشوک اور سیما کو ڈرائینگ روم میں چھوڑ کر کچھ مشروب لینے چلی گئی۔تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھا سا ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا آیا۔اس پر تین گلاس لیمن جوس کے رکھے تھے۔

''یہ ہماری مہمان ہیں۔کل رات دولٹر کے اس بے چاری کو گاڑی میں ڈال کر لے جا رہے تھے۔اشوک کے تعاقب کرنے سے وہ اسے راستے میں ہی چھوڑ کر بھاگ گئے''۔کرن نے ملازم کو مخاطب کر کے کہا۔

''اشوک بابو نے انہیں نہیں دیکھا کہ وہ کون لوگ تھے''۔بوڑھے ملازم نے وضاحت چاہی۔

''دراصل اندھیرا تھا اور بارش بھی ہو رہی تھی یہی وجہ تھی کہ گاڑی کی نمبر پلیٹ بھی نہ دیکھ سکے اور نہ ہی ان لوگوں کو۔جلدی میں ہم نے اس کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیا، ہمارا یہ خیال تھا کہ سیما یہیں ہبلی میں رہتی ہے مگر یہ مینگلور کی رہنے والی ہے۔رات ہم نے اسے اوپر والے کمرے میں ٹھہرایا تھا۔اب اسے پولیس اسٹیشن لے جائیں گے تاکہ اصل معاملے کا آندولن (تحقیقات) ہو سکے''۔کرن نے بڑی صفائی سے جھوٹی کہانی اپنے بوڑھے ملازم کے گوش گزار کر دی تاکہ وقت ضرورت گواہی کے طور پر پیش کی جا سکے۔سیما سر جھکائے کرن کی تمام کہانی سنتی رہی،اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔اشوک بھی کرن کی گفتگو سنتا رہا۔میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔کرن نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔چونکہ پیشے کے لحاظ سے وہ ڈاکٹر تھی،اس لئے وہ بہت بولڈ تھی۔تینوں ڈرائینگ روم سے نکل کر گیراج کی طرف آئے۔اشوک نے گاڑی باہر نکالی پھر کرن اور سیما بھی کار میں سوار ہوئے۔اب ان کا رخ پولیس اسٹیشن کی طرف تھا۔اشوک نے کار ہبلی پولیس اسٹیشن کے باہر پارک کی پھر وہ تینوں تھانے میں داخل ہوئے۔تھانہ انچارج اشوک کا پرانا دوست تھا۔اشوک کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا کرن اور سیما کو

نمستے کہتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر اس نے بیل بجا کر چائے لانے کا آرڈر دیا۔

’’شنکر داس کیسے ہو؟ نوکری کیسی چل رہی ہے؟‘‘ اشوک نے خوش دلی سے پوچھا۔

’’بالکل ٹھیک ہوں اور نوکری بھی ٹھیک ہی چل رہی ہے۔ تم کھو تھانے کیسے آئے؟ فون کر دیا ہوتا۔ میں گھر ہی آجاتا‘‘۔ شنکر داس نے انکساری سے کہا۔

’’بات ہی کچھ ایسی تھی کہ یہاں آنا ضروری تھا‘‘۔ اشوک نے وضاحت کی۔ اس کے بعد جو کہانی اس نے بوڑھے ملازم کو سنائی تھی وہی یہاں بھی دہرادی۔ شنکر داس نے توجہ سے تمام باتیں سنیں پھر اس نے رجسٹر چیک کر کے اشوک کو بتایا کہ سیما کے متعلق اغواء کی رپورٹ یہاں پہلے ہی آچکی ہے انہیں مختلف جگہوں پر تلاش بھی کیا جارہا ہے۔ شنکر داس خوش ہوگیا کہ بغیر کسی محنت کے آسانی سے سیما کا کیس بیٹھے بیٹھائے حل ہوگیا، اسے جلد بازیابی کے حوالے سے شہرت الگ ملتی۔ شنکر داس نے وائرلیس کے ذریعے سیما کی بازیابی کی اطلاع دی اور اپنی موبائیل کے ذریعے سیما کو مینگلور لے جانے کی تیاری کرنے لگا۔ کرن اور اشوک نے سیما کو گڈ لک اور گڈ بائے کہا پھر اپنے گھر روانہ ہوگئے۔

شنکر داس نے دوپہر کا کھانا منگوا کر سیما کو دیا اور خود بھی کھانے اور کپڑے بدلنے کے لئے گھر گیا، تقریباً ایک گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔ واپس آتے ہی اس نے سیما کو گاڑی میں بٹھایا اور خود بھی دو پولیس والوں کے ہمراہ موبائیل میں بیٹھا پھر گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ ان کی منزل مینگلور سٹی تھی۔ سیما بہت اپ سیٹ رہی، وہ اس وقت غیر یقینی صورتحال کا شکار تھی۔ وسیم کا رویہ کیا ہوگا؟ یہ بات اس کے لئے تشویش کا سبب بنی ہوئی تھی۔

جیسے ہی دروازہ پر بیل ہوئی وسیم نے تیزی سے دروازہ کھولا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ اس کے سامنے سیما کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ دو پولیس والے بھی تھے۔ سیما ڈرائینگ روم میں آئی، وسیم کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے، وہ آبدیدہ ہوگئی۔

’’ان سے ملیئے یہ میرے شوہر وسیم ہیں‘‘۔ اس نے شنکر داس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

’’جی میرا نام شنکر داس ہے میں ہبلی میں تھانہ انچارج ہوں اور میرے ساتھ انسپکٹر شرما ہیں، ان کا تعلق مینگلور سٹی سے ہے‘‘۔ شنکر داس نے گرم جوشی سے کہا۔

وسیم نے گہری نظر سیما پر ڈالی وہ جلد سے جلد حقیقت جاننا چاہتا تھا۔ سیما اس کی اس بے چینی کو محسوس کر رہی تھی۔ وہ خود بھی سہمی سہمی سی لگ رہی تھی۔ اس کے اندر کا خوف اس کے چہرے سے عیاں تھا۔ شنکر داس سیما اور وسیم دونوں کے تاثرات نوٹ کرر ہا تھا۔

''آپ کی پتنی کو ہم نے حفاظت کے ساتھ آپ تک پہنچا دیا ہے، باقی کاروائی تھانے آکر پوری کرلیں''۔ شنکر داس نے خاموشی توڑی۔

''میں آپ کو چائے پیئے بغیر نہیں جانے دوں گا۔ پلیز تھوڑی دیر تو بیٹھ جائیں''۔ وسیم نے اصرار کرتے ہوئے کہا اور انہیں ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا۔ شنکر داس نے ایک سرسری سی نظر کمرے پر ڈالی اور وسیم سے مخاطب ہوتے ہوئے پوری اغواء کی کہانی جو کرن نے بیان کی تھی اس کے گوش گزار کر دی۔ اس کہانی سے وسیم کسی حد تک مطمئن ہو گیا۔ اس نے اشارے سے سیما کو اندر جانے کے لئے کہا۔ سیما تیزی سے اندر کی طرف بھاگی اور خالہ سے لپٹ گئی۔ خالہ یعنی وسیم کی والدہ اور وہ دونوں کافی دیر تک روتی رہیں یہاں تک کہ ان کی ہچکی بندھ ہو گئی۔ وسیم بھی شنکر داس کو فارغ کر کے اندر آ گیا پھر سیما کو اپنے بیڈ روم میں لے گیا۔ سیما تھکی ہوئی تھی وہ بستر پر دراز ہو گئی۔ وسیم اس کے سرہانے بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھوں کو بغور دیکھا وہ گندے ہو رہے تھے، کپڑے بھی میلے تھے۔

''سیما تم پہلے نہا لو اور فریش ہو جاؤ، تمہارے چہرے سے تھکن کا احساس ہو رہا ہے''۔ وسیم نے پیار سے کہا۔ اس نے واقعات معلوم کرنے کی کوشش بالکل نہیں کی۔ سیما نے الماری کھول کر اس میں سے اپنے کپڑے نکالے اور واش روم میں گھس گئی۔ جب وہ باہر نکلی تو وسیم سو چکا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آئی، برش سے اپنے بال سلجھانے لگی اس کے بعد ہلکا سا میک اپ کیا اور باہر باورچی خانے میں خالہ کے ساتھ کھڑی ہو کر ان کا ہاتھ بٹانے لگی۔ خالہ نے مچھلی فرائی کی تھی اس کے علاوہ دال چاول اور آلو کی سبزی پکائی تھی۔ یکدم سیما کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے جلدی جلدی میز پر کھانا لگانا شروع کیا پھر وہ وسیم کو جگانے کے لئے اپنے کمرے میں چلی آئی اور اسے اٹھانے لگی۔ وسیم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا پھر سیما کو مدمقابل پا کر مسکرانے لگا پھر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خالہ ان کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی اور سیما

سے تفصیل معلوم کرنے لگیں۔ سیما نے شروع سے آخر تک تمام تفصیلات بیان کیں۔ تمام واقعات سن کر خالہ لرز کر رہ گئیں پھر انہوں نے سیما کی والدہ کو اطلاع کی اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ وسیم اور سیما اپنے کمرے میں آ گئے۔ خلاف توقع وسیم خاموش تھا، پتا نہیں وہ کیا سوچ رہا تھا، اس کی اس کیفیت سے سیما کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ سیما بھی خاموشی سے آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ وسیم نے بیڈ روم کی لائٹ آف کر دی اور ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ اس کی روشنی سیما کے چہرے پر پڑنے لگی تو اس نے آنکھیں بند کر لیں اور دوسری طرف منہ پھیر لیا۔

وسیم نے اس کے قریب آتے ہوئے اس کے چہرے کو اپنی جانب کر لیا۔

''مجھ سے بات کرنے کو جی نہیں چاہتا، منہ دوسری طرف کیوں پھیر لیا؟'' وسیم نے شکایت کی۔

''بھلا میں کیوں منہ پھیرنے لگی دراصل اس لیمپ کی روشنی بہت تیز ہے میری آنکھوں کو تکلیف دے رہی ہے اس لئے چہرہ دوسری طرف کر لیا تھا''۔ سیما نے وضاحت کی۔

''یہ دو دن میں نے تمہارے بغیر کتنے کرب میں گزارے تم اس کا اندازہ کر ہی نہیں سکتیں۔ اب میں اس وقت کو یاد کرتا ہوں تو دہل جاتا ہوں'' وسیم نے جھرجھری لیتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

''مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تم پر کیا گزری ہوگی مگر میں خود کتنی مصیبتوں سے دوچار تھی، آپ اس کا بھی خیال کریں، یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں پھر سے ملا دیا''۔ سیما نے آخری جملے میں زور دیتے ہوئے کہا وہ وسیم کے قریب ہو گئی۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی وسیم نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ خالہ جان کی آواز آئی شاید کسی کا فون تھا۔ وسیم نے سیما سے کہا کہ اس کی کسی دوست کا فون ہے۔ وہ تیزی سے کامن روم کی طرف آئی وہاں فون موجود تھا۔ جیسے ہی اس نے ہیلو کہا تو دوسری طرف کیلاش تھا۔ کیلاش کی آواز سن کر سیما کے قدموں تلے زمین ہی سرک گئی۔

''ہیلو! سیما آپ خیریت سے پہنچ گئیں، میں پریشان ہو رہا تھا۔ میں نے فون کرن کے ذریعے کروایا تھا تاکہ آپ کو کوئی پریشانی نہ ہو''۔ کیلاش نے اپنائیت کا اظہار کیا۔

''آپ میری زیادہ فکر مت کیا کریں، خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دیں نہ میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں اور نہ ہی آپ کی آواز سننا چاہتی ہوں، آج کے بعد آپ مجھے فون بالکل مت کرنا۔ گڈ بائی''۔ سیما نے غصے سے فون کو پٹخ

دیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔

''کس کا فون تھا؟'' وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

''کاروار سے میری دوست آشا نے کیا تھا وہ میری خیریت جاننا چاہتی تھی''۔ سیما نے غصے پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا۔

''ہماری شادی میں تو آشا شریک نہیں تھی''۔ وسیم نے تعجب سے کہا۔

''وہ اپنے بچوں کے پاس دہلی گئی ہوئی تھی اس لئے ہماری شادی میں شریک نہ ہو سکی''۔ سیما نے پوزیشن واضح کرتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''تم بہت تھکی ہوئی ہو چلو آرام کرو میں لیمپ بجھا دیتا ہوں'' وسیم نے لیمپ کا بٹن آف کر دیا اور خود دوسری طرف منہ پھیر کر سو گیا۔ سیما حیرت سے دیکھتی رہی۔ اسے امید بھی نہیں تھی کہ وسیم اتنی بے رخی کا ثبوت دے گا۔ اس کا رویہ سیما کی سمجھ سے بالاتر تھا بالآخر وہ بھی خاموشی سے سو گئی۔ تھکن کی وجہ سے اس کی آنکھ صبح دس بجے کھلی، گھڑی پر نظر پڑتے ہی وہ بستر سے جلد اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے بستر پر وسیم نہیں تھا۔ وہ پہلے واش روم گئی منہ ہاتھ دھونے کے بعد کچن میں آئی تو خالہ دوپہر کا کھانا پکانے میں مصروف تھیں۔ سیما نے انہیں سلام کیا پھر وسیم کے متعلق پوچھا جواب میں انہوں نے بتایا کہ وہ دوکان چلا گیا ہے۔ سیما کو بڑی حیرت ہوئی ایک انجانا خوف اس کے دل میں گھر کرنے لگا۔

''تم ناشتہ کر لو''۔ خالہ نے پیار سے کہا۔

''دل نہیں چاہتا''۔ سیما نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے، تھانے سے فون آیا تھا، انہوں نے وسیم کو ضروری کاروائی کے لئے بلوایا تھا۔ اس نے ناشتہ نہیں کیا مجھ سے کہہ کر گیا تھا کہ تھانے سے فارغ ہو کر دوکان پر چلا جائے گا''۔ اب وہ دوپہر کو آئے گا۔ خالہ نے اسے تسلی دی مگر سیما مطمئن نہیں ہوئی کیونکہ رات بھی وسیم اسے نظر انداز کر کے سو گیا تھا۔ یہ بات اس نے خالہ کو نہیں بتائی، بادلِ ناخواستہ اس نے ناشتہ کیا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ الماری سے ایک نیا جوڑا نکالا اور اس پر استری کرنے لگی دفعتاً دروازہ پر دستک ہوئی اس کا دل دھڑکنے لگا۔

''کون ہے بھئی؟ اندر آجاؤ'' اس نے دروازے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔
آنے والی اس کی نند ناصرہ یعنی وسیم کی بہن تھی۔ اس کو دیکھتے ہی سیما نے اس کو اپنے گلے لگایا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آگئے، دونوں خواتین آبدیدہ تھیں۔ تھوڑی دیر بعد خالہ جان بھی کمرے میں آگئیں۔ تینوں مختلف قسم کی باتیں کرتی رہیں پھر ناصرہ اپنی والدہ کے ساتھ ان کے کمرے میں چلی گئی۔ سیما تیار ہونے لگی اسے یقین تھا کہ وسیم دوپہر کھانے پر تو ضرور آئے گا۔ دوپہر کے تین بج گئے مگر وسیم کھانے پر نہیں آیا۔ اب تو سیما تشویش میں مبتلا ہوگئی وہ خالہ کے پاس آئی انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا البتہ ناصرہ کھانا کھا کر جا چکی تھی خالہ نے دکان پر فون کیا تو پتا چلا کہ وسیم کسی دوست کے ساتھ ایک بجے سے گیا ہوا ہے۔ خالہ نے زبردستی سیما کو اپنے ساتھ کھانا کھلایا اور اپنے ہی ساتھ لٹا دیا، خالہ سوگئیں مگر سیما کو اندیشوں اور وسوسوں نے سونے نہیں دیا۔ تقریباً پانچ بجے کے قریب اس نے وسیم کو فون کیا وہ موجود تھا، فون اسی نے رسیو کیا تھا۔
''خیریت تو ہے صبح بھی آپ جلدی چلے گئے اور دوپہر کھانے پر بھی نہیں آئے میں انتظار کرتی رہی۔ آپ نے فون بھی نہیں کیا۔ مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے کیا صاف صاف بات کریں۔ میں ذہنی کرب میں مبتلا ہوں''۔ سیما روہانسی ہوگئی۔
''تم بلاوجہ پریشان مت ہو، کل تم تھکی ہوئی تھیں اس لئے میں نے تمہیں ڈسٹرب نہیں کیا اور جہاں تک دوپہر کے آنے کا تعلق ہے میرا ایک دوست بمبئی سے آیا تھا میں اسے کھانا کھلانے پونجا انٹرنیشنل لے گیا تھا، بس اتنی سی بات تھی۔ چلو غصہ تھوک دو شام کو میں جلدی آجاؤں گا ناراض مت ہونا''۔ وسیم نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ سیما خوش ہوگئی اپنا موڈ درست کیا۔ اپنے کمرے میں لیٹ کر ٹیپ سننے لگی۔ شام کو وسیم حسب وعدہ جلدی آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں پھلوں کے علاوہ ایک خوبصورت پھولوں کا گجرا بھی تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے گجرا سیما کو پکڑوا دیا اور خود اپنی والدہ کے کمرے میں چلا گیا۔ سیما نے وہ گجرا بڑی نفاست سے اپنے بالوں میں لگایا اور آئینے میں اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ اس نے آتشی گلابی رنگ کی ساڑی پہن رکھی تھی اس پر بلاؤز کامدار تھا، اسی کی مناسبت سے زیور بھی پہن رکھے تھے۔ اس وقت وہ اتنی حسین لگ رہی تھی کہ خود کو دیکھ کر وہ بھی مغرور سی ہو رہی تھی، تھوڑی دیر بعد وسیم کمرے میں داخل ہوا سیما کو دیکھ کر ساکت سا ہوگیا۔

''ذرا میری چٹکی تو لینا میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا''۔ وسیم نے والہانہ کہا۔ سیما نے زور کی چٹکی لی اور وسیم کی چیخ نکل گئی۔

''چلو آج کہیں باہر چل کر کھانا کھاتے ہیں''۔ وسیم نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''کہاں چلیں؟'' سیما نے شرما کر پوچھا۔

''پونجا انٹرنیشنل چلتے ہیں''۔ وسیم نے جواب میں کہا۔

پونجا کا نام سن کر سیما کا تمام سرور اتر گیا، اسے جھرجھری سی آ گئی۔ اس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ یہ بات وسیم نے بھی نوٹ کی مگر صورت حال وہ جان نہیں سکا۔

''خیریت تو ہے کیا بات ہو گئی؟ کہیں میری نظر تو نہیں لگی نازک حسینہ کو''۔ وسیم نے اسے چھیڑا۔ سیما مزید گھبرا گئی اتنے میں وسیم کی والدہ کمرے میں داخل ہوئیں سیما کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رہ گئی۔

''تم لوگ کہیں باہر جا رہے ہو؟'' انہوں نے سوال کیا۔

''ہم باہر کھانا کھانے جا رہے ہیں''۔ وسیم نے جواب دیا۔

''ہرگز نہیں! آج دیوالی کی رات ہے اتنا بن ٹھن کر سیما کا نکلنا مناسب نہیں۔ آج گھر پر ہی کھانا کھا لو کل چلے جانا''۔ خالہ جان نے حکم صادر کر دیا۔ وسیم منہ لٹکا کر بیٹھ گیا مگر سیما کی مراد بر آئی کیونکہ وہ پونجا انٹرنیشنل نہیں جانا چاہتی تھی۔

وسیم اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ سیما کچن میں گھس گئی۔ خالہ جان نے اسے کچن سے واپس کمرے میں بھیج دیا تا کہ وسیم کا موڈ درست ہو اور وہ خود کھانا پکانے میں مصروف ہو گئیں۔ سیما نے کمرے میں آ کر وسیم کا منہ چڑایا جواب میں وسیم نے بھی یہی حرکت کی۔ سیما نے قریب آ کر اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ وسیم نے آنکھیں بند کر لیں شاید سارے دن کی تھکن سے اس پر غنودگی چھانے لگی تھی اور وہ سو گیا۔ سیما آہستہ سے اٹھ کر الماری کی طرف بڑھی اس میں سے کاٹن کا ایک سوٹ نکالا جو ہینگر پر لٹکا ہوا تھا۔ وسیم پینٹ شرٹ سمیت الٹا لیٹا ہوا تھا کپڑے نہیں بدلے تھے۔ سیما نے اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر نہیں کر پائی۔ اچانک پینٹ کی جیب میں سے اس کا پرس نکل کر نیچے گرا۔ سیما جھک کر اٹھانے لگی تو اس میں سے ایک لفافہ نکل کر اس کے قدموں

میں آگرا۔ اس نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ایک لڑکی کی تصویر نکلی جو بہت خوبصورت تھی ساتھ ہی ایک خط تھا جو وسیم کے نام لکھا گیا تھا، بلاشبہ وہ ایک لو لیٹر تھا۔ دھڑکتے دل سے سیما نے وہ خط پڑھا۔ یہ تازہ خط تین یا چار دن پہلے لکھا گیا تھا جس میں مینگلور اپنی آمد کی اطلاع دی گئی تھی۔ اب پوری کہانی سیما کی سمجھ میں آ گئی۔ وسیم کے صبح جلدی جانے اور دوپہر کو نہ آنے کی تمام کہانی کڑی سے کڑی ملانے سے واضح ہو چکی تھی۔ جیب میں سے برآمد ہونے والی تصویر وسیم کی پرانی دوست غزالہ کی تھی جس نے پیسے کے لالچ میں ایک امیر آدمی سے شادی کر لی تھی مگر اولاد کی دولت سے محروم تھی۔ اس نے اپنے خط میں اپنے سابقہ رویے پر معافی مانگی تھی اور وسیم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی جو کہ وسیم نے پوری کر دی تھی۔ یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ وہ پونجا انٹرنیشنل میں ہی قیام پذیر تھی۔ سیما کافی دیر تک غزالہ کی تصویر اور خط کو دیکھتی رہی، بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے اسے اپنی بے بسی پر رونا آیا۔ اس کی ساری خوشی کافور ہو گئی، اسے یوں لگا جیسے وہ ٹھنڈی چھاؤں سے تپتی دھوپ میں آ گئی ہو۔ اسے یوں لگا جیسے وسیم نہ پہلے اس کا تھا اور نہ ہی اب اس کا ہے، وہ پرایا تھا اور پرایا ہے۔ سیما بہت دیر تک روتی رہی پھر باتھ روم میں جا کر اپنا حلیہ درست کیا۔ کچن میں آ کر کھانا چیک کیا جو خالہ جان نے تیار کر لیا تھا۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ سیما نے اپنے حصے کا کھانا نکال کر خاموشی سے کھایا اور بستر پر آ کر لیٹ گئی۔ اچانک اسے کسی نے جھنجھوڑا۔ وہ گہری نیند سے بیدار ہوئی تو رات کے دس بجے تھے، وسیم اسے کھانا کھانے کے لئے جگا رہا تھا۔

''میں کھانا کھا چکی ہوں''۔ سیما نے تنگ آ کر کہا۔

''تم نے میرا انتظار بھی نہیں کیا''۔ وسیم نے بناوٹی ناراضگی سے پوچھا۔

''وقت کبھی کسی کا انتظار نہیں کرتا ویسے مجھے شدت سے بھوک لگ رہی تھی اس لئے میں نے کھا لیا''۔ سیما نے وضاحت کرتے ہوئے بات مکمل کی۔

وسیم سیما کے اس رویے سے بڑا حیران ہوا۔ وہ مختلف پہلو پر غور کرتا ہوا ڈرائنگ روم میں آیا پھر والدہ کے ساتھ کھانے میں شریک ہوا۔

''سیما کہاں ہے؟ وہ کھانا نہیں کھائے گی؟'' والدہ نے وسیم کو گھورا۔

''وہ کھا چکی ہے''۔ وسیم نے مختصر سا جواب دیا۔

''آپ نے ہوٹل جانے کی اجازت نہیں دی شاید ناراض ہوگئی ہو''۔ وسیم نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''وہ ایسی لڑکی نہیں ہے ممکن ہے اسے بھوک نہ لگی ہو یا تھکن ہو رہی ہو''۔ خالہ نے اس کی بات سے اتفاق نہیں کیا۔ وسیم کھانے سے فارغ ہو کر کمرے میں آیا۔ سیما گہری نیند سو چکی تھی۔ اس نے لائٹ آف کی اور خود بھی سو گیا۔

صبح جب وسیم کی آنکھ کھلی تو سیما بیڈ پر نہیں تھی وال کلاک پر نظر پڑی تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ وہ جلدی سے اٹھ گیا اور نہا دھو کر تیار ہو کر کچن کی طرف آیا تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وسیم کمرے میں داخل ہوا تو سیما کی والدہ اور بھائی طلال کے علاوہ اس کے ابو بھی تھے۔ اس نے بڑے ادب سے سیما کے والد کو سلام کیا پھر ان سے گپ شپ کرنے لگا۔ سیما اس کے لئے ناشتہ تیار کرنے کی خاطر کچن کی طرف چل دی جیسے ہی سیما باہر نکلی اس کے والد نے وسیم اور اس کی والدہ سے سیما کو کار وار لے جانے کے لئے اجازت طلب کی۔ خالہ نے تو اجازت دے دی البتہ وسیم خاموش ہو گیا۔ تھوڑی حیل وحجت کے بعد اس نے بھی اجازت دے دی۔ سیما اپنا سامان پیک کرنے لگی۔

''کتنے دنوں کے لئے جا رہی ہو؟'' وسیم نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''پتا نہیں کب تک رہوں''۔ جواب بہت ہی مختصر تھا۔

''کیا مطلب''۔ وسیم نے حیرت سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ شادی کے بعد پہلی مرتبہ جا رہی ہوں وہاں کچھ دن تو رہوں گی نا''۔ سیما نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں میری یاد نہیں آئے گی؟'' وسیم نے پیار سے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

''جب مصروفیات بڑھ جائے تو یادیں پس پشت چلی جاتی ہیں''۔ اس نے روکھے انداز میں کہا۔

''میری مصروفیات اس نوعیت کی نہیں ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟'' اس نے پیار سے وضاحت کی۔

سیما نے زہریلی مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا اور سامان پیک کرنے میں مصروف ہوگئی۔ سامان پیک کرنے کے بعد وہ وسیم کی طرف دیکھنے لگی۔ وسیم روپے گننے میں مصروف تھا۔ پھر اس نے گن کے پانچ ہزار روپے سیما کو دیئے جو اس نے خاموشی سے رکھ لئے اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ والدہ کو اطلاع کی کہ اس کی تیاری مکمل ہوگئی ہے۔ وسیم سیما کی بے رخی پر تلملا رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سیما راتوں رات کیسے بدل گئی بظاہر وہ نظرانداز کئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ سیما کے والدین وسیم کو دیکھ کر اجازت طلب کرنے لگے۔ وہ خوش دلی سے انہیں دروازے تک چھوڑنے آیا۔ خالہ بھی آئیں۔ سیما سب سے پیچھے کھڑی تھی وہ بھی جانے لگی تو وسیم نے اسے تھوڑی سی دیر رکنے کے لئے کہا۔ سیما کے والدین زینے اترنے لگے۔ خالہ بالکونی میں جا کھڑی ہوئیں۔ وسیم نے سیما کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے کمرے کی طرف دھکیلا اور اندر سے کمرہ بند کر دیا۔

''سیما! تم مجھ سے کچھ خفا خفا سی لگ رہی ہو کیا بات ہے؟ میری کوئی بات بری لگی ہے تو میں معافی چاہوں گا''۔ وسیم نے بے چارگی سے کہا۔

''بات ایسی ہی ہے! آپ کو پتا ہے مجھے غلط بیانی کرنے والے پسند نہیں ہیں۔ آپ نے اپنی پسند سے مجھ سے شادی کی اور غزالہ کے ایک خط لکھنے پر اس سے ملنے چلے گئے۔ اب اس سے آپ کا کیا تعلق؟ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو بات دوسری تھی''۔ سیما نے سنجیدگی سے وضاحت کی۔ وسیم کے چہرے کا رنگ فق ہوگیا۔

''تم نے میری جیب کی تلاشی لی تھی، خواتین کی یہ عادت بہت بری ہوتی ہے''۔ اس نے ناراضگی کا اظہار کیا۔

''غزالہ سے میرا کوئی خاص لگاؤ نہیں رہا۔ اس نے بہت اصرار کیا تھا اس لئے تھوڑی سی دیر کے لئے چلا گیا تھا دراصل اس نے اپنا دکھڑا سنانے کے لئے بلایا تھا، میں سن کے آ گیا، اب دوبارہ تو نہیں جاؤں گا۔ تمہیں شک کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھ پر یقین رکھو''۔ وسیم نے آخری جملے پر زور دے کر کہا۔

سیما نے غیر یقینی انداز میں سر کو ہلایا اور جانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھی۔ وسیم نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''سیما جان! ناراض ہو کر سفر پر مت جانا۔ وعدہ کرو مجھ سے بدگمان نہیں ہوگی''۔ اس نے پیار بھرے انداز میں

کہا۔

''اچھا بھئی ناراض نہیں ہوں۔اب جانے بھی دو۔ابو نیچے انتظار کررہے ہیں''۔سیما نے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔وسیم نے مسکرا کر ہاتھ چھوڑ دیا۔سیما تیزی سے زینے طے کرنے لگی اور باہر سڑک پر آ گئی جہاں اس کے والدین محو انتظار تھے،وسیم بھی اتر آیا۔سیما نے بالکونی میں کھڑی خالہ کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور والدین سمیت ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔وسیم نے خدا حافظ کہا پھر ٹیکسی اسٹارٹ ہو گئی۔

انہیں بس ٹرمینل تک جانا تھا صبح کے تقریباً ساڑھے دس بجے تھے۔پندرہ منٹ بعد ٹیکسی مطلوبہ مقام تک پہنچ گئی،سیما کے والد نے کاروار جانے والی بس کے چار ٹکٹ لئے اور اس میں سوار ہو گئے۔بس گیارہ بجے روانہ ہوئی حالانکہ صبح کے وقت دھوپ میں تیزی تھی مگر اس وقت ہلکے ہلکے بادل چھانے لگے تھے،موسم بھی معتدل تھا۔سیما نے گرین کلر کی ساڑی پہنی تھی۔کانوں میں چھوٹے چھوٹے سے جھمکے تھے اس کے علاوہ گلے میں منگل سوتر اور ہاتھوں میں ایک ایک سونے کا کڑا تھا۔بہت سوبر مگر دلکش لگ رہی تھی۔وہ بس میں کھڑکی کے ساتھ ہی بیٹھی تھی بظاہر اس کی نظریں بس سے باہر کا طواف کر رہی تھیں مگر درحقیقت وہ صرف اور صرف وسیم کے متعلق سوچ رہی تھی۔اسے وسیم کی باتوں کا اعتبار نہیں تھا۔اس کا ذہن غزالہ اور اس کے تعلق میں الجھا ہوا تھا۔حسد اور محرومی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جا رہا تھا۔وہ خود کو بہت حقیر محسوس کرنے لگی تھی۔اس کے پاس سب کچھ تو تھا مگر ایک مخلص چاہنے والے کی کمی تھی۔وقار اس کو بہت چاہتا تھا مگر وہ ذہنی طور پر اس سے قریب نہ ہو سکی تھی،وسیم ذہنی طور پر اس کے قریب تھا مگر غزالہ اس کا ماضی تھی جسے وہ فراموش نہیں کر سکا تھا۔یہ کیسی آنکھ مچولی ہے وہ اسی پہلو پر غور کر رہی تھی۔پتا نہیں بس کتنی دور نکل چکی تھی وہ خیالات کے ادھیڑ بن میں مصروف تھی۔آہستہ آہستہ اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔والدہ کے جھنجھوڑنے پر اس کی آنکھ کھلی۔بس گنگولی کھانے کے لئے رکی تھی۔تمام مسافر بس سے باہر نکلے اور اسٹاپ پر بنے ہوٹل میں داخل ہو گئے۔سیما بھی اپنے والدین اور بھائی کے ساتھ ایک میز کا انتخاب کر کے بیٹھ گئی پھر کھانے کا آرڈر دیا۔

بس آدھے گھنٹے کے لئے رکی تھی۔کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام مسافر واپس بس میں بیٹھ گئے پھر سفر شروع ہوا تقریباً چھ گھنٹے بعد یعنی رات آٹھ بجے وہ لوگ کاروار پہنچے۔

سیما کافی عرصے بعد اپنے گھر آئی تھی لہٰذا یہاں آکر اسے راحت محسوس ہونے لگی۔ وہ بھاگ کر پڑوس میں اپنی دوست آشا سے ملی، دونوں کافی دیر تک گپ شپ کرتی رہیں، پھر وہ واپس آگئی۔ رات کا کھانا کافی دیر بعد تیار ہوا تھا، کھانا کھاتے ہی وہ گہری نیند سو گئی۔

صبح نو بجے مینگلور سے وسیم کا فون آیا سیما نے اٹینڈ کیا۔ رسمی گفتگو کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا۔ ناشتہ کے بعد دونوں ماں بیٹی نے ملازمہ کے ساتھ مل کر گھر کی صفائی کی پھر کھانا پکایا۔ کھانے سے فراغت کے بعد سیما طلال کے ساتھ بازار گئی وہاں اس نے کچھ کاٹن کے سوٹ اور بیڈ شیٹس خریدیں، واپسی پر طلال نے آئس کریم کی فرمائش کی تو وہ ایک ریسٹورینٹ میں داخل ہوئی جہاں وہ اکثر اپنی دوست آشا کے ساتھ جاتی رہتی تھی۔ طلال کے لئے تو اس نے آئس کریم کا آرڈر دیا اور اپنے لئے چائے منگوائی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے ریسٹورینٹ کا جائزہ لیا تب اچانک اس کا دل دھک سے رہ گیا کیونکہ اس کے سامنے کی میزوں کی دو قطاریں چھوڑ کر آگے کی طرف کیلاش اپنے کسی دوست کے ساتھ بیٹھا باتوں میں مشغول تھا، بظاہر وہ سیما کو نظر انداز کئے ہوئے تھا مگر اس نے سیما کو دیکھ لیا تھا۔ سیما نے جلدی جلدی چائے ختم کی، ویٹر کو پیسے ادا کیے اور تیزی سے باہر نکلی۔ سامنے سے ایک آٹو رکشہ آتا دکھائی دیا اسے فوراً روکا اور طلال سمیت اس میں سوار ہوگئی۔ گھر کے سامنے رکشہ روکا، کرایہ ادا کیا پھر تیزی سے اندر داخل ہوئی۔ اس کی حالت قابل دید تھی۔ ماں نے یہ حالت دیکھی تو وہ گھبرا گئی۔ انہوں نے وجہ پوچھی تو سیما نے گول مول جواب دیا۔ رات بھی وہ جلدی کھانا کھا کر سو گئی تھی۔ صبح چار بجے کسی ڈراؤنے خواب سے اس کی آنکھ کھل گئی، مارے ڈر کے وہ دوبارہ نہ سو سکی، مختلف قسم کے خیالات، وسوسے اور اندیشے اسے پریشان کرتے رہے۔ وہ اس وقت کو کوستی رہی جب وہ پہلی بار کیلاش سے ملی تھی۔ اس واقعے کے چار دن تک وہ بالکل باہر نہیں نکلی۔ روزانہ وسیم کے فون آتے رہے وہ سیما کو بہت مس کر رہا تھا۔ یہاں کاروار آنے کے بعد سیما کو بھی وسیم کی یاد ستاتی رہی وہ اس کے بغیر خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی حالانکہ میکے آنے کے بعد بیٹیاں خوش و خرم ہوتی ہیں مگر وہ الجھی الجھی، پریشان سوچوں میں غرق رہنے لگی تھی۔

”سیما! کیا بات ہے تم یہاں آنے کے بعد خوش نہیں ہو اور مجھے پہلے سے زیادہ کمزور اور پریشان لگتی ہو۔ خیریت تو ہے نا“ ماں نے تشویش کا اظہار کیا۔

''اوہ ہو، کچھ بھی نہیں امی! آپ بلاوجہ پریشان ہو رہی ہیں دراصل وسیم کے بناء کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا ہے۔''
اس نے بات بنائی۔

''اگر ایسی بات ہے تو وسیم کو یہیں بلا لو، کچھ عرصے دونوں یہاں ساتھ رہو پھر اس کے ساتھ مینگلو واپس چلی جانا''۔ ماں نے مسئلے کا حل پیش کیا۔

''نہیں! اس کی ضرورت نہیں، میں خود ایک ہفتے بعد وسیم کو فون کر دوں گی وہ آ کر مجھے لے جائیں گے''۔ سیما نے گھبرا کر جواب دیا۔ بات آئی گئی ہوگئی ایک ہفتہ سکون سے گزر گیا۔ سیما نے سنجیدگی سے مینگلور جانے کی تیاری شروع کر دی کچھ ضروری سامان اور کپڑے اس نے اپنی امی سے منگوا لئے تھے ہاں البتہ کچھ بلاؤز درزی کے پاس سلنے کیلئے دیئے تھے، اسے واپس لانا رہ گیا تھا۔ ایک بار اس نے امی کو درزی کے پاس بھیجا مگر بلاؤز تیار نہیں تھے پھر طلال کو بھیجا وہ بھی واپس آ گیا کیونکہ دکان بند تھی، قصداً وہ خود باہر نکلتے ہوئے گریز کر رہی تھی کہ کہیں کیلاش سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔

اگلے دن طلال اسکول گیا ہوا تھا امی کی طبیعت کچھ خراب تھی باعث مجبوری صبح گیارہ بجے کے قریب اسے نکلنا پڑا، وہ ڈرتے ڈرتے باہر نکلی، سامنے روڈ پر اکا دکا ٹریفک چل رہا تھا وہ پیدل ہی چل پڑی کیونکہ درزی کی دکان زیادہ دور نہیں تھی۔

''سیما! مجھ سے زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں'' کسی نے گویا سرگوشی کی، وہ تیزی سے پلٹی اس کی آنکھیں پھیل کر رہ گئیں کیونکہ وہ کیلاش تھا۔

''آخر! آپ کیا چاہتے ہیں؟ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے، اب تو میری برداشت کی انتہا ہوگئی۔ آپ پڑھے لکھے معقول آدمی ہیں پھر ایسی بیہودہ حرکت کیوں کر رہے ہیں۔ پلیز! میری زندگی کو جہنم نہ بنائیں میرے پیچھے بھاگنے سے آپ کو کچھ بھی حاصل نہ ہوگا، خود بھی سکون سے رہیں اور مجھے بھی رہنے دیں'' وہ یکدم چیخ پڑی۔

ایک لمحہ کیلئے کیلاش سکتے میں آ گیا، اسے امید نہیں تھی کہ سیما اتنا سخت رویہ اختیار کرے گی، وہ مزید کچھ کہے بغیر وہاں سے خاموشی سے چلا گیا۔ سیما اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ گھر واپس پہنچ کر اس نے وسیم کو فون کیا کہ وہ اسے آ کر لے جائے۔ اگلی صبح وسیم گیارہ بجے کاروار پہنچ چکا تھا اسے دیکھ کر سیما کو اطمینان سا ہو گیا۔

اس کا مرجھایا ہوا چہرہ شاداب ہو گیا وہ جلدی جلدی تیار ہو گئی حالانکہ اس کی امی نے وسیم کو ایک دن روکنا چاہا مگر وہ نہ مانی، وہ جلد سے جلد کاروار چھوڑنا چاہتی تھی۔ دوپہر کھانے کے بعد دونوں میاں بیوی مینگلور سٹی کے لئے روانہ ہوئے۔ رات دو بجے وہ اپنے گھر پہنچے۔ مینگلور پہنچ کر سیما کو ایسا لگا جیسے وہ کسی محفوظ مقام پر آ گئی ہو۔

دو مہینے آرام سے گزر گئے۔ اس دوران سیما کے دل سے کیلاش کا ڈر اور خوف نکل چکا تھا۔ اس کے شب و روز سکون سے گزرنے لگے۔ ایک دن خالہ کی طبیعت بہت خراب ہو گئی انہیں دل کی تکلیف کا احساس ہوا تو وسیم اور سیما انہیں سٹی ہسپتال لے گئے۔

ڈاکٹر نے چیک کرنے کے بعد انہیں داخل کر لیا۔ وسیم نے اپنی والدہ کو پرائیویٹ وارڈ میں داخل کرا دیا۔ سیما تیمارداری کے لئے ان کے ساتھ تھی۔ وسیم کی امی کو ہسپتال میں داخل ہوئے تین دن گزر گئے اس دوران ان کی طبیعت بہتر ہونے لگی۔ سیما نے وسیم کو خالہ کے پاس چھوڑا اور خود گھر کو صاف ستھرا کرنے اور نہا دھو کر کپڑے بدلنے کی غرض سے اپنے گھر روانہ ہو گئی۔ پانچ گھنٹے گھر میں رہ کر اس نے پورا گھر صاف کیا، دو تین قسم کے کھانے پکا کر فریز کر دئے تا کہ وسیم کو کھانے میں پریشانی نہ ہو پھر نہا دھو کر کپڑے بدلے اور ہسپتال کے لئے روانہ ہوئی۔ اس کے گھر سے ہسپتال زیادہ دور نہیں تھا، اس نے رکشہ لیا اور ہسپتال کے گیٹ کے قریب اتر گئی۔

''سیما! کہاں جا رہی ہو؟'' یہ مانوس آواز کیلاش کی تھی۔

''کہیں بھی جا رہی ہوں، آپ کو اس سے کیا مطلب؟ آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کرنے دیں''، اس نے تنک کر کہا اور آگے بڑھ گئی۔ کیلاش اسے حسرت بھری نگاہوں سے دور تک جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں، وہ نیم مردہ باہر نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا اور سر اسٹیئرنگ پر ٹکا دیا۔

''اے بھگوان! وہ مجھ سے بہت نفرت کرتی ہے، میری صورت بھی دیکھنے کی روادار نہیں اور یہ سب کچھ میری اپنی غلطی سے ہوا اگر میں نے اسے اغواء نہ کیا ہوتا اور نہ ہی اسے اتنا پریشان کرتا تو وہ میری اچھی دوست تو ہو ہی سکتی تھی۔ اب وہ میرے لئے بالکل بیگانی ہو گئی ہے مگر میں کیوں اس کیلئے اتنا پاگل ہوں، وہ شادی شدہ ہے اور اس کی ذات برادری بھی الگ ہے، ہم دونوں کا کوئی سنگم ہے ہی نہیں پھر اس نے مجھ سے کبھی محبت کا اظہار بھی نہیں کیا، میں کیوں بلاوجہ اس کی پرسنل لائف میں دخل دیتا ہوں۔ اے بھگوان! تو میری رکشا کر اور مجھے شانت

کر دے تاکہ میں اسے بھول جاؤں، مجھے اتنی شکتی دے کہ میں کبھی بھی اسے یاد نا کروں'' وہ اپنے آپ بڑبڑانے لگا۔ وقت کا پہیہ گھومتا رہا۔

پانچ سال بعد سیما بمبئی سے مینگلور انڈین ائیر سے آرہی تھی، اس کے ساتھ اس کا چار سالہ بیٹا سمیر بھی تھا وہ سیٹ نمبر تیرہ اور چودہ پر اپنے بیٹے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول تھی اچانک اس کے بیٹے سمیر نے اگلی سیٹ پر بیٹھے شخص کے سر سے ٹوپی اتار پھینکی اور ہنسنے لگا۔ سیما نے اسے ڈانٹا اور اس شخص سے معذرت کرنے لگی وہ شخص ایک خاتون کے ساتھ بیٹھا تھا، وہ دونوں ایک ساتھ مڑے، سیما کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا وہ کوئی اور نہیں کیلاش تھا۔

''کوئی بات نہیں بچہ ہے۔ ڈونٹ وری! شرارت بچے نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں! انہوں نے بالکل صحیح کہا، بچے ایسے ہی ہوتے ہیں، ہماری بیٹی شیوانی بھی بہت شرارتی ہے''۔ خاتون نے ممتا بھرے لہجے میں کہا۔ سیما کو ان کی بیٹی کہیں بھی نظر نہیں آئی شاید نانی یا دادی کے پاس ہوگی، اس نے دل میں سوچا۔

کیلاش نے سیما کو دیکھ کر بھی نظر انداز کر دیا تھا بالکل اجنبی کی طرح جیسے وہ دونوں کبھی ملے ہی نہیں تھے، اس کے اس رویے پر سیما کو بہت حیرت ہو رہی تھی، وہ کافی بدل گیا تھا، اس کا وزن پہلے کے مقابلے میں بڑھ گیا تھا۔ اس کے خوبصورت بالوں کا اسٹائل بھی بدلا ہوا تھا۔ گزرے پانچ سالوں کے دوران اس کا حلیہ اس حد تک بدل جائے گا۔ سیما نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

دو گھنٹے بعد وہ مینگلور ائیر پورٹ پر تھے، سیما اپنے بیٹے کی انگلی پکڑ کر ٹرمینل سے باہر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کیلاش اس خاتون سمیت باہر نکل رہا تھا، اس تمام عرصے میں اس نے ایک لمحے کے لئے بھی سیما کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

ائیر پورٹ پر وسیم انہیں ریسو کرنے کے لئے موجود تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ گھر کی جانب روانہ ہوئی، دوسری طرف کیلاش دور سے سیما کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ خاتون اس کی بہن تھی جسے وہ اپنے ساتھ بمبئی سے

مینگلور اپنی ماں سے ملانے لایا تھا۔

کیلاش ماضی میں کھو گیا کیونکہ وہ آج بھی سیما کو نہیں بھول سکا تھا، اس نے صرف یہ سوچ کر صبر کرلیا تھا کہ اس جنم میں تو ان کا ملاپ ممکن نہیں تھا شاید اگلے جنم میں وہ ایک ساتھ ہو جائیں۔

''کیلاش! کہاں کھو گئے؟'' اس کی دیدی نے پوچھا۔

''کہیں بھی نہیں دیدی! بس یوں ہی'' اس نے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا گھر کی طرف جاتے ہوئے وہ پونچا انٹرنیشنل کے پاس سے گزرے تو کیلاش کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی، مسلسل اس کے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہوتا رہا، شدت جذبات سے اس کی آنکھیں سرخ ہوگئیں۔ یہ کیفیت کافی دیر تک طاری رہی بلآخر اس نے خود کو سمجھایا کہ وہ سیما کے لئے بالکل اجنبی ہے، ان کے راستے الگ ہیں، وہ ایک سایہ ہے اور سائے کے پیچھے بھاگنے سے کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ایک ہفتے بعد وہ بہن کو واپس بمبئی میں چھوڑ کر کینیڈا چلا گیا اور وہیں کی شہریت اختیار کرلی پھر وہ کبھی لوٹ کر انڈیا نہیں آیا۔

جولائی 1999ء

بیس سال بعد

وہ چند لمبے تڑنگے مرد تھے جنہوں نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے، انہوں نے چند نوجوانوں کو اٹھا اٹھا کر آگ میں پھینکنا شروع کر دیا۔ وہ چیخ رہے ہیں، مدد مدد پکار رہے ہیں مگر ان سفید کپڑے والوں کو رحم نہیں آ رہا ہے۔ نوجوان جل رہے ہیں، اذیت میں مبتلا ہیں، ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔ کافی دیر تک یہ سلسلہ چلتا ہے پھر منظر بدل جاتا ہے۔ ایک شخص وہیل چیئر پر بیٹھا چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ ''اے قائداعظم! کیا یہ پاکستان اس لیے بنایا تھا کہ ہمارے بچے آگ میں جلائے جائیں۔ کیوں بنایا تھا یہ پاکستان؟ جہاں ہم محفوظ نہیں''۔ پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے۔

خوف اور گھبراہٹ میں خورشید بانو کی آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ پسینے میں شرابور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں بچوں کی طرف دیکھتی ہے۔ انور اور سمیر اس کے ساتھ والے والے بستر پر گہری نیند سو رہے ہیں جبکہ ارم اس کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ خورشید کے شوہر حفیظ باہر تخت پر خراٹے لے رہے تھے۔

خورشید بانو نے لاحول پڑھی پھر اٹھ کر سرہانے رکھے گلاس سے پانی پیا اور دوبارہ بستر پر لیٹ گئی۔ رات کے تین بجے کا وقت تھا، اس خواب سے وہ بہت ڈر گئی تھی، وہ سوچنے لگی اسے ایسا ڈراؤنا خواب کیوں نظر آیا اکثر وہ خواب دیکھا کرتی اور اس کی تعبیر بالکل صحیح نکلتی۔ اسے سچے خواب دکھائی دیئے تھے یہ اپریل 1986ء کی بات تھی۔

خورشید بانو کی شادی حفیظ سے برسوں پہلے ہو چکی تھی۔ ان کی رہائش عزیز آباد میں تھی۔ حفیظ کی لالوکھیت میں چھوٹی سی فرنیچر کی دوکان تھی۔ ان کے تین بچے تھے۔ بڑا انور اس کی عمر سولہ سال سمیر کی عمر تیرہ سال جبکہ ارم دس سال کی تھی۔ انور فرسٹ ایئر میں سمیر نویں جماعت میں اور ارم پانچویں جماعت میں پڑھ رہی تھی۔ حفیظ کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بڑا بھائی اپنے خاندان کے ساتھ حیدر آباد میں رہتا تھا جبکہ اس کی چھوٹی بہن فوزیہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ نیو کراچی میں مقیم تھی۔ خورشید بانو کے والدین اور دیگر رشتہ دار میرپور خاص میں رہتے تھے۔ اس کے ایک چاچا برنس روڈ پر رہتے تھے۔ اپنے مختصر خاندان کے ساتھ خورشید

اور حفیظ پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔

''میں نے رات بڑا عجیب و غریب خواب دیکھا''۔ خورشید نے ناشتے کے دوران اپنے شوہر حفیظ کو خواب میں جو کچھ دیکھا تھا وہ دہرا دیا۔

''اللہ رحم کرے! تمہارے خوابوں سے تو ڈر ہی لگتا ہے۔'' حفیظ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

دن گزرتے رہے خورشید بانو اس خواب کو بھول بھال گئی۔ بچوں کی ذمہ داریوں میں کچھ یاد بھی نہیں رہتا۔

''امی! مجھے سو روپے دیں، مجھے جھنڈا لینا ہے۔'' انور نے کالج سے آتے ہی کہا۔

''کیسا جھنڈا! کیا کرو گے جھنڈا لے کر''۔ خورشید نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکونی میں لہراؤں گا پھر کل ایم کیو ایم کا جلوس حیدر آباد جا رہا ہے میں بھی جلوس کے ساتھ جاؤں گا''۔ انور نے تفصیل بتائی۔

''امی! مجھے بھی پیسے دیں، میں بھی جھنڈا لوں گا''۔ سمیر نے ضد کی۔

خورشید نے پیسے نکال کر انور کو دیئے، دونوں بھائی خوشی خوشی پیسے لے کر جھنڈا لینے کے لیے چلے گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں میں جھنڈا لہراتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، انور نے بڑا جھنڈا بالکونی میں لہرایا چھوٹا جھنڈا سمیر لہراتا ہوا باہر اپنے دوستوں میں چلا گیا۔ انور نے ایک بیج ارم کو دیا تا کہ وہ بھی خوش ہو۔

''دیکھو بیٹا! جھنڈا تو تم لے کر آئے ہو مگر میں تمہیں حیدر آباد جانے کی اجازت نہیں دوں گی۔ یہاں سے جو جلوس مختلف علاقوں میں گشت کرے گا تم اس میں شریک ہو جانا مگر آگے جانے کی اجازت نہیں''۔ امی نے فیصلہ سنا دیا۔

ان کا مکان دو منزلہ تھا۔ گراؤنڈ فلور پر کرائے دار رہتے تھے اوپر کی منزل پر وہ خود مقیم تھے۔ رات نو بجے کے وقت لڑکوں نے خوب شور شرابہ کیا۔ ان بچوں کے ساتھ بڑے بھی جھنڈے ہاتھوں میں لیے خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ مہاجر قومی موومنٹ نے جیئے مہاجر کا جو نعرہ دیا وہ لوگوں کے لیے کسی گلیمر سے کم نہ تھا۔ سب کے چہرے ایسے دمک رہے تھے جیسے پاکستان ابھی معرض وجود میں آیا ہو۔ بچے، بڑے، بوڑھے، نوجوان، خواتین سب ہی خوش تھے جیسے انہیں کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو اور خوشی کیوں نہ ہوتی صوبے میں ان کی شناخت بن

چکی تھی۔ دیگر صوبوں نے خاص طور پر صوبہ سندھ نے مہاجروں کو یکسر انداز کر دیا تھا۔ کوٹہ سسٹم کے تحت مہاجروں کا استحصال ہو رہا تھا۔ تعلیمی میدان میں انہیں پیچھے دھکیلنے کے لیے مختلف حربے استعمال کیے جاتے تھے۔ ٹرانسپورٹ پر مقامی کے بجائے غیر مقامی لوگوں کا قبضہ تھا۔ اردو بولنے والوں کا کوئی پرسان حال نہیں تھا ہر آنے والی حکومت نے اردو بولنے والوں سے فائدہ تو بہت اٹھایا مگر مطلب حاصل ہونے کے بعد ان کو دیوار سے لگا دیا۔ سندھ صوبے میں حکومتی سطح پر اردو بولنے والوں کو نظر انداز کر کے اپنی پارٹی کے ایسے لوگوں کو اہم عہدوں پر فائز کیا جو اس پوسٹ کے لائق ہی نہ تھے۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے اردو بولنے والوں میں احساس محرومی بڑھتی رہی جو بالا آخر ایم کیو ایم کی صورت میں ایک ایسی تنظیم بنی جس نے سندھ کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ اس کا سہرا الطاف حسین اور ان کے رفقاء کو جاتا ہے۔ الطاف حسین کی قائدانہ صلاحیتوں نے تمام مہاجرین کو ایک بینر تلے اکٹھا کر لیا تھا، امید کی کرن پیدا ہو چکی تھی۔

خورشید بانو فجر کی نماز کے لیے اٹھتی، نماز کے بعد تھوڑی دیر لیٹی رہتی اس کے بعد آٹھ بجے ناشتے کا اہتمام کرتی ہاں البتہ بچوں کو اسکول اور کالج جانا ہوتا تو ناشتہ صبح سات بجے تک تیار کر کے ان کو وقت پر بھجواتی۔ چھٹی والے دن وہ اور حفیظ صبح آٹھ بجے تک ناشتہ کرتے اور بچوں کو نو بجے جگاتے، انہیں زیادہ دیر تک سونے کی اجازت نہیں تھی۔

آج 31 اکتوبر اور چھٹی کا دن تھا۔ انور صبح ہی اٹھ بیٹھا کیونکہ آج ایم کیو ایم کا جلوس حیدر آباد جانے والا تھا۔ اس کے تمام دوست بھی صبح ہی اٹھ گئے تھے۔

''انور تم صبح ہی صبح کیسے اٹھ گئے؟'' حفیظ نے بیٹے سے پوچھا۔

''اسے جلوس میں جانا ہے۔'' خورشید بانو نے انور سے پہلے ہی جواب دیا۔

''کیا مطلب؟ تم حیدر آباد جا رہے ہو؟'' انہوں نے فکریہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں ابو! میں صرف سہراب گوٹھ تک دوستوں کے ساتھ جاؤں گا پھر واپس آؤں گا'' انور نے انہیں پریشان دیکھ کر مطمئن کر دیا۔

''ٹھیک ہے دیر مت لگانا، کھانے کے وقت تک آ جانا'' انہوں نے تاکید کی۔

ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد انور تیار ہوگیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے دوستوں نے نیچے سے آوازیں دینا شروع کردیں۔ اس نے بالکونی سے جھانک کر نیچے دیکھا تو ظفر، امجد اور معین کھڑے تھے۔ اس نے ہاتھ سے آنے کا اشارہ کیا پھر بالکونی سے جھنڈا اتار کر اپنے ساتھ لہراتا ہوا زینے سے اترنے لگا۔ اسی دوران سمیر بھی جاگ گیا وہ بالکونی میں بھائی کو دیکھنے کے لئے کھڑا ہوگیا۔ خورشید اور حفیظ بھی بالکونی سے جھانکنے لگے، نیچے نوجوانوں کا ہجوم تھا، کوئی کار میں، کوئی اسکوٹر پر، کوچز اور بسیں بھی بچوں، بڑوں اور لڑکوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ہر طرف جھنڈے لہرا رہے تھے۔ فضاء جئے مہاجر کی صداؤں سے گونج رہی تھیں۔ شور سے ارم بھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ سمیر نے جانے کی ضد کی مگر حفیظ نے اسے ڈانٹ کر خاموش کرا دیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد مختلف علاقوں سے جلوس کے گزرنے کا شور سنائی دیتا رہا۔

دس بجے کے قریب حفیظ اپنی ہنڈا موٹر سائیکل پر سمیر کو بٹھا کر واٹر پمپ مارکیٹ سے گوشت، سبزی ترکاری وغیرہ خرید کر لے آیا۔ خورشید بانو نے کھانا پکانے کی تیاری شروع کردی۔

''کیا پکانے کا ارادہ ہے۔'' حفیظ نے خورشید کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بچے بریانی کے لئے کہہ رہے تھے وہی پکا رہی ہوں۔'' اس نے گوشت کو دیگچی میں ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

''ہاں! ٹھیک ہے تم جلدی پکالو میں نیچے مرزا صاحب سے گپ شپ کر آؤں۔'' حفیظ نے کرائے دار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور زینے اتر کر ان کے گھر کی بیل بجائی۔

''آیئے! حفیظ صاحب! بھئی آج تو پورے شہر میں بڑی رونق ہے خاص طور پر ہمارے محلے میں ایک میلے کا سماں ہے۔'' مرزا صاحب نے خوشی کا اظہار کیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ہمارا انور بھی جلوس میں گیا ہے۔'' حفیظ نے جواباً کہا۔

''ظفر بھی تو انور کے ساتھ ہے۔'' مرزا صاحب نے بات آگے بڑھائی۔

''ہاں! میں نے انہیں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔'' حفیظ نے تائید کی۔

ظفر مرزا صاحب کا بڑا بیٹا اور انٹر کا طالبِ علم تھا۔ اتنے میں سمیر جھنڈا لہراتا ہوا باپ کے پاس آیا۔

''ابو! میں باہر جاؤں، میں صرف نائن زیرو تک جاؤں گا محلے کے اور بچے بھی ساتھ ہیں۔'' سمیر نے اجازت

طلب کی۔

''ارے حفیظ صاحب! جانے دیجئے نا بچے ہیں انجوائے کریں گے۔'' مرزا صاحب نے حفیظ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا جاؤ مگر بیٹا دور مت جانا ورنہ تمھاری امی پریشان ہو جائیں گی۔'' حفیظ نے نرمی سے کہا۔ وہ جیئے مہاجر کہتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔ حفیظ اور مرزا صاحب گپ شپ کرتے رہے۔

''جلدی گیٹ کھولیں۔'' سمیر کی گھبرائی ہوئی آواز نے نیچے بیٹھے ہوئے حفیظ اور مرزا صاحب کو چونکا دیا۔ ان دونوں نے بیک وقت دروازہ کھولا۔

''کیا بات ہے؟ کیا پریشانی ہے۔'' حفیظ نے بیٹے سے پوچھا۔

''ابو! سہراب گوٹھ پر ہنگامہ ہو گیا ہے میں نائن زیرو میں موجود تھا وہاں سہراب گوٹھ سے کئی لوگ زخمی ہو کر آئے تھے۔ اس کے علاوہ واٹر پمپ پر بھی پٹھانوں نے مہاجروں پر حملہ کر دیا ہے۔ ہر طرف افراتفری پھیلی ہوئی ہے۔'' سمیر نے ایک ہی سانس میں تمام قصہ بیان کیا۔

''اللہ خیر کرے، یہ کیا ہوا؟ مجھے انور کی فکر ہو رہی ہے۔'' حفیظ نے خوف اور پریشانی کے ملے جلے انداز میں کہا۔

''ظفر بھی تو انور ہی کے ساتھ گیا تھا۔ چلیں معلوم کرتے ہیں۔'' مرزا صاحب نے حفیظ سے کہا اور گھبراہٹ میں وہ باہر نکلے۔

سمیر اوپر اپنی امی کو صورتِ حال بتانے کے لئے چڑھا۔ حفیظ نے اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کی پچھلی نشست پر مرزا صاحب بیٹھ گئے، وہ دونوں عزیز آباد سے واٹر پمپ کی طرف روانہ ہوئے جیسے ہی وہ دونوں نصیر آباد سے واٹر پمپ کی طرف مڑے وہاں بڑا دل ہلا دینے والا منظر تھا۔ افغانی اور پٹھان ڈنڈوں اور لاٹھیوں سے مسلح ہو کر مہاجر بچوں اور نوجوانوں پر حملہ کر رہے تھے۔ کسی کے سر سے خون بہہ رہا تھا تو کسی کا ہاتھ زخمی تھا تو کوئی منہ کے بل اوندھا پڑا ہوا تھا۔ پولیس کا وجود کہیں بھی نہیں تھا۔ اسی دوران وہ بسیں جو سہراب گوٹھ پہنچی ہوئی تھیں وہ تیزی سے واپس آ رہی تھیں۔ ان بسوں پر بھی زخمی نوجوان اور بزرگ نظر آئے، ایک لمحے کے لئے حفیظ اور مرزا صاحب کانپ گئے۔ خوف کی ایک لہر ان کے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ اب وہ نوجوان جو واٹر پمپ کے اطراف

رہ رہے تھے وہ بھی ہاکی اور کرکٹ کے بلے لئے مسلح لوگوں کی طرف بڑھے اس طرح آمنے سامنے مقابلہ ہوا تھوڑی دیر بعد وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ حفیظ نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور ان بسوں کا تعاقب کیا تا کہ اصل حقیقت کا پتہ چلایا جائے۔ تھوڑی دور جا کے بسیں رک گئیں۔ حفیظ نے ڈرائیور سے پوچھا کہ کیا ہوا تو اس نے بتایا کہ بسیں حیدر آباد جانے کے لئے جیسے ہی سہراب گوٹھ پہنچیں تو وہاں سے مسلح لوگوں کی ایک کثیر تعداد نے حملہ کر دیا۔ فائرنگ بھی کی، جس کے باعث کئی نوجوان ہلاک اور زخمی ہوئے۔ زخمیوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔ یہ سنتے ہی حفیظ اور مرزا صاحب کی حالت غیر ہوگئی انہیں بچوں کی فکر لاحق تھی۔ یہاں رکنے کی بجائے انہوں نے نائن زیرو کا رخ کیا کیونکہ وہیں سے ہلاک اور زخمیوں کی تعداد اور ان کے نام معلوم کئے جا سکتے تھے۔

''بیٹا! ہلاک ہونے والوں اور زخمیوں کو کہاں لے جایا گیا ہے۔'' حفیظ نے ان کے علاقے کے یونٹ انچارج سے پوچھا۔

''انکل! جنہیں شہید کیا گیا انہیں ایدھی سینٹر سہراب گوٹھ میں رکھا گیا ہے، اس کے علاوہ زخمیوں کو قریبی اسپتال اور سندھ گورنمنٹ اسپتال کریم آباد، شدید زخمیوں کو عباسی شہید ہسپتال روانہ کر دیا ہے۔ وہاں ہمارے کارکن موجود ہیں''۔ یونٹ انچارج نے کہا اور دیگر لوگوں کے ساتھ امدادی کام میں مصروف ہو گیا کیونکہ بڑی تعداد میں لوگ زخمی تھے اور انہیں خون کی ضرورت تھی لہٰذا خون کے لئے اپیل کی جا رہی تھی۔ محلے کے درجنوں نوجوان خون دینے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔ نائن زیرو پر لوگوں کا بے پناہ رش تھا۔ اس واقعے کے خلاف لوگوں میں شدید غم و غصہ پایا جا رہا تھا۔

دو بج گئے تھے انور اور اس کے ابو حفیظ ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ خورشید بانو، سمیرا اور ارم پریشانی کے عالم میں بالکونی میں کھڑے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایمبولینس کی دل ہلا دینے والی آوازیں فضا کو مزید سوگوار بنا رہی تھی چونکہ سمیر نے اپنی امی کو سہراب گوٹھ کا واقعہ بتا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ خورشید بانو حد سے زیادہ پریشان تھیں۔ کھانا پک چکا تھا مگر سب کی بھوک اڑ چکی تھی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو خورشید بانو نے لپک کر فون اٹھایا۔

''ہیلو! کون'' اس نے چیخ کر پوچھا۔

''میں بول رہا ہوں انور گھر آ گیا کیا؟'' حفیظ کی آواز تھی وہ پی سی او سے بات کر رہا تھا۔

''نہیں ابھی تک نہیں آیا، حالات تو ٹھیک ہے نا''۔ خورشید بانو نے مضطرب انداز میں پوچھا۔

''حالات بہت خراب ہیں، پورے شہر میں خوف و ہراس ہے۔ گیٹ بند رکھنا۔ مرزا صاحب بھی میرے ساتھ ہیں ہم انور اور ظفر کا پتہ لگا کر ہی آئیں گے''۔ انہوں نے کہا اور فون رکھ دیا۔ خورشید بانو نے فوراً وضو کیا اور نفل حاجت پڑھنے بیٹھ گئیں۔

نائن زیرو پر بہت رش تھا۔ والدین اور دیگر لوگ اپنے بچوں اور عزیزوں کا پتا کرنے پہنچے ہوئے تھے جو قافلے حیدرآباد کے لئے روانہ ہوئے تھے اس میں سے زیادہ تر لوگ واپس آ چکے تھے جو نوجوان بسوں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے تھے وہی سب سے زیادہ متاثر تھے۔ سہراب گوٹھ کا واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پورے شہر میں پھیل چکا تھا۔ جگہ جگہ لوگ ٹولیوں کی صورت میں کھڑے اس واقعے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ الطاف حسین کی تقریر سننے اور اس میں شرکت کی غرض سے نوجوانوں میں زبردست جوش وخروش پایا جا رہا تھا کہ اسی دوران یہ واقعہ رونما ہو گیا۔ اس غیر معمولی واقعے نے مہاجروں کے دلوں کو چھلنی کر دیا تھا۔ وہ حیران تھے کہ آخر یہ ہوا تو کیوں ہوا۔ جبکہ وہ کسی کے خلاف نہیں تھے، کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہے تھے، وہ صرف اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہے تھے، اپنے حقوق کو حاصل کرنا چاہتے تھے، ان کی ذات سے کسی کو کیا تکلیف تھی، اتنا ضرور تھا کہ الطاف حسین کے جلسوں میں لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر مخالفین کی نیندوں کو اڑا چکا تھا۔ مہاجروں کی بیداری سے وہ خائف تھے اگر مہاجرین سے کسی کو تکلیف تھی تو وہ وڈیرے اور جاگیردار ہی ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ نوکر شاہی کا وہ طبقہ جو شاہ سے زیادہ شاہ کا وفادار بننے کی کوشش میں سرگرداں رہتا تھا یا پھر وہ ایجنسیاں جو مہاجروں کو متحد دیکھ کر اپنا نوشتہ دیوار پڑھ چکی تھیں۔

گیٹ پر بہت زور زور کی دستک سنائی دی۔ خورشید بانو نے سلام پھیر کر بالکونی سے جھانکا تو انور اور ظفر کئی لڑکوں کے درمیان موجود تھے، انہیں لڑکوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ دونوں کے سروں پر پٹیاں بندھی تھیں اور ہاتھوں پر بھی زخم تھے۔ خورشید بانو ننگے پیر نیچے دوڑی چلی آئیں۔ مرزا صاحب کی بیگم قدسیہ بھی گیٹ پر موجود

تھیں۔ محلے کے لڑکوں نے ظفر کو نیچے اس کے گھر پہنچایا پھر انور کو سہارا دیتے ہوئے اوپری منزل پر اس کے کمرے تک پہنچا دیا۔

''کیا ہوا؟'' خورشید بانو نے بیٹے کو نڈھال دیکھ کر لڑکوں سے پوچھا۔

''آنٹی! اس کے سر پر ڈنڈوں سے چوٹ آئی ہے، چار ٹانکے لگے ہیں، اس کے علاوہ ہاتھوں پر بھی لاٹھیوں کے زخم ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ فریکچر نہیں ہوا۔ عباسی شہید اسپتال سے ٹانکے لگوا کر آ رہے ہیں۔'' امجد اور معین نے جواب دیا جو انور اور ظفر کے دوست تھے۔

''ظفر کو کہاں چوٹ آئی ہے''۔ اس نے اگلا سوال کیا۔

''اس کے سر میں دو ٹانکے لگے ہیں ہاں البتہ اس کے پیروں میں زیادہ چوٹ آئی ہے، ایکسرے کرایا تھا مگر اس کا بھی فریکچر نہیں ہے۔'' معین نے تفصیل بتائی۔ انور کے ہاتھ میں جو جھنڈا تھا وہ معین نے خورشید بانو کو دیا، اس پر خون کے نشانات تھے جو انور کے سر سے بہہ کر اس پر لگے تھے۔ تھوڑی دیر رکنے کے بعد تمام لڑکے واپس چلے گئے، جاتے ہوئے انہوں نے دوائیوں کی پڑیا خورشید بانو کو دیتے ہوئے استعمال کرنے کا طریقہ بھی سمجھا دیا۔

''بیٹا! یہ دوائیاں کہاں سے آئیں اور ہاں، ٹانکے لگوانے کے پیسے تو لیتے جاؤ۔'' خورشید بانو نے احسانمندی سے کہا۔

''نہیں آنٹی! یہ تمام انتظام ایم کیو ایم نے کیا ہے۔ ہم نے اپنے پاس سے کچھ بھی خرچ نہیں کیا، آپ انور کو آرام کرائیں۔'' لڑکوں نے تفصیل بیان کی اور چلے گئے۔

سہ پہر ساڑھے تین بجے کے قریب حفیظ اور مرزا صاحب گھر میں داخل ہوئے تو انہیں بچوں کے زخمی ہونے کی اطلاع ملی۔

''کیسی طبیعت ہے؟'' حفیظ نے انور سے پوچھا جو آنکھیں موندے بستر پر لیٹا تھا۔

''کچھ بہتر ہے مگر سر میں درد ہو رہا ہے۔'' انور نے نقاہت بھری آواز سے کہا۔

''تھوڑا سا کھانا کھا لو پھر دوا لے لینا، انشاء اللہ درد کم ہو جائے گا۔'' حفیظ نے پیار بھرے لہجے میں اس کے سر پر

ہاتھ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

خورشید بانو نے سب کے لئے کھانا لگا دیا کیونکہ وہ سب اسی پریشانی کے عالم میں ابھی تک کھانا نہ کھا سکے تھے البتہ انور کو اس کے بستر پر ہی کھانا دیا گیا۔ کھانے سے فراغت کے بعد حفیظ نے انور کو دوا دی، اس کے بعد سونے کا مشورہ دیا تاکہ اسے آرام مل سکے۔ گھر کے دیگر افراد بھی آرام کی غرض سے بستر پر لیٹ گئے۔

عصر کی نماز پڑھنے کے بعد خورشید بانو نے چائے تیار کی۔ چائے پینے کے بعد حفیظ مرزا صاحب کے ساتھ نائن زیرو کی طرف روانہ ہوئے تاکہ مزید صورتِ حال معلوم ہو۔ ٹی وی کی خبروں سے صحیح صورتِ حال معلوم نہیں ہو رہی تھی کیونکہ سرکاری ایجنسی پر لوگوں کا اعتبار ختم ہو چکا تھا عموماً لوگ بی بی سی کی خبروں کو معتبر سمجھتے تھے یہ خبریں رات آٹھ بجے نشر ہوتی تھیں۔ رات سوا آٹھ بجے بی بی سی کی خبروں کے بعد شہر کی صورتِ حال مزید بگڑ گئی۔ افغانیوں، پٹھانوں اور مہاجروں کے درمیان کشیدگی میں اضافہ ہو گیا تھا، شہری خوف میں مبتلا ہو گئے تھے۔ خورشید بانو اور حفیظ نے بچوں کے باہر نکلنے پر پابندی لگا دی تھی۔ والدین اسکول، کالج باعث مجبوری بچوں کو روانہ کرتے ان کی واپسی اور سلامتی کے لئے دعائیں کرتے۔ وقت گزرتا رہا۔ ایم کیو ایم کی طاقت بڑھتی رہی ساتھ ہی ساتھ کشیدگی بھی اضافہ ہوتا رہا۔

اتوار کی صبح حسبِ اوقات خورشید بانو اور حفیظ نے ناشتہ کیا۔ بچے سو رہے تھے۔

''خورشید! آج کیا تاریخ ہے، کمیٹی کے پیسے دینے ہیں نا'' حفیظ نے کیلنڈر پر نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''غالباً آج دسمبر کی ۱۴ تاریخ ہے، کمیٹی کے پیسے کل دینے ہیں۔'' خورشید نے مختصراً جواب دیا۔

''ہاں! آج ۱۴ دسمبر ہے۔ ٹھنڈ بھی بڑھ گئی ہے۔ اب کمبل میں بھی سردی لگتی ہے۔'' حفیظ نے کہا۔

''آپ بڑے صندوق سے لحاف نکال لیں تاکہ میں دھوپ میں ڈال دوں۔'' خورشید بانو نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔

''اخبار پڑھنے کے بعد میں لحاف نکال دوں گا۔'' حفیظ نے اخبار بالکونی سے اٹھاتے ہوئے کہا جو تھوڑی دیر پہلے ہاکر ڈال گیا تھا۔

''سنئے! کافی دنوں سے صمد چاچا کی طرف نہیں جانا ہوا۔ بچوں کو گھر پر چھوڑ کر ہم دونوں ان کی خیریت معلوم

کر کے آتے ہیں۔'' خورشید بانو نے حفیظ سے کہا۔

''ہاں ٹھیک ہے، کھانا جلدی تیار کرلو تاکہ جلدی جا کر جلد ہی لوٹ آئیں''۔ حفیظ نے بیوی کی حامی بھرتے ہوئے کہا۔

خورشید بانو نے جلدی جلدی کھانا تیار کرلیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی نے پندرہ بیس منٹ آرام کیا۔ اس کے بعد صمد چاچا کے گھر جانے کے لئے نکلے۔ بچوں کو تاکید کردی تھی کہ کوئی بھی بچہ گھر سے باہر نہ نکلے۔ انور کو خاص طور پر گھر کا خیال رکھنے کا کہہ دیا تھا۔ صمد چاچا برنس روڈ پر فریسکو چوک کے سامنے والے فلیٹ میں رہائش پذیر تھے۔ ان کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا، اس میں کل چار کمرے تھے۔ ان کا خاندان پانچ افراد پر مشتمل تھا یعنی دو بیٹے ایک بہو کے علاوہ صمد چاچا اور زیبا چاچی۔

حفیظ نے موٹر سائیکل نکالی۔ خورشید بانو کو پیچھے بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔ عزیز آباد سے گزرتے ہوئے انہیں کافی ہجوم نظر آیا، کئی لوگ ٹولیوں میں کھڑے گفتگو کرتے ہوئے بھی دکھائی دیئے۔ حفیظ نے کوئی خاص توجہ نہیں دی کیونکہ اتوار کے روز عموماً نائن زیرو پر رش ہوتا تھا، سندھ کے مختلف شہروں سے بھی لوگ آتے تھے یوں یہاں لوگوں کی کثیر تعداد ہر وقت موجود رہتی تھی۔

اس وقت سہ پہر ساڑھے تین بجے کا وقت تھا۔ حفیظ نے موٹر سائیکل عزیز آباد سے عائشہ منزل کی طرف نکالی تو تمام روڈ پر سناٹا سا تھا۔ بسیں، کوچز نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اس کے علاوہ رکشہ اور ٹیکسی بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''اللہ خیر کرے۔ لگتا ہے پھر کچھ ہوگیا ہے۔'' حفیظ نے خورشید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''واپس چلیں کیا؟'' خورشید بانو نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔

''نہیں بھئی۔ اب گھر سے نکل پڑے ہیں تو چاچا سے مل کر ہی آئیں گے۔ اللہ نگہبان ہے۔'' حفیظ نے خورشید کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

جیسے ہی وہ لیاقت آباد سے گزرے تو بالکل سناٹا تھا۔ لوگ سڑکوں سے ہٹ کر گلی محلوں میں جمع تھے۔ ان میں سے کئی نوجوانوں کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور ڈنڈے بھی تھے۔ اچانک کئی لوگ حفیظ کی موٹر سائیکل کے آگے

آ کر کھڑے ہو گئے اس نے بریک لگایا۔

''کیا بات ہے بھائی خیریت تو ہے؟'' حفیظ نے گھبراہٹ میں پوچھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے دونوں میاں بیوی کو پریشان دیکھ کر پوچھا۔

''برنس روڈ جا رہے تھے'' حفیظ نے جواب دیا۔

''آپ لوگ فوراً واپس اپنے گھر جائیں، اورنگی ٹاؤن اور بنارس میں بدترین فسادات ہوئے ہیں، وہاں پچاس ساٹھ افراد کو مسلح لوگوں نے شہید کر دیا ہے اس کے علاوہ ان کی املاک کو بھی آگ لگا دی ہے۔ اس وقت وہاں کرفیو لگا دیا گیا ہے پتا نہیں یہاں بھی کب حالات بگڑ جائیں'' کئی لوگوں نے یک زبان ہو کر کہا۔

حفیظ نے فوراً موٹر سائیکل واپسی کے لئے موڑ دی۔ خورشید بانو بھی بہت خوفزدہ ہو گئی۔ انہیں فوراً ہی بچوں کا خیال آ گیا، وہ دل ہی دل میں دعائیں کرتی رہیں۔ خدا خدا کر کے دونوں عزیز آباد تک پہنچے، یہاں بھی ہو کا عالم تھا۔ ان کے گھر کے قریب کئی لوگ اکھٹے کھڑے ہو کر خبریں سن رہے تھے، ان میں مرزا صاحب بھی کھڑے تھے۔ حفیظ اور خورشید کو موٹر سائیکل پر آتے دیکھ کر مرزا صاحب ان کے قریب آئے۔

''حفیظ صاحب! ان ہنگاموں میں آپ کہاں چلے گئے تھے؟'' مرزا صاحب نے سوال کیا۔

''ارے مرزا صاحب! مت پوچھئے ہمیں بیگم کے چاچا کے ہاں برنس روڈ جانا تھا۔ لیاقت آباد پہنچے تو وہاں کے لوگوں نے ہمیں واپس گھر بھجوا دیا۔ شہر کی صورتحال اتنی نازک ہو گئی اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلا'' ۔ حفیظ نے موٹر سائیکل کو گیٹ کے اندر لاتے ہوئے تفصیل بتائی۔ خورشید بانو اوپر زینے طے کر کے اپنے مکان میں داخل ہوئی تو تمام بچے گھر میں موجود تھے وہ سب ٹی وی سے خبریں دیکھ رہے تھے۔

اگلی صبح شہر کے تمام اخبارات علی گڑھ اور قصبہ کالونی کے علاوہ اورنگی ٹاؤن کے خونی فسادات سے بھرے ہوئے تھے۔ اخبارات کے ذریعے پتا چلا کہ کئی نوجوانوں کو ان کے گھروں میں آگ لگا کر زندہ جلا دیا گیا تھا، بچ جانے والے کئی افراد کو اٹھا کر جلتی آگ کے شعلوں میں پھینکا گیا نہ صرف ملکی اخبارات بلکہ غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کی پہلی خبر بھی کراچی کے فسادات کی تھی۔ یہ خونی کھیل پولیس کی موجودگی میں کھیلا گیا تھا۔ انتظامیہ کیوں اور کس کے ایما پر خاموش تھی، یہ معمہ سمجھ سے بالاتر تھا۔ ان فسادات میں پہلی مرتبہ کلاشنکوف کا استعمال کیا

گیا تھا۔ یہ اسلحہ افغانستان وار میں وہاں کے مقامی باشندے استعمال کرتے تھے۔ افغان مہاجرین کی تعداد جب کراچی پہنچی تو منشیات کے ساتھ ساتھ کلاشنکوف کلچر بھی اپنے ساتھ یہاں لے آئی۔ انہوں نے یہ اسلحہ یہاں کے مقامی پختونوں کو بھی فراہم کیا جس نے یہ اسلحہ اردو بولنے والوں کے خلاف استعمال کیا۔ اس اہم واقعے نے دل ہلا دینے والے منظر پیش کیے۔ بارہ سے پندرہ سال تک کے لڑکوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ یہ واقعہ کراچی کی تاریخ کا بدترین واقعہ تھا۔ اورنگی کے فسادات مزید دیگر علاقوں میں پھیل گئے 15 دسمبر کو مزید 51 افراد ہلاک کر دیئے گئے۔ کرفیو کا نفاذ نیو کراچی، لیاقت آباد، واٹر پمپ اور ناظم آباد تک ہوا۔ پھر 16 دسمبر کو 60 افراد ہلاک ہو گئے صرف اولڈ ایریا چھوڑ کر پورا کراچی شدید فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ 17 دسمبر کی خونی رات کرفیو کا نفاذ سخت کر دیا گیا۔ شہر پر موت کا رقص جاری تھا۔ شہر کے باسی رات کو جاگنے پر مجبور تھے کیونکہ ان کی بقاء کا مسئلہ تھا۔ حفیظ اور خورشید بانو بچوں کی وجہ سے خوفزدہ تھے۔ مرزا صاحب اپنی فیملی سمیت اپنے ایک دوست کے گھر کلفٹن شفٹ ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے گھر پر تالا لگا دیا تھا۔ 17 دسمبر کی رات کو افواہوں نے تمام لوگوں کو مضطرب کر دیا، یہ اطلاع ملی کہ پختون مہاجروں کی بستیوں پر سہراب گوٹھ سے حملہ کرنے کیلئے آنے والے ہیں۔ اس اطلاع نے حفیظ اور خورشید کے اوسان خطا کر دیئے۔ ان کے محلے میں ایک ٹیکسی ڈرائیور منور بالکل تنہا ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا تھا۔ حفیظ اور خورشید اکثر اسے کھانا بھجواتے تھے۔ کہیں کسی تقریب میں جانے کا اتفاق ہوتا تو وہ لوگ منور کی ٹیکسی میں جایا کرتے تھے چونکہ تین دنوں سے پورے کراچی میں کرفیو تھا ہوٹل وغیرہ بھی بند تھے۔ حفیظ نے منور کے کھانے کا بندوبست اپنے گھر پر ہی کروایا تھا۔ کرفیو کی وجہ سے سناٹا تھا خوف کی وجہ سے تمام لوگ ذہنی دباؤ کا شکار تھے اسٹریٹ لائٹ بھی آف تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ حفیظ نے بالکونی سے نیچے جھانکا تو وہاں منور کھڑا تھا۔ حفیظ نے جا کر دروازہ کھولا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے منور؟'' حفیظ نے پوچھا۔

''حفیظ صاحب! خبر یہ ہے کہ کچھ مسلح لوگ حملہ کرنے والے ہیں، ہمارے لوگ بھی تیار ہیں، پتا نہیں کیوں مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، ایسا کرتے ہیں کہ یہاں سے چلے جاتے ہیں'' اس نے پریشانی سے کہا۔

''کہاں چلیں؟ ہر طرف خونریزی ہے کون دشمن ہے یہ پتا لگانا مشکل ہے''۔ حفیظ نے مضطرب ہوتے ہوئے

کہا۔

''آپ کے چاچا برنس روڈ پر رہتے ہیں نا، وہیں چلتے ہیں کم از کم وہ جگہ سہراب گوٹھ سے دور ہے اور وہاں سب ہی لوگ اپنے ہیں، وہ جگہ محفوظ ہے۔'' منور نے تجویز پیش کی۔

تجویز معقول تھی۔ حفیظ اور خورشید بچوں کی وجہ سے یہ خطرہ مول لینے پر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے کھانا کھایا اور ضروری سامان لے کر برنس روڈ پر جانے کے لیے ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ حفیظ نے تمام لائٹس آف کر دیں اور مکان کو تالا لگایا۔ منور نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر حفیظ بیٹھ گیا۔ پچھلی نشست پر خورشید بانو، ارم، انور اور سمیر یہ چاروں بیٹھ گئے۔ رات کے نو بجے کا وقت تھا۔ سردیوں کی راتیں بڑی لمبی ہوتی ہیں پھر چاروں طرف اندھیرا۔ کرفیو کی وجہ سے سڑکوں پر ایسا سناٹا تھا کہ سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ ٹیکسی عزیز آباد کی سڑک سے گزری تو دیکھا کہ جگہ جگہ ریت کی بوریوں سے مورچے بنائے گئے ہیں ہر مورچے پر کئی نوجوان پہرہ دے رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں ٹارچ اور اسلحہ تھا۔ یہ اسلحہ انہوں نے اپنے دفاع کے لیے رکھا تھا تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پولیس اور فوجی دستے دکھائی دیئے۔ اچانک ٹیکسی کے ونڈ اسکرین پر ایک تیز روشنی پڑی۔

''کون ہے ٹیکسی روکو؟'' ایک بھاری آواز نے انہیں متوجہ کیا۔ ٹیکسی میں سوار تمام لوگ خوفزدہ ہو کر اندھیرے میں اس آواز کی جانب دیکھنے لگے۔ وہ کل تین نوجوان تھے جن کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ منور نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور باہر نکلا۔

''ہم برنس روڈ جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ فیملی ہے۔'' منور نے بلند آواز سے کہا۔ وہ تینوں قریب آئے اور ٹیکسی کے اندر جھانکنے لگے۔

''ارے انکل آپ! اس خطرناک ماحول میں کہاں جا رہے ہیں''۔ ان کے علاقے کے یونٹ انچارج شعیب نے پوچھا۔

''برنس روڈ چچا کے گھر بچوں کو لے کر جا رہا ہوں، تمہاری آنٹی بچوں کی وجہ سے پریشان ہیں؟'' حفیظ نے صحیح بات بتا دی۔

''ٹھیک ہے جایئے، کرفیو بھی لگا ہے آپ کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں پھر ان دیکھے دشمنوں کا بھی بھروسہ نہیں۔احتیاط سے جایئے'' شعیب نے تاکید کی۔

''اللہ مالک ہے بیٹا۔'' حفیظ نے کہا۔منور نے ٹیکسی دوبارہ اسٹارٹ کردی۔ٹیکسی دستگیر سے ہوتی ہوئی ڈینٹل کالج بلاک 16 کی طرف مڑی۔چوراہے پر آرمی موجود تھی۔انہوں نے چوراہے کے چاروں طرف مورچے سنبھال رکھے تھے۔ٹیکسی کو آتا دیکھ کر انہوں نے مائیک سے وارننگ دی۔ٹیکسی رک گئی۔دو آرمی کے نوجوان رائفل تھامے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

''آپ لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ کرفیو لگا ہے پھر سڑک پر آنے کا کیا مقصد ہے؟'' جوان بلند آواز سے مخاطب ہوا۔

''ہاں! کرفیو کا علم ہے بیگم اور بچی کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے انہیں اسپتال لے کر جارہے ہیں۔'' حفیظ نے جھوٹ بولا۔جوان نے ایک لمحے کے لیے خورشید اور ارم کی طرف نظر ڈالی پھر پتا نہیں کیسے اس کے دل میں رحم آ گیا کہ اس نے آگے جانے کی اجازت دی لہٰذا ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔چاروں طرف گھپ اندھیرا، فضاء اداس اور سوگوار، ہر لمحہ دشمن کی گولی کا خطرہ اور دشمن بھی وہ جو ہم میں سے ہی تھا کون، کب اور کہاں سے آ موجود ہو اس کا اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

''ابا! کہتے تھے کہ 1947ء میں جب پاکستان بنا تو سکھوں اور ہندوؤں نے مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا۔ انہوں نے ہمایوں کے مقبرے کے احاطے میں چھپ کر اپنی جان بچائی تھی۔سکھ اور ہندو تو دور سے شناخت کیے جاتے تھے مگر ہمارے دشمن شناخت نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ نہ تو سکھ ہیں اور نہ ہی ہندو یہ صورتحال زیادہ تشویشناک ہے۔'' پہلی بار خورشید بانو نے لب کشائی کی۔

''انسانیت سے گرے ہوئے لوگوں کا کبھی کوئی مذہب نہیں ہوتا، وہ شیطان پیدا ہوتے ہیں اور اسی کی موت مر جاتے ہیں۔'' حفیظ نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے جواب دیا۔بچے گاڑی میں سہمے ماں، باپ کی گفتگو سن رہے تھے۔ منور خاموشی سے ٹیکسی چلاتا رہا۔حسن اسکوائر کے قریب ٹائر جلنے سے شعلے بلند ہو رہے تھے، کئی گاڑیوں کے جلے ہوئے ڈھانچے سڑکوں کے درمیان پڑے تھے۔پولیس اور فائر فائٹر اس ملبے کو سڑک کے کنارے ایک

طرف لگا رہے تھے۔ منور نے ٹیکسی کو سبزی منڈی کے بجائے اسٹیڈیم روڈ کی طرف موڑا۔

''اتنے دور کا فاصلہ کیوں اختیار کر رہے ہو۔'' حفیظ نے منور سے پوچھا۔

''سبزی منڈی افغانیوں اور پٹھانوں کا گڑھ ہے، یہاں سے خطرہ ہے۔ میں اسٹیڈیم سے ہوتا ہوا کارساز کے راستے سیدھا شاہراہ فیصل پر نکلوں گا وہاں سے ہم برنس روڈ جائیں گے۔'' منور نے وضاحت کی۔

ٹیکسی شاہراہ فیصل پر دوڑ رہی تھی۔ سڑک پر ان کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ سب ہی لوگ خوف اور دہشت میں مبتلا تھے۔ ارم چونکہ بچی تھی وہ ڈر کی وجہ سے رونے لگی۔ خورشید اور حفیظ نے اسے تسلی دی۔ خدا خدا کر کے شاہراہ فیصل ختم ہو گیا، اب ٹیکسی صدر سے گزر رہی تھی۔ ریگل کے قریب دو بسیں جل رہی تھیں۔ منور نے ٹیکسی کی رفتار بڑھائی اور تیزی سے آگے نکل گیا، اب برنس روڈ شروع ہو چکا تھا۔ حفیظ اور خورشید نے سکھ کا سانس لیا کیونکہ عزیز آباد سے یہاں تک کا سفر برسوں پر محیط محسوس ہوتا رہا۔ اس وقت تقریباً پونے بارہ بجے کا وقت تھا، برنس روڈ پر ہر طرف نوجوانوں کا ہجوم نظر آیا۔ وہ سب ہی جذباتی ہو رہے تھے۔ رات کے وقت ٹیکسی کو آتا دیکھ کر ان کی تشویش میں اضافہ ہوا۔ دو لڑکوں نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ منور نے ٹیکسی روک دی۔

''کہاں سے آ رہے ہو۔'' لڑکوں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

''عزیز آباد سے آ رہے ہیں۔'' منور نے مختصر سا جواب دیا۔ اردو بولنے والوں کو دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا۔

''وہاں خیریت ہے کوئی پریشانی کی بات تو نہیں۔'' کئی لوگوں نے قریب آ کر پوچھا۔

''لوگوں میں زبردست خوف و ہراس ہے۔ تمام لوگ جاگ کر پہرہ دے رہے ہیں۔ ہم بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچے ہیں۔'' اب کی بار حفیظ نے انہیں بتایا۔

''کس طرف جانا ہے؟'' ایک کارکن نے پوچھا۔

''فریسکو چوک کی طرف جانا ہے۔'' حفیظ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جاؤ جلدی چلے جاؤ، آرمی مسلسل گشت کر رہی ہے کہیں کوئی پریشانی نہ ہو جائے۔'' دوسرے کارکن نے تشویش کا اظہار کیا۔ منور نے ٹیکسی فریسکو چوک کی طرف رواں کر دی۔ رات بارہ بجے وہ لوگ صمد چچا کے گھر پہنچے۔ وہ سبھی جاگ رہے تھے، انہیں اتنی رات گئے یہاں موجود دیکھ کر وہ سب یکدم پریشان ہو گئے پھر حفیظ نے تمام

تفصیلات بتائیں انہوں نے حفیظ اور ان کے خاندان کے رہنے کا بندوبست کیا اس کے علاوہ منور کو انہوں نے کامن روم میں سونے کی جگہ بنا دی۔

''فوزیہ کی خیریت معلوم کی تھی؟'' زیبا چچی نے حفیظ سے اس کی بہن کے متعلق پوچھا۔

''ہاں! نیو کراچی میں ان کی طرف اتنی کشیدگی نہیں ہے۔ میں نے آج صبح ہی اس سے بات کی تھی۔'' حفیظ نے جواباً کہا۔ حفیظ اور خورشید بانو تین روز تک چچا کے ہاں مقیم رہے پھر کرفیو کے وقفے کے دوران ٹیکسی کے ذریعے واپس اپنے گھر عزیز آباد پہنچے۔ مرزا صاحب ابھی تک نہیں لوٹے تھے۔ حفیظ کا کاروبار ان ہنگاموں کے باعث بہت متاثر ہو گیا تھا۔ اب عزیز آباد، واٹر پمپ اور ناظم آباد کے لوگوں نے محلے کی سطح پر بڑے بڑے آہنی گیٹ لگوا لئے تھے تا کہ باہر کا کوئی بھی آدمی اندر آسانی سے نہ آسکے۔ اس طرح وہ خود کو محفوظ کر رہے تھے۔

وقت گزرتا رہا اب تو لوگ ہر قسم کے واقعات کے کافی حد تک عادی ہو چکے تھے، مہاجر دشمنی کی بنیاد پر مختلف محکموں سے بے شمار نوجوانوں کو بے دخل کر کے انہیں بیروزگار کیا گیا، دیگر صوبوں کے لوگوں نے ان نوجوانوں کے ساتھ امتیازی سلوک کرنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے نوجوانوں میں احساس محرومی بڑھنے لگا، مختلف دور کی مختلف حکومتوں نے غیر ملکی امداد حاصل کرنے کے لیے افغان پناہ گزینوں کو اپنے ہاں ضرورت سے زیادہ آنے کی اجازت دے دی۔ ان پناہ گزینوں نے نوجوانوں کو ہیروئن کی لعنت میں مبتلا کر دیا۔ جگہ جگہ ہیروئن بکنے لگی۔ یہ ناسور معاشرے میں تیزی سے بڑھنے لگا، ہتھیار بھی سپلائی ہونے لگے۔ چار پیسوں کے لالچ میں مقامی نوجوان منشیات فروشوں کے جال میں پھنستے چلے گئے، والدین اپنے بچوں کو مختلف اذیتوں میں دیکھ کر زندہ درگور ہو گئے۔ حکومت نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں یا اپنے غیر آئینی دور حکومت کو طول دینے کے لیے نوجوانوں کو قربانی کا بکرا بنا دیا تھا، کوئی سنوائی نہیں تھی۔ ''ڈوائڈ اینڈ رول'' کے تحت ایجنسیوں کے ذریعے پٹھان مہاجر، سندھی مہاجر اور پنجابی مہاجروں کو آپس میں لڑا کر خود حکومت اور اقتدار کا مزہ لیا جاتا رہا۔ معصوم عوام حکومت کی چال سمجھ ہی نہیں سکے، اس طرح ایک غیر سیاسی حکومت نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے دیگر محبّ وطن فوجیوں کو عوام کی نظروں میں گناہ گار بنا کر پیش کیا جس کی تلافی نہ معلوم کب تک ہو۔

سندھ کے اردو بولنے والے ایم کیو ایم سے کسی صورت الگ نہیں ہونا چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ انہوں نے

حکومت کی ہر زیادتی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اسی دوران ایم کیو ایم نے مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے اپنے کئی کارکنوں کو پارٹی سے خارج کر دیا۔ اسٹیبلشمنٹ اور ایک سیاسی حکمراں نے مہاجروں اور ان کی نمائندہ جماعت ایم کیو ایم کو ختم کرنے کے لیے ایک منصوبہ بنایا کہ سندھ میں ایک بڑا ریاستی آپریشن کروایا جائے بظاہر یہ آپریشن اغوا برائے تاوان میں ملوث سرگرم گروہوں، ڈاکوؤں، انہیں پناہ دینے والے سندھ کے بڑے پتھارے داروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کے خلاف لگے مگر اندرون خانہ یہ آپریشن صرف ایم کیو ایم کو کرش کرنے کے لیے تھا۔ اس مقصد کے تحت ایک فرضی جناح پور کا نقشہ تیار کر کے اسے ایم کیو ایم سے منسوب کر دیا گیا تا کہ ملک کے تمام عوام ایم کیو ایم کو ملک دشمن اور غدار سمجھیں۔ اس مقصد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انہوں نے ایم کیو ایم سے نکالے گئے کارکنوں کی خدمات حاصل کر لیں۔ انہیں باقاعدہ ٹریننگ دے کر اسلحہ سے آراستہ کیا گیا تا کہ جب آپریشن کیا جائے اور ایم کیو ایم کے کارکن ہلاک ہوں تو یہ دو تنظیموں کے آپس کا معاملہ لگے، یوں حکمراں جماعت اور ایجنسیوں کا نام منظر عام پر نہ آئے۔ اسٹیبلشمنٹ کی ترتیب کردہ حقیقی دہشت گردوں کی ایک تنظیم 19 جون 1992ء منظر عام پر آئی، اس دن ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن ہوا۔ لوگوں نے اپنے بچاؤ کے لیے جو آہنی گیٹ محلوں کے درمیان اپنے گھروں کے آگے بنا لیے تھے۔ انہیں بلڈوز کر دیا گیا۔ نئی تنظیم کے آتے ہی ایم کیو ایم ''انڈر گراؤنڈ'' ہوگئی۔ اس آپریشن سے قبل سرکردہ لوگ باہر چلے گئے، دیگر اہم کارکنان اپنے گھروں کو چھوڑ کر باہر ملکوں یا پھر پنجاب وغیرہ کی طرف نکل گئے جو چھوٹے موٹے کارکن تھے وہ اپنے گھروں یا دیگر رشتہ داروں کے گھروں میں منتقل ہوگئے۔ اب شہر میں رینجرز بھی آگئی تھی اور پولیس کو فری ہینڈ دے دیا گیا یعنی پولیس کے ہاتھوں میں ایم کیو ایم کے نام پر موت کا پروانہ دیا گیا کہ وہ اپنی مرضی سے جسے چاہیں موت کے گھاٹ اتار دیں یا پھر کارکنوں کی رہائی کے عوض جتنی مرضی رقم بٹورنا چاہے بٹور لے۔ انہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔ یعنی ایم کیو ایم کے کارکنوں کی صفائی کا بیڑا اٹھایا گیا۔ اپنے ہی لوگوں نے اسٹیبلشمنٹ کے سہارے نادانستگی میں اپنے ہی بھائیوں کا خون بہایا، انہیں اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ انہیں ''چارے'' کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، وہ نئی تنظیم کے کارکن کراچی اور حیدر آباد میں اپنا قبضہ کرنے کی خاطر وہ سب کچھ مانتے چلے گئے جو حکومت اور ایجنسیوں نے کہا ان سے کہا۔ چاہے وہ جائز ہو یا ناجائز۔ ایف آئی ٹی

قائم کی گئی۔اس کے علاوہ رینجرز کا الگ کردار رہا۔ پولیس بھی پیچھے نہیں تھی۔اردو بولنے والے ایس ایچ او بہادر علی کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دے کر نیو کراچی تھانے میں مقرر کیا گیا،اسے اتنے اختیارات دیئے گئے کہ وہ کراچی کے کسی بھی تھانے سے اور کسی بھی جگہ سے جسے چاہے اٹھا کر لاسکتا تھا۔ بہادر علی اردو بولنے والا،یعنی ہم زبان ہی ہم زبان کا دشمن ثابت ہوا۔ یہ باقاعدہ پری پلان منصوبہ تھا۔کراچی کے چاروں ڈپٹی کمشنروں کے دفاتر ہی میں فوج اور ایف آئی ٹی سیل کو فعال بنا کر الگ الگ دفاتر دیئے گئے تھے۔ایف آئی ٹی کا مرکزی دفتر ڈرگ روڈ گھانچی ہال میں موجود تھا جہاں نامی گرامی ایم کیو ایم کے کارکنوں کو رکھا گیا تھا۔اس کے علاوہ سرسری سماعت کی عدالتیں امریکن سینٹر کے احاطے کے قریب قائم کی گئی تھیں،جس کے خلاف کسی کو بھی اپیل کرنے کی اجازت نہیں تھی وہاں پر عام عدالتوں کی رسائی نہیں تھی۔ پولیس اور رینجرز ہر کارکن پر تیرہ ڈی کا مقدمہ قائم کر کے جیل روانہ کیا کرتے یعنی ان دنوں اندھا قانون چل رہا تھا،اگر یوں کہا جائے کہ ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“۔تو مناسب ہوگا۔اس دور کی حکومت نے خود کو الگ رکھتے ہوئے فوج کو استعمال کیا تاکہ بدنامی کا طوق اس کی بجائے فوج کے گلے میں ہی ہو اور اس کا دامن صاف رہے۔

جولائی ۱۹۹۳ء میں بھی ایم کیو ایم کے خلاف آپریشن جاری رہا۔ایم کیو ایم سے تعلق کی بناء پر عام لوگوں کو بھی عتاب کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔وہ نوجوان جنہوں نے صرف ایم کیو ایم کے جھنڈے یا بینر لہرائے تھے انہیں بھی آدھی آدھی رات کو پولیس اور رینجرز کے جوان گھروں میں زبردستی بغیر سرچ وارنٹ داخل ہو کر پکڑ پکڑ کر لے جاتے رہے۔اخبارات اور این جی اوز حکومتی اس اقدام کے خلاف لکھتے رہے،انہیں بھی نہیں بخشا گیا،کئی اخبارات کو بینڈ کرنے کی کوشش کی گئی مگر اس میں وہ کامیاب نہیں ہو سکے۔

۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۲ء تک حفیظ کا خاندان عزیز آباد میں ہی مقیم رہا۔ہاں البتہ حفیظ نے اپنے فرنیچر کے کام کو بڑھا لیا تھا۔انور نے گریجویشن کے بعد ٹیلی فون ایکسچینج میں نوکری کر لی تھی،سمیر اس وقت بی ایس سی کر رہا تھا،ارم میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔حفیظ نے سوزوکی ہائی روف خرید لی تھی جس سے ان سب کو بہت سی سہولیات تھیں۔انور اور سمیر نے ایم کیو ایم میں کبھی شمولیت اختیار نہیں کی تھی ہاں البتہ کئی دفعہ ان کے جلسوں میں شرکت کی تھی،جھنڈے لہرائے تھے،ایم کیو ایم کا بیج لگا کر اپنا شوق پورا کرتے رہے۔گھر والوں سمیت ان دونوں

بھائیوں کی تمام تر وابستگی اندرون خانہ ایم کیو ایم کے ساتھ تھی۔ عملی طور پر انہوں نے کبھی تنظیم میں حصہ نہیں لیا تھا۔

''پتا نہیں کیوں صبح سے بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے''۔ خورشید بانو نے رات کے کھانے پر حفیظ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''خواتین زیادہ وہمی ہوتی ہیں۔ آنکھ پھڑک جائے تو برا ہوتا ہے، بلی راستہ کاٹ جائے تو کام بگڑ جاتا ہے، یہ فضولیات ہندوانہ ہیں۔ ہم مسلمانوں کو ان تمام باتوں سے دور رہنا چاہیئے''۔ حفیظ نے خورشید بانو کو ٹوک دیا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خورشید اور حفیظ اوپر چھت پر ٹہلنے لگے۔ آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں چھت سے اتر آئے۔ ارم نے بستر لگا دیا تھا، اسے صبح جلدی اسکول جانا تھا۔ کیونکہ اس کے اسکول میں میلاد کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس نے سفید رنگ کے کپڑے بنوائے تھے ان کپڑوں کو استری کرنے کے بعد اس نے ہنگر پر لٹکا دیا تھا۔ رات گیارہ بجے تک گھر کے تمام لوگ لائٹ آف کر کے سو گئے۔

گیٹ پر زوردار کی دستک سے گھر کے تمام لوگوں کی آنکھ کھل گئی۔ خورشید بانو نے لائٹ جلائی اور گھڑی دیکھی رات کے تین بجے تھے۔ اس وقت کون ہے وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ مرزا صاحب بھی جاگ گئے تھے، انہوں نے آواز دے کر پوچھا ''کون ہے''۔

''دروازہ کھولو' ایک بھاری آواز نے بلند لہجے میں کہا۔ مرزا صاحب نے دروازہ کھولا۔ کئی پولیس کے سپاہی دندناتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''انور کہاں ہے؟'' اے ایس آئی نے سوال کیا۔

''کون انور؟'' مرزا صاحب نے الٹا سوال کیا۔

''جو ایم کیو ایم کا کارکن ہے، اس نے کئی قتل کیے ہیں''۔ اے ایس آئی نے جواباً کہا۔

''انور نام کا نوجوان تو اوپر رہتا ہے مگر وہ ایم کیو ایم کا کارکن نہیں ہے، وہ عزیز آباد ایکسچینج میں کام کرتا ہے''۔ مرزا صاحب نے وضاحت کی۔ پولیس والے تیزی سے اوپر چڑھے۔ انہوں نے حفیظ کو ایک طرف دھکیل دیا اور زبردستی کمرے میں داخل ہوئے۔ انور بھی آنکھ ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔

''تم میں سے انور کون ہے''؟ ایک سپاہی نے سوال کیا۔

''میں ہوں'' انور نے جواب دیا۔

''چلو تھانے'' ہم تمہیں کئی دنوں سے تلاش کر رہے ہیں۔'' سپاہی نے بندوق کی بٹ سے اسے مارتے ہوئے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ہمارے بچے کسی سیاست میں نہیں ہیں پھر آپ لوگ اسے کیوں لے جانا چاہتے ہیں۔'' حفیظ اور خورشید بانو نے تیز لہجے میں پوچھا۔

''زیادہ بکواس مت کرو۔ ہمارے پاس اس کے خلاف کافی ثبوت ہیں یہی کافی ہیں''۔ پولیس کے ایک سپاہی نے کہا اور وہ اسے اپنے ساتھ لے جانے لگے۔

''میاں! آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تمام بچے اپنے کام سے کام رکھنے والے ہیں، یہ محلے میں بھی کم جاتے ہیں'' مرزا صاحب نے مداخلت کی۔

''آپ کو کسی نے وکالت کرنے کے لئے نہیں کہا۔ خاموش ہو جائیں ورنہ آپ کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔'' اے ایس آئی نے بدتمیزی سے کہا۔ آناً فاناً وہ لوگ انور کو اپنے ساتھ لے گئے۔ خورشید بانو چیخ چیخ کر رونے لگی اور پولیس والوں کو دہائیاں دینے لگی۔ حفیظ کا بھی دل بھر آیا۔ ان کا بیٹا بے قصور تھا۔ حفیظ نے جلدی سے کپڑے بدلے اور مرزا صاحب کو ساتھ لے کر پہلے عزیز آباد تھانے گیا، وہاں انور نہیں تھا۔ وہ دونوں پھر گلبرگ گئے تو وہ وہاں موجود تھا۔ انور کو لاک اپ کر دیا گیا تھا۔ یہ منظر ایک ایسے باپ کے لئے ناقابل فراموش تھا جس کا جوان بیٹا ناکردہ گناہوں کی سزا پائے۔

''بغیر کسی ثبوت کے آپ میرے بیٹے کو اٹھا کر لائے ہیں یہ صحیح نہیں ہے۔'' حفیظ نے احتجاج کیا۔

''کیا صحیح ہے اور کیا غلط ہے یہ فیصلہ کرنے والے ہم ہیں آپ نہیں۔ جہاں تک ثبوت کا تعلق ہے وہ اسلحہ رکھنے کا مقدمہ ہے۔'' ایس ایچ او نے کہا۔

''مگر ہمارے گھر سے اسلحہ تو برآمد نہیں ہوا۔'' حفیظ نے معصومیت سے کہا۔

'ہم ایف آئی آر میں درج کریں گے کہ اسلحہ برآمد ہوا'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''پلیز! آپ ایسا نہ کریں میرے بیٹے کی زندگی اور اس کا مستقبل ختم ہو جائے گا۔'' حفیظ نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

''بیٹے کی زندگی چاہتے ہو تو دو لاکھ روپے دے دو، ہم اسے چھوڑ دیں گے۔'' ایس ایچ او نے ڈھٹائی سے کہا۔

''ہم اتنے روپے کہاں سے دیں گے۔ ہمارے پاس تو نہیں ہیں۔'' حفیظ نے مغموم ہوتے ہوئے کہا۔

''بیوی کے گہنے تو ہوں گے، اسے بیچ کر لے آؤ۔'' اس نے سفاکی سے تجویز پیش کی۔

''نہیں۔ میری بیوی کے پاس اتنی مالیت کے زیوارت نہیں ہیں کچھ کم لے لو۔'' حفیظ نے عاجزی اختیار کی۔

''کتنا کم دو گے۔ تم ہی بتاؤ؟'' ایس ایچ او نے اے ایس آئی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اچھا چلو ایک لاکھ دے دو۔ میں ایف آئی آر نہیں کاٹوں گا اور اسے چھوڑ دوں گا۔'' اس نے حفیظ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''میں صبح آتا ہوں۔ آپ اس کی ایف آئی آر مت کاٹیے گا۔'' حفیظ نے نڈھال لہجے میں کہا اور مرزا صاحب کے ساتھ باہر نکل گیا۔ ہائی روف کو اس نے بمشکل اسٹارٹ کیا

''مرزا صاحب! اس ملک میں کوئی قانون نہیں ہے۔ یہ ملک چور اور لٹیرے چلا رہے ہیں۔ خدا انہیں غرق کرے۔'' حفیظ پھٹ پڑا۔ وہ گھر پہنچا تو تمام لوگ جاگ رہے تھے۔ خورشید اور ارم کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ بڑی مشکل سے مرزا صاحب ان کی بیوی اور حفیظ نے انہیں چپ کرا دیا۔

حفیظ صبح ہی صبح بینک گیا وہاں ستر ہزار روپے پڑے تھے وہ نکالے پھر مرزا صاحب سے تیس ہزار روپے قرض لئے اور تھانے پہنچ کر ایس ایچ او کو دیئے۔ اس نے انور کو فوراً ہی چھوڑ دیا۔ حفیظ انور کو لے کر گھر پہنچا تو خورشید نے بیٹے کو گلے سے لگا لیا اور اسے ناشتہ کرایا پھر وہ پولیس والوں کو بد دعائیں دینے لگی۔

''کیا سوچ رہے ہیں؟'' حفیظ کو گہری سوچ میں دیکھ کر خورشید بانو نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ یہ جگہ اب رہنے کے قابل نہیں رہی، ہمارے بچے یہاں محفوظ نہیں ہیں، میں یہ جگہ بیچ دوں گا۔'' حفیظ نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کہاں جائیں گے؟'' خورشید نے پوچھا۔

''صدر میں جیولرز سینٹر میں میرے ایک دوست کا تین کمروں کا فلیٹ ہے ہم وہاں رہیں گے۔'' حفیظ نے فیصلہ سنایا۔ مرزا صاحب بھی انور کے واقعے کے بعد اس علاقے سے بددل ہو گئے تھے لہٰذا انہوں نے بھی یہاں سے جانے کا فیصلہ کیا۔ انہوں نے کلفٹن میں ایک فلیٹ کرائے پر لیا، تین سے چار دنوں کے دوران حفیظ نے اپنا سامان صدر میں شفٹ کیا۔ اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے انور کا تبادلہ عزیز آباد سے صدر ایکسچینج میں کروالیا۔ عزیز آباد کا مکان انہوں نے پندرہ لاکھ میں اونے پونے بیچ دیا۔ دس لاکھ بینک میں فکس کروا لئے اور باقی صدر کے فلیٹ میں مزید رقم ملا کر لگا دیئے۔ لیاقت آباد میں فرنیچر کی دکان تھی جسے بیچنا ضروری نہیں تھا۔ وہ ٹھیک چل رہی تھی۔ میٹرک کے بعد ارم کا داخلہ سینٹ جوزف کالج میں ہو گیا تھا، یہ کالج صدر میں ہی تھا۔

اب حفیظ گھر اور بچوں کی طرف سے بے فکر ہو گیا تھا۔ سمیر نے بی ایس سی کر لیا تھا، وہ باہر جانے کے چکر میں تھا۔ اتفاق سے اسے دبئی جانے کا ایک چانس ملا اور وہ دبئی چلا گیا۔ خورشید بانو مطمئن تھی کیونکہ یہاں صدر میں اسے اور اس کے بچوں کے لئے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ عزیز آباد میں انور کے واقعے کے بعد اسے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا، وہ خوف اس نئے فلیٹ میں نہیں تھا اطراف کے رہنے والے پڑوسی اپنے کام سے کام رکھتے تھے دوسروں کے معاملے میں دخل اندازی نہیں کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ دو سال بیت گئے مگر ان دو سالوں کے دوران سینکڑوں نوجوانوں کو جیلوں میں بند کیا گیا، کئی درجن تشدد سے ہلاک کئے گئے۔ درجنوں نوجوانوں کو ان کاؤنٹر میں موت کی نیند سلا دیا گیا۔ کئی ان کاؤنٹرز ایسے تھے جس میں لڑکوں کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، وہ بھی بقول پولیس کے ان کاؤنٹر میں مارے گئے تھے۔ پولیس کے جھوٹ کی قلعی اخبارات کے ذریعے لوگوں تک پہنچتی رہی کیونکہ وہ ہاتھ پیر بندھی لاشوں کی تصاویر نمایاں طور پر چھاپتے رہے۔ اس دوران مختلف اخبارات کے اسپیشل سپلیمنٹ ہاکروں کے ذریعے لوگوں تک پہنچا کرتے تھے۔ یعنی ''اندھیر نگری چوپٹ راجہ'' کے مصداق حماقتیں سامنے آتی رہیں۔ لوگوں کا گھر سے نکلنا دوبھر تھا، کبھی بسوں کو حملوں کا نشانہ بنایا جا رہا تھا تو کہیں پر ہجوم لوگوں پر فائر کھول دیئے جاتے تھے مگر ملزمان کبھی نہیں پکڑے گئے۔ خوف اور دہشت کے باعث شادیاں سر شام ہی نمٹائی جاتی رہیں۔ شام کے بعد گھر سے لوگوں نے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ روشنیوں کا شہر کراچی سوگ، ماتم، خوف

اور اندھیروں میں ڈوب گیا تھا۔ محفلیں ویران تھیں ۔ سڑکوں پر موت کا رقص جاری تھا۔ شادی بیاہ اور موت میت میں بھی لوگوں کی شرکت برائے نام رہ گئی تھی ۔ وفاق میں بیٹھے حکمران غیر ملکی میڈیا کو لاء اینڈ آرڈر کے متعلق غلط انداز میں بریفنگ دیا کرتے تھے ۔ کراچی کی صورتِ حال کو دو گروپوں کی لڑائی کہہ کر اپنی جان چھڑاتے رہے جبکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ کراچی کی مانگ وفاق نے ہی اجاڑی تھی یعنی کوی کالی داس جس شاخ پر بیٹھا تھا وہی شاخ کاٹ رہا۔

۱۹۹۲ء سے آپریشن کے دوران اور اس کے بعد اس شہر کی تعمیر و ترقی کو بریک لگ گیا تھا، غیر یقینی صورتِ حال کے باعث یہاں سے کئی انڈسٹریز پنجاب میں شفٹ ہوگئیں تھیں جس کے سبب بیروزگاری میں زبردست اضافہ ہوگیا تھا، نوجوان بیروزگاری اور تعلیمی اداروں کی زبوں حالی کے باعث محلوں اور فٹ پاتھوں پر بیٹھے وقت گزارہ کرتے، کئی نوجوانوں نے انہی وجوہات کی بناء پر خود کو نشے میں ڈبو دیا۔ کئی نوجوان دہشت گردوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ معمولی پیسوں اور اسلحہ کے لالچ میں انہوں نے حکومتی دہشت گردوں کے ساتھ مل کر اپنے ہی دوستوں کا خون کر دیا۔ بے شمار نوجوان حکومت کے عتاب سے بچنے کے لئے مختلف مذہبی جماعتوں میں شامل ہوگئے، اس طرح بیک وقت نوجوان نسل کئی محاذ پر تقسیم ہوگئی ۔ یہ ایک خوفناک صورتِ حال تھی جس کا خمیازہ معاشرے کو کئی عرصے تک بھگتنا پڑا اور مستقبل میں بھی بھگتنا ہی پڑے گا۔

''انور بیٹا! شام کو جلدی آنا تمہاری پھپھو کے یہاں جانا ہے۔'' خورشید بانو نے بیٹے کو دفتر جاتے ہوئے تاکید کی۔

''کیوں خیریت تو ہے نا۔'' اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''فوزیہ کی طبیعت کئی دنوں سے خراب چل رہی ہے۔ اور کافی دنوں سے وہاں جانا بھی نہیں ہوا، سوچا آج اس سے مل آئیں۔'' خورشید بانو نے جواب دیا۔

''کیسے جائیں گے۔ گاڑی تو ابو کے پاس ہوگی۔'' اس نے پوچھا

''تم اپنی گاڑی لے لینا۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''مگر امی میری گاڑی بالکل نئی ہے، ابھی پچھلے ماہ تو خریدی ہے۔ پھپھو نئی کراچی میں رہتی ہیں وہ علاقہ ویسے ہی

حساس ہے۔ مجھے ڈر لگتا ہے''۔ انور نے وضاحت کی۔

''بیٹا اللہ نگہبان ہے۔ جلدی جا کر جلدی آ جائیں گے۔'' امی نے حکم صادر کیا۔

انور شام پانچ بجے گھر پہنچ گیا۔ چائے پینے کے بعد خورشید اور انور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ارم نے ساتھ جانے کی ضد کی مگر خورشید بانو نے ساتھ لے جانے سے منع کر دیا کیونکہ حالات خراب تھے وہ بیٹی کو ساتھ لے جا کر کوئی پریشانی مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ انور نے کرولا کو اسٹارٹ کیا پھر دونوں ماں بیٹے نیو کراچی کی طرف روانہ ہوئے۔ شام ساڑھے چھ بجے کے قریب وہ دونوں فوزیہ کے گھر پہنچے۔ ان سب سے ملنے کے بعد انور اور خورشید رات آٹھ بجے ان کے گھر سے واپسی کے لئے نکلے۔

واپسی پر انور نے لیاقت آباد کی طرف سے آنے کی بجائے سہراب گوٹھ سے نارتھ کراچی کا راستہ اختیار کیا۔ حیدری کی طرف سے ناظم آباد پھر سید ھا بندر روڈ سے صدر کا شیڈول ترتیب دے کر گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ اس نے سہراب گوٹھ سے واٹر پمپ اور واٹر پمپ سے سخی حسن کا راستہ اختیار کیا چونکہ آپریشن جاری تھا، جگہ جگہ فوجی، رینجرز اور پولیس کے دستے موجود تھے۔ اسٹریٹ لائٹس بھی روشنی سے محروم تھیں۔ اس زمانے میں نوجوان لڑکے اکیلے باہر نکلتے ہوئے ڈرتے تھے۔ گھر والے اپنے بچوں کو بلا ضرورت باہر نکلنے سے روکتے تھے اگر زیادہ ضروری ہوا تو خواتین لڑکوں کے ساتھ سفر کیا کرتی تھیں تا کہ ان کے بچوں کو پولیس تنگ نہ کرے۔ جونہی کرولا ڈی سی سینٹرل کو کراس کر چکی تو اچانک کئی پولیس والوں نے سامنے سے گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ انور نے گاڑی روک دی۔

''گاڑی سائیڈ پر کرو۔'' ایک پولیس والے نے حکم دیا۔

''کیوں کیا ہوا؟'' خورشید بانو نے سوال کیا۔ پولیس والے نے غور سے خورشید بانو کو دیکھا

''ڈگی کی چابی دو''۔ دوسرے پولیس والے نے کہا انوار نے گاڑی کی چابی اس کے حوالے کی، پہلا پولیس والا اس کے قریب آیا

''گاڑی کے کاغذات دکھاؤ'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔ انور نے گاڑی کے کاغذات اس کو دکھائے ۔اس نے کاغذات دیکھنے میں پانچ سے سات منٹ لگا دیئے۔

''ٹھیک ہے جاؤ'' دوسرے پولیس والے نے ڈگی بند کرتے ہوئے کہا۔انور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔اس نے گاڑی روڈ سے گزارنے کی بجائے اندر گلی سے گاڑی گزارنے لگا۔وہ گاڑی چلاتے ہوئے اچانک رک گیا۔''کیا بات ہے؟ گاڑی کیوں روک دی''۔خورشید بانو نے پریشانی کے عالم میں پوچھا

''مجھے ڈگی سے کچھ آوازیں آرہی ہے جیسے کوئی وزن ہو''انور نے تشویش سے کہا

''ایک منٹ، میں چیک کر لیتا ہوں آپ بیٹھی رہیں''اس نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا

''اونو یہ کیا؟ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پولیس والوں کی حرام زدگی ہے''۔وہ خود ہی خود بڑبڑانے لگا۔خورشید بانو بھی گاڑی سے اتر کر ڈگی کی طرف آئی۔

''یہ کیا؟ اس کی چیخ نکل گئی''۔گاڑی میں ایک لاش پڑی تھی۔کوئی نوجوان لڑکا تھا جس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے،خوف کی ایک لہر خورشید بانو کے جسم میں دوڑ گئی۔

''اب کیا ہوگا ہم مصیبت میں آجائیں گے''۔خورشید بانو نے دبی آواز میں کہا۔

''کچھ نہیں ہوگا، آپ فکر نہ کریں''انور نے امی کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی

''ذرا میری مدد کریں۔آپ اس کی ٹانگیں پکڑ لیں میں دھڑ سے نیچے اتارنے کی کوشش کرتا ہوں''۔انور نے نوجوان کو باہر کھینچنا شروع کیا، عام حالت میں خورشید بانو کسی لاش کو ہاتھ لگانے کا تصور بھی نہیں کرتی مگر بیٹے کی جان خطرے میں دیکھ اس نے یہ کام بھی کر لیا

''چلیں جلد بیٹھیں میں گاڑی اسٹارٹ کرتا ہوں''۔اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی، وہ گاڑی گلی سے نکال کر مین روڈ پر لے آیا اور تیزی سے ناظم آباد کی طرف بڑھتا چلا گیا۔دہشت اور ڈر کی وجہ سے اس کا پسینہ بہہ رہا تھا خورشید بانو کی حالت الگ خراب تھی۔

''اللہ تیرا شکر ہے! ہم ایک بڑی مصیبت سے بچ گئے، آئندہ ہم کبھی بھی رات کے وقت اس طرف نہیں آئیں گے۔''اس نے کانپتے ہوئے بیٹے سے کہا۔

''پتہ نہیں ان حرام کے پلے پولیس والوں نے کتنے نوجوانوں کو لاشوں کے چکروں میں پھانس کر بے گناہ جیلوں میں ڈلوایا ہوگا، خدا انہیں غارت کرے''خورشید بانو نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دہائی دی

''انشاءاللہ ایک دن ایسا ہی آئے گا کہ یہ لوگ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگیں گے'' انور نے جواباً کہا

خدا خدا کر کے رات دس بجے وہ دونوں گھر پہنچے۔ انور اور خورشید کی اڑی اڑی رنگت سے حفیظ پریشان ہوگیا وجہ پوچھنے پر خورشید نے تمام روداد سنائی۔ واقعہ جاننے کے بعد حفیظ نے تاکید کی کہ آئندہ کوئی بھی رات کے وقت باہر نہیں جائے گا، خاص طور پر گاڑی لے جانے پر پابندی لگادی۔

سنئے! اب میرا دل اس شہر سے اچاٹ ہوگیا ہے چلو ہم بھی پنجاب چلتے ہیں، خورشید بانو نے حفیظ سے کہا

''کوئی فائدہ نہیں! اردو بولنے والوں کو اتنا بدنام کیا گیا ہے کہ انہیں کوئی بھی صوبہ قبول نہیں کرے گا، اردو بولنے والے خواہ پیپلز پارٹی میں ہوں، جماعت اسلامی سے ہوں یا مسلم لیگ سے وہ سب کے سب مہاجر ہی کہے جاتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت دی گئی ان کی قربانیاں سب کی سب ضائع ہوگئی ہیں، ان کی شخصیت، ان کا کردار سب کچھ مشکوک ہو کر رہ گیا ہے۔ اب کچھ بچا ہی نہیں'' حفیظ نے مغموم ہوتے ہوئے کہا

''یہ اچھا نہیں ہوا، اس سے ہمیں ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے'' خورشید بانو نے لمبی سانس بھرتے ہوئے کہا

''پتا نہیں اس شہر میں کب سکون قائم ہوگا کب ہم اس شہر کو روشنیوں میں منور دیکھیں گے، روز روز کے ڈر اور خوف نے میرے اعصاب کو بہت متاثر کیا ہے'' حفیظ نے پیروں کو سکیڑتے ہوئے بیوی کی طرف دیکھا جو بستر کی چادر درست کر رہی تھی

''پڑوسن شمیم باجی بتا رہی تھیں کہ اس کی نند نے اپنی بیٹی کا رشتہ ختم کر دیا ہے کیونکہ لڑکا ایم کیو ایم میں تھا اور پولیس اس کو پکڑنے کے لئے چھاپے مار رہی تھی، وہ بلاوجہ مصیبت میں پڑ جاتی اس لئے یہ قدم اُٹھایا''۔ خورشید نے یہ خبر بتاتے ہوئے کہا

''ایسے کئی واقعات اورنگی ٹاؤن اور بلدیہ ٹاؤن میں بھی پیش آئے ہیں، والدین نے اپنی بیٹیوں کی شادیاں بھی ختم کر دی ہیں کئی لڑکیاں طلاقیں حاصل کر چکی ہیں، معاشرے میں یہ مسائل بھی پیدا ہو چکے ہیں نہ جانے حالات کس رخ پر جانے والے ہیں'' حفیظ نے تشویش ظاہر کی۔

''میرا خیال ہے انور کی شادی کر دی جائے کئی لڑکیاں میری نظروں میں ہیں'' خورشدید بانو نے خواہش ظاہر کرتے ہوئے کہا

''ابھی کچھ عرصے ٹھہر جاؤ۔ حالات بہتر ہوتے ہی یہ فرض بھی انجام دے دیں گے'' حفیظ نے خورشید کی بات رد کرتے ہوئے کہا۔

کالج کی چھٹیاں ہوگئیں تھیں ارم اور انور شہر کی بگڑتی صورتحال سے تنگ آ چکے تھے۔ زندگی میں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ وہی خون و غارت گری وہی رینجرز اور پولیس کی زیادتیاں وہی حکومت کی بے حسی اور نا انصافی اس یکسانیت نے جمود سا پیدا کر دیا تھا۔

''امی! کچھ دنوں کے لئے اسلام آباد چلتے ہیں یہاں رہ کر کافی بوریت محسوس ہونے لگی ہے ہوسکتا ہے مقام کی تبدیلی سے ذہن پر اچھا اثر پڑے'' انور نے تجویز پیش کی

''تجویز معقول ہے، میں بھی یہی چاہتی ہوں'' خورشید بانو نے حامی بھرتے ہوئے حفیظ کو بڑی مشکل سے راضی کیا لہٰذا وہ چاروں شالیمار کے ذریعے لاہور پہنچے اور لاہور سے بس کے ذریعے پنڈی روانہ ہوئے۔ پنڈی میں انہوں نے پریس کلب کے پاس ایک ہوٹل میں قیام کیا، ایک دن آرام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد گئے وہاں شاہ فیصل مسجد، مارگلہ ہل، دامن کوہ اور شکر پڑیاں کی سیر کی۔ اس کے بعد مری جانے کا پروگرام بنایا۔ مری جانے کے لئے انہوں نے ایک کار کرائے پر لی اور مری روانہ ہوئے۔ مری میں پیڑیاٹہ میں چیئر لفٹ کے ذریعے لطف اندوز ہوئے، واپسی پر رات ہوگئی تھی لہٰذا مری کے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ اگلی صبح وہ سب پیدل ہی مری کی سیر کا لطف اٹھانے کے لئے نکل گئے، تھوڑی دیر تک پیدل چلنے کے بعد ایک ہوٹل میں چائے پینے بیٹھ گئے۔

''آپ کراچی سے آئے ہیں''۔ ایک صاحب نے حفیظ سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں'' حفیظ نے مختصر جواب دیا۔

''مہاجر ہو'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں پاکستانی ہوں'' حفیظ نے جل کر کہا۔

''میرا مطلب وہ نہیں جو آپ سمجھے ہیں، ہم پنجاب میں رہتے ہیں ہم پنجابی ہیں۔ آپ کہاں کے رہنے والے ہیں'' اس نے حفیظ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''ہم سندھ کے رہنے والے ہیں اور سندھی ہیں''۔ اس نے ناگوری سے جواب دیا۔ اس شخص نے حفیظ کی ناگواری کو محسوس کی اور خاموشی سے چلا گیا

''یہ لفظ مہاجر یہاں بھی ہمارا پیچھا کر رہا ہے'' خورشید بانو نے چڑ کر کہا

''یہ لفظ تو ہمیشہ سے ہی ہمارے لئے استعمال ہوتا رہا ہے کوئی نئی بات نہیں ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اب عام ہو گیا ہے'' حفیظ نے وضاحت کی۔

''تم نے دیکھا نہیں لاہور اسٹیشن پر پولیس والے شکاریوں کی طرح کراچی یا حیدر آباد سے آنے والے لڑکوں کی جامع تلاش لے رہے تھے جیسے سارا جرم وہ ہی کر کے آئے تھے، یہاں کے نوجوان تو جیسے دودھ کے دھلے ہیں'' حفیظ نے خورشید بانو کی طرف دیکھتے ہوئے یاد دلایا۔

''ابو ہم یہاں انجوائے کرنے آئے تھے یہاں بھی کم و بیش وہی حالات ہیں جیسے کراچی میں ہیں۔ کیا اب ہماری پہچان یہی رہ گئی ہے''۔ انور نے دکھ بھرے انداز میں پوچھا

''ہاں بیٹا معاشرے کے اس زخم کو ہمیں برداشت کرنا ہوگا، اس کے سوا کوئی چارا نہیں ہے'' حفیظ نے بیٹے کو سمجھایا۔ خنکی بڑھ گئی تھی لہٰذا انہوں نے مری کے بازار سے کچھ گرم کپڑے خریدے اور اسلام آباد واپسی کی تیاری کرنے لگے۔

وہ لوگ شام چار بجے تک پنڈی واپس پہنچے اس دن انہوں نے آرام کیا پھر اگلی صبح پنڈی باڑہ مارکیٹ سے انہوں نے کپڑے اور سوئٹرز خریدے دوپہر کا کھانا انہوں نے باہر ہوٹل میں کھایا مزید ایک دن قیام کرنے کے بعد وہ سب بس کے ذریعے لاہور پہنچے۔ لاہور اسٹیشن کے قریب ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے یہاں تین دن قیام کے دوران انہوں نے شالیمار باغ، بادشاہی مسجد، مینار پاکستان کی سیر کی۔ دس دن پنجاب میں گزارنے کے بعد انہوں نے کراچی واپسی کا پروگرام بنایا۔ بارہ دن بعد وہ کراچی پہنچے تو کسی حد تک ہشاش بشاش تھے کیونکہ وہاں کسی قسم کی کوئی ٹینشن نہیں تھی لہٰذا صحت بھی اچھی ہوگئی تھی ارم کے کالج کھلنے میں ابھی کافی دن باقی تھے۔ انور نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ حفیظ کی دکان اس کے اسلام آباد جانے کی وجہ سے متاثر ہوگئی تھی لہٰذا اس نے دوبارہ محنت شروع کر دی اور اس کا ازالہ کر دیا تھا۔ وقت گزرتا رہا۔

خورشید بانو کوانور کی شادی کی فکر ہوگئی تھی وہ ہر دوسرے تیسرے روز حفیظ کوشادی کیلئے رضامند کرنے کی کوشش کرتی مگر پتہ نہیں کیوں حفیظ شادی کے ذکر کو نظرانداز کرتا رہا۔اس کا ایک ہی جواب ہوتا کہ''ابھی ٹھہر جاؤ''۔ شوہر کے اس جواب سے خورشید بانو کچھ چڑ سی گئی تھی ۔فوجی آپریشن کے بعد شہر میں جعلی پولیس مقابلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ لوگ اپنے بچوں کو غیر ضروری طور پر باہر نہیں بھیجتے تھے۔حفیظ نے انور کو بھی سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ دفتر سے سیدھا گھر پہنچ جائے۔کسی اور جگہ جانے کی کوشش نہ کرے۔کبھی کبھار انور کو دفتر سے آنے میں پندرہ بیس منٹ کی دیر ہو جاتی تو خورشید بانو کا خوف کے مارے برا حال ہو جاتا۔اس خوف اور شہر کے ماحول نے بہت سے لوگوں کو شوگر اور بلڈ پریشر کا مریض بنا دیا تھا۔خورشید بانو کو بھی بلڈ پریشر ہائی رہنے لگا تھا۔وہ مسلسل ڈاکٹروں کے پھیرے لگاتی رہتی مگر آرام نہیں تھا شہر کے کچھ علاقے نوگو ایریا بن گئے تھے۔خوشی اور غمی میں ان علاقوں میں جانا جان جوکھوں کا کام تھا۔کئی خاندان ان وجوہات کی بناء پر تقسیم ہو گئے تھے ۔انتظامیہ سب کچھ دیکھنے اور جاننے کے باوجود اندھی بہری تھی ہر روز تین چار نوجوان لازمی طور پر انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بن رہے تھے مختلف مقامات پر تشدد شدہ لاشیں بوریوں میں بند برآمد ہو رہی تھیں مگر کوئی پرسان حال نہیں تھا نوجوانوں کی نسل کشی کا کام جاری تھا۔خواہ ان نوجوان کا تعلق ایم کیو ایم سے یا کسی اور تنظیم سے ہو بہرحال مہاجر نوجوانوں کی تعداد گھٹتی جا رہی تھی۔والدین اپنے جوان بچوں کا لاشہ اٹھاتے اٹھاتے تھک چکے تھے ان کی نگاہیں آسمان کی طرف بے بسی سے اٹھ جاتیں۔

''خورشید شام کو تیار رہنا میں جلدی گھر آؤں گا، ہاں انور کو بھی فون کر دینا کہ وہ پانچ بجے تک گھر پہنچ جائے نصیر آباد تک جانا ہے''۔حفیظ نے گھر سے نکلتے ہوئے بیوی سے کہا۔

''کیوں کہاں جانا ہے؟''اس نے حیرت سے پوچھا۔

''بھول گئیں، ہمیشہ انور کی شادی کے متعلق کہتی رہتی ہو آج شام وہاں لڑکی دیکھنے جانا ہے''۔حفیظ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کون لوگ ہیں ۔کہاں کے رہنے والے ہیں''۔خورشید بانو نے اپنے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

''مدنی صاحب کی چھوٹی بیٹی ہے۔اس سال بی اے پاس کر چکی ہے۔اچھی خوش شکل ہے۔ان کے آباؤاجداد کا تعلق علی گڑھ سے ہے۔مدنی صاحب ہمارے بڑے اچھے کلائنٹ ہیں''۔حفیظ نے گھر سے نکلتے ہو کہا اور چلے گئے۔

خورشید نے فوراً انور کو دفتر میں فون کیا اور تمام تفصیل بیان کی پھر شام کو جلد گھر آنے کیلئے کہا۔

ارم بھی ساتھ جانے کیلئے مچل گئی لہٰذا خورشید نے اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا۔شام کو انور بھی جلدی گھر پہنچ گیا۔حفیظ 4 بجے ہی پہنچ چکا تھا لہٰذا وہ چاروں تیار ہو کر انور کی کرولا کار میں نصیر آباد کے لئے روانہ ہوئے۔انور گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا حفیظ اس کی برابر والی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا جبکہ ارم اور خورشید بانو پچھلی نشست پر آرام سے بیٹھی باہر کا نظارہ کر رہی تھیں۔تین ہٹی کراس کرنے کے بعد خورشید بانو نے حفیظ سے کہا کہ وہ گاڑی راستے میں کہیں روک کر مٹھائی کا ڈبہ خرید لے''میں نے مٹھائی کا ڈبہ پہلے ہی لے لیا ہے''انہوں نے اپنے ہاتھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا یعنی مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہاتھوں میں موجود تھا تقریباً چالیس منٹ بعد وہ نصیر آباد مدنی صاحب کے گھر پہنچے،ان کا مکان دومنزلہ چھوٹا سا مگر خوبصورت تھا۔حفیظ نے بیل بجائی مدنی صاحب نے دروازہ کھولا انہوں نے ان چاروں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور خود اندر چلے گئے۔
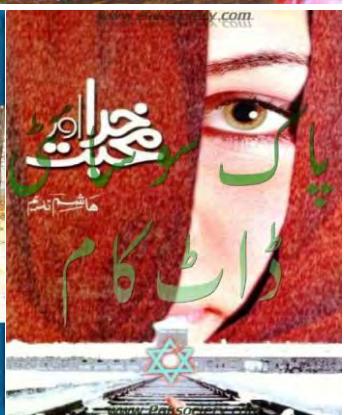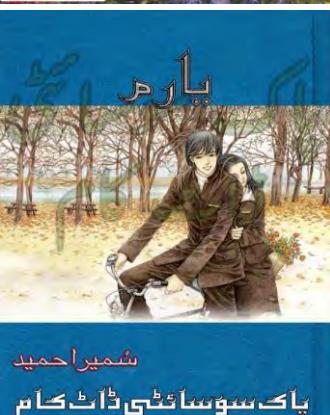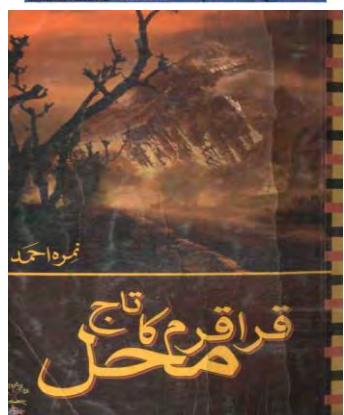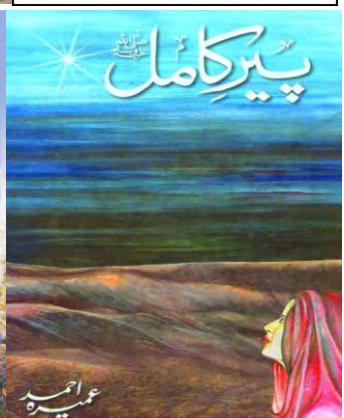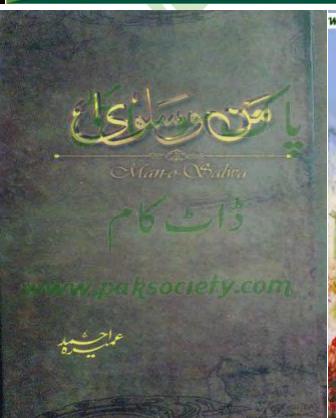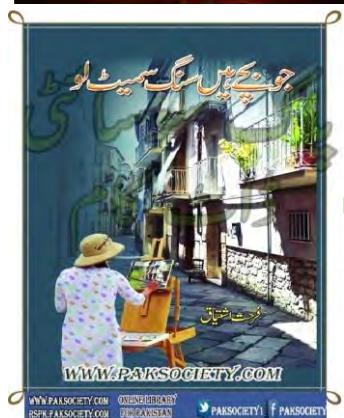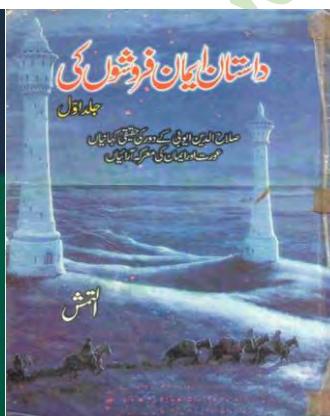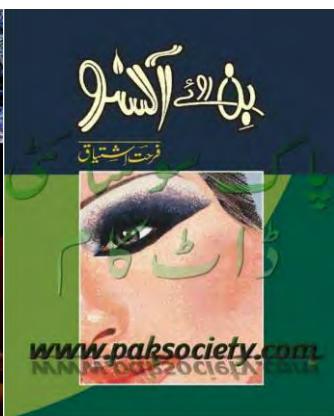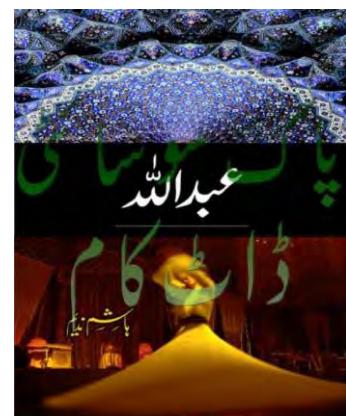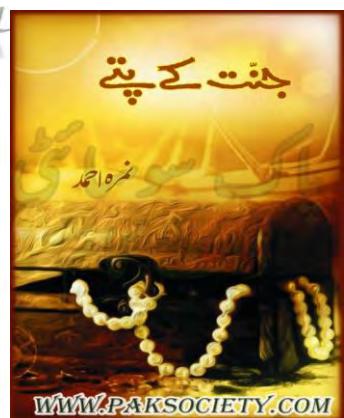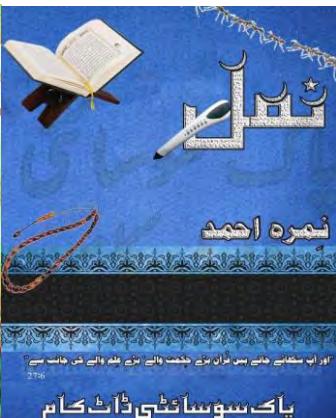
''السلام وعلیکم!''ایک ادھیڑ عمر عورت نے ڈرائنگ روم میں آتے ہوئے کہا وہ مدنی صاحب کی بیگم سلمیٰ تھی خورشید بانو بھی اس سے تپاک سے ملی کافی دیر تک غیر رسمی باتیں ہوتیں رہیں تھوڑی دیر بعد ایک نازک اندام سی لڑکی ٹرے دھکیلتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

''آداب''اس نے آتے ہی کہا اور چائے کا سامان میز پر سجانے لگی

''کیا نام ہے بیٹا آپ کا''؟ خورشید بانو نے پیار سے پوچھا۔

''کرن''اس نے نظریں نیچے کئے ہی جواب دیا ارم اور انور نے بھی اسے پسندیدگی سے دیکھا

آجکل کیا مصروفیات ہیں؟ حفیظ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''کمپیوٹر کورس کر رہی ہوں''اس نے انور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا خیر یہ تو اچھی بات ہے کمپیوٹر کا زمانہ ہے اسے سیکھ ہی لینا چاہیے حفیظ نے مدنی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

''صاحب زادے آپ کیا کرتے ہیں'' مدنی صاحب نے انور سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں ٹیلی فون ایکسچینج میں ایس۔ڈی۔او۔ہوں'' انور نے مختصر جواب دیا۔

''کسی تنظیم سے وابستگی تونہیں'' انہوں نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔

''نہیں میں ان چکروں سے ہمیشہ دور ہی رہا'' انور نے انہیں مطمئن سے کیا۔

''یہ تمام باتیں پہلے ہی سے معلوم کرنا ضروری ہیں کیونکہ بیٹی کا مسئلہ ہے میں نہیں چاہتا کہ میری بیٹی جس گھر میں جائے وہاں آگے چل کراس کیلئے کوئی پریشانی پیدا ہو''۔ مدنی صاحب نے وضاحت کی۔

''آپ بےفکر رہیں ایسی کوئی بات نہیں کہ آپ کے لئے کوئی مصیبت کھڑی ہو جائے'' حفیظ نے مدنی صاحب کی تشویش کو دور کرنے کی کوشش کی۔ دونوں گھرانے جب ہر طرح سے مطمئن ہو گئے تو رشتے کی بات پکی ہو گئی خورشید بانو نے مٹھائی اور ایک ہزار روپے لڑکی کے ہاتھ میں رکھے۔ مدنی صاحب کے گھر والوں نے مٹھائی کھلائی اس طرح یہ رسم بھی ہوگئی۔ منگنی کی رسومات میں پڑنے کی بجائے شادی کی بات طے کر دی گئی ۔باہمی رضامندی کے ذریعے شادی کی تاریخ کرنے کا فیصلہ ہوا تھوڑی دیر وہاں رکنے کے بعد وہ لوگ واپس گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مدنی صاحب کو بھی انہوں نے اپنے گھر دو تین دن بعد مدعو کر لیا واپسی پر خورشید بانو اور ارم بہت خوش تھیں کیونکہ اب ان کے گھر بھی شادی ہونے والی تھی۔ بہت عرصے بعد ایک خوشی کا موقع آنے والا تھا۔ ''سنیئے! سمیر کو فون کر دیجیئے گا تا کہ وہ بھی شادی میں شرکت کے لئے پاکستان آ سکے'' خورشید بانو نے حفیظ سے کہا۔

''ہاں یہ تو ٹھیک ہے مدنی صاحب دو دن بعد اپنی بیگم کے ساتھ ہمارے گھر آ رہے ہیں جب وہ گھر دیکھ کر مطمئن ہو جائیں گے تو شادی کی تاریخ مقرر ہو گی پھر ہم سمیر کو دبئی سے بلوالیں گے ابھی عجلت سے کام مت لو''۔ حفیظ نے سمجھاتے ہوئے کہا

دو دن بعد مدنی صاحب اور ان کی بیگم سلمیٰ حفیظ کے گھر آئے انہوں نے ان کے فلیٹ کو دیکھا اور ان کے رہن سہن سے ان کے ماحول کا اندازہ لگایا۔ گھر بار دیکھنے کے بعد انہیں کرن کی شادی انور سے کرنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا۔ لہٰذا ایک ماہ بعد شادی کی تاریخ طے ہوئی اب خورشید بانو کی مصروفیات بڑھ گئیں بازار سے

خریداری کرنا پھر مختلف شادی کے جوڑوں کی پیکنگ کرنا کافی دنوں تک یہی ہوتا رہا زیورات خریدے گئے۔ سمیر شادی سے ایک ہفتے پہلے دبئی سے کراچی پہنچا۔ وہ بھی بہت ساری شادی بیاہ کی چیزیں دبئی سے خرید کر لایا تھا۔ دبئی جا کر سمیر کی صحت بھی کافی اچھی ہوگئی تھی وہاں رہ کر اس میں اعتماد پیدا ہوگیا تھا۔ گفتگو بھی نپے تلے انداز میں کرتا تھا۔

آج شادی تھی۔ سبزہ زار میں شادی رکھی گئی تھی۔ خورشید بانو کے تمام رشتہ دار کراچی آچکے تھے حفیظ کے بھائی بھی حیدرآباد سے کراچی پہنچ چکے تھے اس طرح تمام لوگوں نے مل کر شادی کے تمام انتظامات سنبھال لئے تھے۔

شہر کی صورت حال چونکہ اکثر بگڑ جاتی تھی اس لئے بارات وقت مقررہ پر پہنچی اور رات گیارہ بجے تک دلہن کو گھر لایا گیا یہ شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ دونوں گھرانے خوش تھے۔ دو دن بعد ولیمہ تھا ولیمہ گھر کے قریب رکھا گیا تھا۔

دو دن بعد ولیمہ بھی ہوگیا کرن اور ارم کی دوستی اچھی خاصی ہوگئی تھی کرن ایک سگھڑ اور کوآپریٹو لڑکی تھی اس نے حفیظ کے گھر آتے ہی سب کے دل جیت لئے تھے اس سے سب ہی خوش اور مطمئن تھے۔ شادی کے ایک ماہ بعد سمیر واپس دبئی چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد گھر میں کچھ دنوں تک اس کی کمی محسوس ہوتی رہی پھر حالات معمول پر آنے لگے انور کی شادی 1995ء میں ہوئی تھی۔ اس کے تین سال بعد سمیر کی شادی بھی کرن کی خالہ زاد بہن لائبہ کے ساتھ ہوگئی تھا وہ اپنی بیوی لائبہ اور بیٹی ماہم کے ساتھ دبئی میں ہی مقیم رہا۔

حفیظ نے ٹی وی آن کیا آج 8 اکتوبر زلزلے کو گزرے ایک سال کا عرصہ بیت چکا تھا۔ اس حوالے سے مختلف چینلز پروگرام پیش کر رہے تھے مظفرآباد، باغ، بالاکوٹ اور مانسہرہ میں ہونے والی تباہی سمیت کافی علاقوں میں مختلف سیاستدانوں کے تاثرات اور ان کے امدادی کاموں کے متعلق گفتگو بھی ہو رہی تھی۔ ان ہی میں ایم کیو ایم یعنی متحدہ قومی موومنٹ کے سرکردہ شخصیات سے بھی بات چیت ہو رہی تھی۔ یہ بات چیت مظفرآباد سے براہ راست دکھائی جارہی تھی اب متحدہ نے سندھ سے نکل کر پنجاب، سرحد اور کشمیر تک رسائی حاصل کرلی تھی۔ ان کے کئی وزراء وفاق اور صوبے میں اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔ شہر کا ناظم بھی متحدہ کا ایک سرگرم

نوجوانوں ہے۔جس کے عزم و ولولے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ متحدہ دہشت گرد تنظیم کا نہیں بلکہ کام کرنے والوں کی ایک ایسی تنظیم ہے جس نے نامساعد حالات کا مقابلہ کرنے کے بعد یہ مقام حاصل کیا۔

''بیٹا !ٹی وی کے سامنے سے ہٹ جائیں''۔حفیظ نے اپنے دس سالہ پوتے ندیم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

آج انور کے دو بیٹے بڑا ندیم اور چھوٹا عمران، دونوں بچے اسکول میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

ٹی وی دیکھتے ہوئے حفیظ نے اپنا سر صوفے سے ٹکا کہ آنکھیں بند کر لیں اسے بیتے دن یاد آنے لگے۔جس میں تلخیاں ہی تلخیاں تھیں وحشت، خوف اور دہشتگردی اس شہر کا معمول تھے مگر آج سکون تھا گزرے بیس سالوں کی تلخ یادیں ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہو رہی تھیں اس نے شکر ادا کیا کہ کم از کم اب اس کے پوتوں کو ان دیکھے دشمنوں سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ایک طویل جدوجہد اور ہزاروں قربانیوں کے سلسلے میں یہ دن نصیب ہوئے۔ایک قومی سانحے یعنی زلزلے نے تمام قوم کو متحد کر دیا تھا۔رنگ، نسل اور قومیت سے بالاتر ہو کر لوگوں نے امدادی کاموں میں مدد دی۔

''اے اللہ! یہ قوم ہمیشہ ایسی ہی متحد رہے اور اسی طرح سب کے دکھ درد کو محسوس کرے۔نسلی امتیاز کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آپس کے اختلافات کو ختم کر دے''۔حفیظ نے زیرلب بڑبڑاتے ہوئے دعا کی۔دعا کرتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

8 اکتوبر 2006ء

''روپ بہروپ''

شام کو دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں سیدھی آرٹس کونسل چل دی آج یہاں فوٹو گرافی کی نمائش تھی اس نمائش میں اخبارات سے تعلق رکھنے والے چند فوٹو گرافروں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں سربراہ مملکت کے غیر ملکی دوروں پر مبنی تصاویر کے علاوہ بے شمار لائٹ اینڈ شیڈ فوٹو گرافرز کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ یہ تصاویر رنگین بھی تھیں اور بلیک اینڈ وائٹ بھی۔۔!

میرا تعلق ایک مقامی اخبار سے تھا اور میں رپورٹنگ کی غرض سے یہاں آئی تھی۔ آرٹس کونسل میں داخل ہوتے ہی میری نظر سیما پر پڑی جو کافی دیر سے میرا انتظار کر رہی تھی سیما کا تعلق ایک ویکلی میگزین سے تھا وہ مجھے دیکھتے ہی لپکی۔

''ہیلو عاشی! اتنی دیر کہاں لگا دی؟ میں تو تمہار طرف سے بالکل ہی مایوس ہوگئی تھی۔'' اس نے گھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بات پوری کی۔

''سوری سیما! دراصل ایک انٹرویو مکمل کرنا تھا جو پرسوں چھپے گا ورنہ مشکل ہو جاتی۔'' میں نے صفائی پیش کی۔

''چلو خیر کوئی بات نہیں۔ ویسے عاشی ساری تم نے خوب باندھی ہے۔ بہت کھل رہی ہے۔ آخر کیا چکر ہے۔'' اس نے کریدنا چاہا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی اور سیما کو بغور دیکھا۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ میرے لبوں تک آئی پھر معدوم ہوگئی۔

''چکر!۔۔اب ہماری زندگی میں چکر کا کیا عمل دخل۔ مجھے نت نئے، خوبصورت کپڑے بنوانے اور پہننے کا خبط ہے، بس اتنی سی بات ہے۔'' میں نے سیما کو اطمینان دلا دیا۔

اس کے بعد ہم دونوں اوپر ہال کی طرف روانہ ہوئے جہاں تصاویر آویزاں کی گئی تھیں۔ یہاں اچھا خاصا ہجوم تھا۔ ان میں زیادہ تر لوگ میرے شناسا تھے۔ ہر ایک سے باری باری علیک سلیک ہوتی رہی۔ بے دھیانی میں، میں نے پرس سے ''ٹرپل فائی'' کا غیر ملکی سگریٹ نکال کر سلگایا اور ہونٹوں تلے دبا لیا۔ پھر کش پہ کش لیتی رہی۔ اپنی اس حماقت کا احساس اس وقت ہوا جب شاہد کو میں نے اپنے مدمقابل خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے

پایا۔ اس نمائش میں شاہد نے بھی حصہ لیا تھا اور ان کی تصاویر کافی پسند کی جارہی تھیں۔ شاہد کو دیکھتے ہی بوکھلاہٹ میں، میں نے سگریٹ کو بالکونی سے نیچے پھینک دیا۔

''عاشی! اب پھینکنے سے کچھ حاصل نہیں۔ کئی بار منع کرنے کے باوجود تم مسلسل سگریٹ نوشی کر رہی ہو۔ آخر تم سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں۔ دھان پان سی تمہاری جان ہے اس پر سگریٹ نوشی ضرر رساں ہے۔ کبھی تو کسی کا مشورہ قبول کرلو۔ تم بہت ہی زیادہ ضدی لڑکی ہو۔ اپنی اس عادت کو ترک کردو۔ ورنہ پچھتاؤ گی۔'' ایک ہی سانس میں شاہد نے کئی جملے کہے۔

پھر پندرہ بیس منٹ تک وہ مجھے مختلف تصاویر دکھاتے اور سمجھاتے رہے۔ ان کی تفصیلات بتائیں اس تمام عرصے میں ان کا موڈ آف رہا۔ تفصیلات مکمل ہونے کے بعد مجھ سے کہنے لگے۔

''چلو آؤ میرے ساتھ۔ میں تمہیں اپنے بچپن کے چند دوستوں سے ملوادوں۔''

سیما اپنی ایک اور دوست کے ساتھ نہ معلوم کہاں گم ہوگئی تھی جو مجھے نظر ہی نہ آسکی میں شاہد کے ساتھ اسے تلاش کرتی ہوئی ان کے دوستوں تک پہنچ گئی مجھے دیکھتے ہی وہ اخلاقاً اٹھ کھڑے ہوئے۔

''یوسف! ان سے ملو۔ یہ ہماری پیاری سی گڑیا عاشی ہے۔ بظاہر تیز وطرار نظر آتی ہے، مگر ہے نہیں۔ بہت سادہ اور معصوم ہے۔'' شاہد نے مجھے پیار سے دیکھتے ہوئے میرا تعارف کرایا۔

یوسف صاحب نے بڑی گہری نظروں سے میرے سراپے کا جائزہ لیا اور شاہد سے مخاطب ہوئے۔

''شاہد، واقعی تمہاری گڑیا بہت سوئٹ ہے بقول تمہارے، اسٹائلش بھی۔''

یوسف صاحب کی یہ تعریف مجھے کچھ اچھی نہ لگی، خاص طور پر سوئیٹ کا لفظ ان کی زبان سے بہت ہی بُرا لگا۔ شاہد نے اپنے اور دوستوں سے بھی میرا تعارف کرایا مگر مجھے یاد نہیں کہ انھوں نے مجھ سے کیا کہا اور اس کے جواب میں، میں نے کس ردعمل کا اظہار کیا۔ لیکن مجھے اتنا یاد ہے کہ اس تمام عرصے کے دوران ۔۔۔ میں شاہد سے ہی ہم کلام رہی۔ جب میں کسی چیز سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہوں تو میری نظریں بار بار گھڑی پر پڑنے لگتی ہیں۔ یہ میری پرانی عادت ہے۔ شاہد میری اس عادت سے اچھی طرح واقف ہیں ان کے دوستوں سے گفتگو کے دوران میں یہی حرکت بار بار کرتی رہی لہٰذا شاہد کو معذرت کر کے اٹھنا پڑا۔

زینہ اترتے ہوئے شاہد نے میری خاموشی کو خریدنے کی کوشش کی جواب نہ پا کر جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہنے لگے۔

''عاشی! تمہاری اس خاموشی کو میں کیا سمجھوں کہیں تم نے میری باتوں کو مائنڈ تو نہیں کیا''۔

''ارے نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ محض آپ کا وہم ہے''۔ میں نے بات ٹالنے کی خاطر فوراً موضوع بدل دیا اور موسم پر تبصرہ کرنے لگی۔

''آج کافی خنکی ہے۔ مجھے ٹھنڈ سی محسوس ہو رہی ہے''۔ میں نے جھرجھری لی۔

''عاشی! تم جتنی خوبصورت ہو اتنی خوبصورتی سے بات بدلنا بھی جانتی ہو۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ تم کیوں اداس ہو۔ دیکھو! ہم صحافی ہیں۔ ہمارا کام دوسروں کے ذہنوں تک علم پہنچانا ہے کہ وہ پستی کے بوجھ کو اتار پھینکیں۔ اپنے آپ کو مصروف رکھو اور زندگی سے سمجھوتہ کرنا سیکھو۔ زندگی کی حقیقت کو محسوس کرو۔ ماضی میں ڈوبے رہنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا سوائے اس کے کہ تمہارے صحت گھل کر رہ جائے۔ چندا۔! خدارا خوش رہنے کی کوشش کرو۔ اپنے لئے نہ سہی، دوسروں کی خاطر ہی سہی'' ان کا لیکچر التجا پر آ کر ختم ہو گیا۔

میں نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا اور پھر خاموش ہو گئی۔

''شاید! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ابو انتظار کر رہے ہونگے'' میں نے پریشانی کا اظہار کیا۔

''چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں''۔ شاہد نے گاڑی نکالی اور مجھے گھر تک ڈراپ کیا۔

میں نے کال بیل بجائی۔ خانساماں نے آ کر گیٹ کھولا۔۔۔۔ اس نے بتایا کہ ابو نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میں کمرے میں پہنچی تو وہ میرے انتظار میں کسی کتاب کی ورق گردانی میں مصروف تھے۔ آہٹ پاتے ہی چونک پڑے

''عاشی بیٹے! آج تو آپ نے بہت دیر لگا دی ہم نے آپ کے دفتر فون کیا تھا تو معلوم ہوا کہ آپ آرٹس کونسل گئی ہیں''۔ ابو نے نرمی سے کہا۔

اس کے بعد ہم نے کھانا کھایا۔ پھر تھوڑی دیر تک سیاست پر بحث کرتے رہے۔ علاوہ ازیں، انہوں نے فوٹو گرافی کی تقریب سے متعلق بھی بہت سی باتیں دریافت کیں۔ پھر اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ میں بھی

اپنے کمرے میں جا کر ستانے کو لیٹ گئی۔ پھر اپنا سروے مکمل کرنے لگی۔ خانساماں نے آ کر اطلاع دی کہ فون آیا ہے۔ میں نے ریسیو کیا۔ شاہد تھے۔ پھر وہی مشورے۔۔۔۔۔ وہی خوش رہنے کی تلقین بس یہی ان کا موضوع تھا۔ جسے سن سن کر میرے کان پک چکے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ کل ان کی ڈیوٹی آف ہے لہٰذا اگر ضرورت پڑے تو پریس کلب فون کر لینا۔ میں نے جان چھڑانے کی خاطر حامی بھر لی اور فون کو کریڈل پر پٹخ دیا دو بجے تک میں نے سروے مکمل کیا۔ پھر بستر پر لیٹی رہی سگریٹ کش پہ کش لیتی رہی۔ میرے سامنے کپڑوں کی الماری کے درمیان بیئر اور وسکی کی خالی اور کچھ بھری ہوئی بوتلیں کپڑوں میں ٹھنکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔

دفعتاً میں بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی الماری کھول کر اس میں پھنسی ہوئی وسکی کی ایک بوتل نکالی۔ گلاس میں سادہ پانی سے ایک پیگ بنایا اور اسے حلق میں اتار لیا پھر بوتل وہیں چھپا کر رکھ دی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ گئی۔ ماضی کے کھنڈرات کی سیر میں مگن گم سم۔۔۔۔

میں اس وقت پانچ سال کی تھی جب میری امی کا انتقال ہوا ابو امی کو بہت چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کی مرد ایسے بھی ہوتے ہیں جیسے میرے ابو ہیں۔ تقسیم برصغیر سے قبل میرے ابو کراچی ہی میں تھے۔ ان کی شادی انڈیا میں ہوئی تھی اور کاروبار کراچی میں تھا۔ یہیں میری پیدائش ہوئی۔ میری پیدائش کے پانچ سال بعد امی کو ٹائیفائیڈ ہو گیا جو بگڑ کر ان کی موت پر منتج ہوا۔ یہاں ابو کے علاوہ میرے ایک چچا بھی تھے جن کا تعلق آرمی سے تھا۔ ان کی شادی لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ ہم سے علیحدہ ڈیفنس میں رہا کرتے تھے۔ کوئی اور عزیز و اقارب نہ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ امی کے انتقال کے بعد ابو نے مجھے بھارت بھیج دیا تھا جہاں میں اپنی ننھیال میں رہی۔ میٹرک کے بعد ابو نے مجھے اپنے پاس کراچی بلا لیا۔ شاید اسی لئے مجھ پر ہندی رنگ غالب ہے۔

کراچی پہنچ کر میں نے اپنی تعلیم مکمل کی اور صحافت کو بطور شوق اپنایا۔ اس سے پیشہ ورانہ طور پر منسلک ہونے کے بعد مجھ پر دنیا کے نشیب و فراز عیاں ہوئے اور ایسے کہ میں ذہنی طور پر اپنی عمر سے دوگنی ہو گئی کیونکہ مجھے ملازمت کرنے کی مجبوری نہیں تھی بلکہ شوقیہ اس شغل کو اپنایا تھا۔ لہٰذا صحافتی اداروں کے عمومی ماحول نے میرا کچھ نہ بگاڑا میں کسی فلسٹریشن میں آئی نہ بلیک میلنگ کی نذر ہو سکی۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے قدم کسی

مرحلے پر نہیں ڈگمگائے۔

وہ میری زندگی کا یادگار دن تھا جب میری ملاقات ایک تقریب کے دوران میں کاشف سے ہوئی تھی۔ ان کا تعلق بھی میرے ہی پیشے سے تھا۔ خوش ذوق، زندہ دل سانولا سلونا پرکشش شخصیت کا مالک یہ شخص میری زندگی کا ایک ایسا ناسور بن کر رہ گیا ہے جسے میں جتنا بھلانا چاہتی ہوں اتنا ہی وہ میرے رگ وپے میں سماتا جا رہا ہے۔ کاش! کوئی جان سکتا میں اسے کتنا چاہتی ہوں۔۔۔۔ میں نے زندگی میں دو افراد سے محبت کی ہے۔ ایک میرے ابو ہیں۔۔، اور دوسرے کاشف۔۔۔۔ حالانکہ کاشف بہت سلجھے ہوئے انسان تھے لیکن انہوں نے مجھے اپنانے کے لئے بڑے خوبصورت ڈرامے رچائے تاکہ میں ان کے قریب ہو جاؤں۔

ابتداء میں، میں بھی انہیں عام مردوں کی طرح وقت گزار اور رنگین مزاج سمجھتی رہی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ بات غلط ثابت ہوتی گئی۔ میرا شبہ بے بنیاد تھا۔ درحقیقت وہ میرے معاملے میں سنجیدہ تھے۔ اکثر وبیشتر ہماری ملاقاتیں مختلف تقریبات اور پریس کلب میں ہو جایا کرتی تھیں۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ وہ مجھ سے ملنے میرے دفتر آ جاتے اور فون کیا کرتے جب مل بیٹھتے تو گھنٹوں مختلف موضوعات پر بحث ومباحثے تبصرے اور تنقید کرتے رہتے ہمارے خیالات یکساں تھے۔ انداز فکر ایک تھا۔ ہم دونوں انقلابی اور ترقی پسند تھے۔ ہمارے قریب آنے کی وجہ بھی یہی تھی لیکن ذاتی طور پر ہم ایک دوسرے سے تنہائی میں کبھی نہ ملے اس کی ایک وجہ تو مصروفیت تھی اور پھر میں پوری طرح کاشف کے کردار سے مطمئن نہیں تھی۔ لہٰذا گاڑی اسی طرح چلتی رہی۔

اتفاق سے ایک دن پریس کلب میں کوئی میٹنگ ہو رہی تھی۔ غالباً سینسر شپ کے خلاف ریزولیشن پاس کرنا تھا تمام صحافی وہاں موجود تھے۔ میں اور کاشف بھی تھے۔ تھوڑی دیر تک ہم حالات کا جائزہ لیتے رہے کچھ تقریروں کے بعد چند قراردادیں منظور کی گئیں اور کم وبیش دو گھنٹے بعد میٹنگ ختم ہو گئی۔ میں باہر لان میں آ کر بیٹھ گئی۔ آسمان پر بادلوں کی آنکھ مچولی ہو رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔ آکاش پر ہلکے اور گہرے بادلوں کے ٹکڑے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ آفتاب بادلوں کی اوٹ سے کبھی نکلتا کبھی دبک جاتا۔ پورے ماحول پر رنگینی چھائی ہوئی تھی۔ لان میں جا بجا رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو وفضا میں رچی ہوئی تھی اور میں ایک نشۂ بے خودی میں سرشار تھی کہ اچانک پشت سے سرگوشی سنائی دی۔

واقعی آج موسم بڑا رومینٹنگ ہے بلکہ خوبصورت۔ جب لوگ بھی خوبصورت ہوں اور موسم بھی خوبصورت تو سونے پر سہاگہ ہو جاتا ہے۔ کاشف پشت سے گھوم میرے سامنے آ کھڑے ہوئے اور میں جھینپ سی گئی۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں'' انہوں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

''جی فرمائیے! میں نے سادگی سے کہا پلیز آج آپ ہمارے ساتھ چائے پئیں مگر یہاں کینٹین میں نہیں بلکہ باہر کہیں اور۔۔۔۔'' انہوں نے التجا کی اور معصوم صورت بنائے میرے جواب کا انتظار کرنے لگے۔

پہلی دفعہ میں نے غور سے ان کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی تو ان کی آنکھوں میں نہ معلوم ایسی کیا بات تھی کہ میں ان کی درخواست کو رد نہ کر سکی اور اٹھ کھڑی ہوئی پرس کو کندھے پر لٹکایا اور فائل سیٹ کرنے لگی۔

یک لخت کاشف کا چہرہ خوشی سے تمتما اٹھا انہوں نے دیر نہیں کی اپنی اور میری فائلیں کلب کے کاؤنٹر پر رکھوائیں پھر مجھے اپنی ہنڈا پر بٹھایا اور انجن اسٹارٹ کر دیا۔

اس دن زندگی میں پہلی بار میں کسی مرد کے ساتھ موٹر سائیکل پر سوار ہوئی۔ حالانکہ میں بہت بولڈ لڑکی ہوں لیکن اس وقت میرے جذبات کچھ عجیب سے تھے۔ اپنے پروفیشن کے اعتبار سے میرا سابقہ ہر وقت مردوں ہی سے رہتا ہے لیکن اس وقت مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی بہت بڑی چوری کر لی ہو۔ کبھی یوں لگتا جیسے ٹریفک کی ساری توجہ مجھ پر ہی مرکوز ہو کر رہ گئی ہے۔ اس دن اتنی جھجک رہی کہ موسم خوشگوار ہونے کے باوجود میرے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو کر چہرے پر بکھرتے رہے میں بہت محتاط انداز میں کیریئر کے سہارے بیٹھی تھی۔

انہوں نے گاڑی انٹر کونٹی نینٹل کے پارکنگ گراؤنڈ میں کھڑی کی۔۔۔۔ اس روز میں نے کریم کلر کا بیل باٹم سوٹ پہن رکھا تھا جس پر سیاہ ریشم سے بڑی خوبصورت کڑھائی کی گئی تھی۔ میرے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے جیسے ہی میں گاڑی سے اتری کئی نظریں میری طرف اٹھیں۔ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی کئی جاننے والوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ میں مزید بوکھلا اٹھی۔۔۔ وہاں ہم نے ایک میز کا انتخاب کیا بیٹھتے ہی ویٹر ہاتھ میں مینو لئے آ پہنچا کاشف نے اسے چائے کے علاوہ دیگر لوازمات کا آرڈر دیا اور وہ آرڈر نوٹ کر کے چلا گیا۔ ہم جہاں بیٹھے تھے اس کے پیچھے بڑا خوبصورت سوئمنگ پول تھا جو شیشے کی کھڑکیوں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس میں

چند غیر ملکی جوڑے سوئمنگ کر رہے تھے۔ کنارے پر بچھی بنچ پر ایک جوڑا تیراکی کے لباس میں دھوپ سینک رہا تھا۔ خاتون سیدھی لیٹی تھی اور مرد اس پر جھکا ہوا اس کے بالوں سے کھیل رہا تھا۔ میں اندر کے ماحول سے بے خبر باہر منظر میں کھوئی ہوئی تھی۔

''عاشی!'' کاشف نے دفعتاً مجھے چونکا دیا۔

''جی''۔ میں نے شرمندہ ہوئے پوچھا۔

آپ تیراکی پسند کرتی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کافی دیر سے آپ کی توجہ ادھر ہی ہے''۔ انہوں نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا۔

''کاشف صاحب آپ کا خیال درست ہے مجھے تیراکی نہ صرف پسند ہے بلکہ آتی بھی ہے''۔ یہ کہہ کر میں نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔

''ویسے مجھے تیرنا نہیں آتا۔ آپ کو تو آتا ہے نا چلو اس بات کا تو اطمینان ہو گیا کہ کبھی ڈوبنے لگے تو آپ بچالیں گی''۔ انہوں نے ذومعنی بات کہی جس پر میرا چہرہ گلنار ہو گیا اسی لمحے ویٹر آرڈر لے کر آ گیا اور اس نے چائے اور تمام لوازمات میز پر سجا دیئے۔

کاشف نے گولڈ لیف کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ مجھے پیش کیا دوسرا اپنے ہونٹوں میں دبایا۔ لائٹر سے پہلے میرا سگریٹ سلگایا پھر اپنا۔

''عاشی! اگر آپ کو آپ کی بجائے تم کہوں تو مائنڈ تو نہیں کریں گی''۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے اجازت طلب کی اور میں نے اجازت دے دی۔ اس پر انہوں نے شکریہ ادا کیا پھر اپنی آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔

''عاشی تم بہت ذہین اور پرکشش ہو ایسی خوبصورت چیز جسے صرف چاہا جائے۔ میری طرح جانے کتنے لوگ اس تمنا کے اسیر ہیں۔ مگر لوگ وقت گزاری چاہتے ہیں لیکن میں تمہارے معاملے میں وقت کو ٹھہرانا چاہوں گا۔ بولو! اس باب میں تمہارا مطمع نظر کیا ہے؟'' اس برملا اظہار کے بعد انہوں نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھا۔

میں میز پر رکھے ریش ٹرے کو بے سروپا انداز میں دائیں بائیں گھماتی رہی۔ جسمانی کیفیت کا عالم عجیب ہو گیا

جیسے بخار چڑھ رہا ہو۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں ان سے نظر نہ ملا سکی۔ بوکھلاہٹ میں کھڑکی سے باہر جھانکا تو وہ غیر ملکی مرد خاتون کے چہرے پر جھکا ہوا تھا۔ بس یہیں سے نظر پلٹ آئی، میرا چہرہ انگارے کی مانند دہکنے لگا، کوفت مٹانے کے لئے میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور میرے اور کاشف کے درمیان دھواں حائل ہو گیا۔ پھر مجھے چائے کا خیال آ گیا میں چائے کے بنانے لگی۔

''آپ کتنی شکر استعمال کرتے ہیں؟'' میں نے آہستگی سے پوچھا۔

''دو چمچے۔ اگر آپ نہ بھی ڈالیں تو فرق نہیں پڑے گا۔ یقیناً چائے میٹھی ہی بنے گی''۔ یہ کہہ کر انہوں نے میرے ہاتھوں کو اپنے بھاری بھرکم ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔

''عاشی! تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔ میرے متعلق تمہاری رائے کیا ہے آیا میری طرح تمہارے دل میں بھی میرے لئے جگہ ہے یا نہیں کچھ تو معلوم ہو یا میں ون وے ٹریفک ہی چلائے جاؤں وہ کہتے رہے''

تھوڑی دیر تک میں سوچتی رہی۔ کوئی جواب بن نہیں پڑ رہا تھا۔ بمشکل اپنے آپ کو حواسوں میں لائی۔

''کاشف صاحب ! میں آپ کا بہت احترام کرتی ہوں میرے اور آپ کے سوچنے کا انداز ایک ہے۔ اب تک کی ملاقاتوں میں آپ مخلص ہی پائے گئے ہیں اس کے باوجود میں مطمئن نہیں ہوں اس لئے کہ اپنے ہی حلقے میں میں نے کئی تاج محل مسمار ہوتے دیکھے ہیں۔ کتنے لوگوں کے چہروں سے محبت اور خلوص کے نقاب اترے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ میں آپ کو پسند کرتی ہوں۔ اعتبار کی کوئی بنیاد ضروری ہے میں نے بڑی جرات سے صاف گوئی اختیار کی۔

چند لمحے وہ سگریٹ ہونٹوں تلے دبائے کچھ سوچتے رہے گویا صفائی پیش کرنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہے ہوں۔ اس دوران میں نے ان کی انکھوں میں بڑی ویرانی دیکھی۔ ان کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور غائب ہو گئے پژمردگی سے کہنے لگے۔

''میں قسمیں کھانے کا عادی نہیں ہوں۔ جن کی شخصیت میں کچھ وزن ہو جنہیں اپنی ذات پر اعتماد ہو انہیں قسموں کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ میں آپ کو چاہتا ہوں میری خواہش ہے کہ آپ کو حاصل کرلوں اور

یہ میں ہر قیمت پر کر کے رہوں گا۔ انجام خواہ کچھ ہو۔ جہاں تک تمہارے اعتبار کرنے کا تعلق ہے میرے متعلق ہر طرح کی معلومات کر لو۔ خوب ٹھونک بجا لو۔ تمہیں اس کی اجازت ہے'' لیکن خدارا! یہ کاشف صاحب کہنا چھوڑ دو۔ میں اس قدر تکلف کا عادی نہیں۔

اس آخری جملے نے میری زبان گنگ کر دی۔ میں بالکل خاموش رہی۔

''عاشی! خاموش کیوں ہو۔ تم خاموش رہنے والی ہو تو نہیں۔ تمہاری رس بھری آواز اور قہقہے دور سے سنائی دیتے ہیں جب بولنے والے چپ سادھ لیں تو لگتا ہے جیسے چاروں طرف سناٹا چھا گیا ہو۔ پوری کائنات بے زبان ہو گئی ہو''۔ کاشف نے تردد کا اظہار کیا۔

''میں کیا بولوں! آپ بول رہے ہیں میں سن رہی ہوں یہ ٹوپک آپ کا ہے۔ اس پر میں کچھ نہیں بول سکتی۔ باقی آپ کسی ٹوپک پر کہیں گھنٹوں مسلسل بولتی رہوں گی اور ذرا نہیں تھکوں گی۔ پلیز! آپ ٹوپک چینج نہیں کر سکتے'' میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

''محترمہ عاشی! آپ سامنے ہوں، تنہائی ہو تو اس سے بہترین ٹوپک کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی۔ صحافی کو ہر اعتبار سے بولڈ ہونا چاہیے''۔ انہوں نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''پلیز واپس چلیں۔ دیر ہو جائے گی۔ مجھے دفتر بھی جانا ہے''۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی''۔ انہوں نے ویٹر کو آواز دی بل ادا کیا، ٹپ دی اور ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

پریس کلب میں داخل ہوتے ہی کچھ نظریں ہماری جانب اٹھیں اور میں گھبرا گئی۔ اسکینڈل سے میں بہت ڈرتی تھی۔ کلب سے میں نے فائل لی اور کاشف کو خدا حافظ کہہ کر دفتر چلی آئی۔

اس رات میں کافی دیر تک جاگتی رہی۔ کاشف کی باتوں پر غور کرتی رہی۔ کیا میں ان پر اعتبار کر لوں یا خواب رفتہ کی مانند بھول جاؤں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کافی حد تک مجھے متاثر کر لیا تھا۔ دل کی صدا یہ تھی کہ وہ فراڈ نہیں ہو سکتے۔ دوستوں کے تجربات کوئی قدم اٹھانے سے روک رہے تھے۔ عجیب مخمصے میں مبتلا رہی فیصلہ کرنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا دشوار ہو رہا تھا بالآخر دل مات کھا گیا اور اسکے بعد پرسکون نیند آ گئی البتہ صبح دفتر

دیر ہی سے پہنچی۔ تیسرے پہر کاشف کا فون آیا۔

''عاشی! خیریت سے پہنچ گئی تھیں نا۔۔ اور سناؤ طبیعت کیسی ہے؟'' وہ بڑے موڈ میں تھے۔

''جی پہنچ گئی تھی اور آپ کی دعا سے ٹھیک ہوں''۔ میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اور کہو۔ تم نے رات میرے متعلق کچھ سوچا۔ ویسے میں تمام رات تمہارے قرب کے احساس سے سرشار رہا۔ تم بہت یاد آتی رہیں۔ یہ بھی خوف تھا کہ تم کہیں میری باتوں کو مائنڈ نہ کر لو''۔ ترنگ میں آ کر وہ فقرے چست کرتے رہے۔

''نہیں تو میں نے بالکل مائنڈ نہیں کیا ویسے اب آپ بڑے اچھے شاعر بھی بن سکتے ہیں''۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ابھی تک تو شاعر نہیں ہوں ہاں البتہ تم ضرور بنا دو گی۔ اور سناؤ کیا کر رہی ہو۔ میں نے صبح دفتر فون کیا تو معلوم ہوا تم پی آئی اے تک گئی ہو۔ کیوں خیریت تو ہے؟'' انہوں نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

''اوہ۔۔ خوب یاد آیا۔ مجھے ایک فیچر کے سلسلے میں کل لاڑکانہ جانا ہے۔ صبح ساڑھے آٹھ کی فلائٹ ہے۔ میں یہ بات آپ کو بتانا تو بھول ہی گئی''۔ میں نے معذرت کر کے ان کو اپنے سفر کے متعلق بتایا۔

''واپسی کب ہو گی''۔

''دو تین روز میں''۔ میں نے وضاحت کی۔ پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا۔

''بات کو خوبصورتی سے ٹالنا تمہارا آرٹ ہے حالانکہ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس ناچیز کے متعلق تم نے کیا رائے قائم کی''۔ میں خواہ مخواہ جھینپ سی گئی۔

''آپ بہت اچھے انسان ہیں۔ باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہیں۔ آپ کی شخصیت ایسی نہیں کہ کوئی آپ سے دور رہنا پسند کرے۔ قسمت کا لکھا ٹالا نہیں جا سکتا۔ میری قسمت میں آپ سے وابستگی لکھی گئی ہے تو اسے کون کھرچ سکتا ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرتا ہے۔ وقت کا انتظار کریں''۔ میں نے گومگو کے انداز میں تقریباً اقرار سا کر لیا۔

''بھئی بہت خوب۔۔ انکشاف۔۔ یعنی تم تو فلسفی بھی ہو۔ میں تو تمہیں صحافی اور ادیب ہی سمجھتا رہا'' کاشف

موڈ میں آگئے۔ بہت خوش تھے اس کا اندازہ ان کی آواز سے ہو رہا تھا آخر ان سے رہا نہ گیا۔ جذباتی انداز میں کہنے لگے۔

''عاشی! آج میں بہت خوش ہوں، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم جیسی پیاری سی لڑکی خوابوں سے نکل کر حقیقت کے میدان میں میرے قریب آن کھڑی ہوگی، واقعی میں بہت لکی ہوں'' ۔آج وہ سلسلہ تکلم توڑنا نہیں چاہتے تھے مگر میں نے ٹوکا کہ مجھے سفر کی تیاری بھی کرنی ہے اب واپسی پر باتیں ہوں گی میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھا۔ دفتر سے ضروری چیزیں ساتھ لیں اور جلدی گھر پہنچی تا کہ سفر کی تیاری مکمل ہو سکے۔ لاڑکانہ دو روز رہی۔ شاہد بھی ہمارے ساتھ گئے تھے چونکہ ان کا تعلق فوٹو گرافی سے تھا لہٰذا انہوں نے میرے فیچر کو مکمل کرنے میں بڑی مدد دی۔ تیسرے دن میں واپس کراچی پہنچی۔ دفتر پہنچ کر کاشف کو اپنے آنے کی اطلاع دی سرسری طور پر ابو سے میں نے کاشف کا تذکرہ کیا وہ بخوبی میرے تذکرے کا مطلب سمجھ گئے۔ اور کاشف کو ملوانے کے لئے کہا۔ میں نے کسی دن ملوانے کا وعدہ کرلیا۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ میرے اور کاشف کی ملاقاتیں بڑھتی رہیں یہ سلسلے زیادہ عرصے دوسروں سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ دھیرے دھیرے یہ بات پھیلتی چلی گئی لیکن ہمیں لوگوں کی پرواہ نہ تھی چونکہ ہم ایک دوسرے کو اپنانا چاہتے تھے اس لئے مطمئن تھے۔

کاشف اپنے والدین کے اکلوتے تھے۔ ان کے والد کا چھوٹا سا کاروبار تھا ہاں البتہ ناظم آباد میں ان کا اپنا ذاتی خوبصورت سا مکان تھا۔ ان کے مقابلے میں ابو کی پوزیشن کافی مضبوط تھی۔ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کرتے تھے شہید ملت پر ہمارا خوبصورت سا دو منزلہ بنگلہ تھا۔ چچا کے علاوہ ہمارا کوئی اور عزیز یہاں نہیں تھا۔ عید قریب آرہی تھی۔ عید سے دو روز قبل کاشف نے ایک خوبصورت سی گلابی رنگ کی کامدار ساڑی مجھے تحفے میں دی جسے میں نے قبول کرلیا اس کے علاوہ میں نے عید والے دن کھانے پر کاشف کو مدعو کیا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ضرور آؤں گا۔

اس عید پر میں نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ اس دن میں نے نیلے رنگ کا کارآمدار غرارہ سوٹ پہنا۔ اس پر ہلکے پھلکے زیورات بھی پہن لئے، صبح سے ہی ہمارے گھر عید ملنے کے لئے آنے والوں کا تانتا بندھ گیا، چند ابو کے

دوست احباب تھے اور کچھ میرے دفتر کے لوگ اور دوست تھے جن میں سیما، غزالہ، پروین، مارگریٹ اور مہناز بھی شامل تھیں، اس کے علاوہ شاہد تھے۔

دو بجے کے قریب کاشف گہرے براؤن سوٹ میں ملبوس ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ آج وہ بڑے دلکش لگ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی عید کی مبارکباد دی، میں نے ابو سے ان کا تعارف کرایا۔ وہ دونوں بغلگیر ہوئے اور باتیں کرنے لگے۔ میں نے محسوس کیا کہ ابو ان سے متاثر ہو رہے تھے اسی دوران چچا کا فون آیا اور ابو فون ریسیور کرنے چلے گئے جو ڈرائنگ روم سے ملحقہ دوسرے کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ ان کے جاتے ہی کاشف میرے قریب آئے اور سرگوشی کی۔

''عید کی مبارک صرف زبانی کہہ دینے سے تھوڑی ہو جاتی ہے جب تک آدمی بغلگیر نہ ہو ویسے ماشاءاللہ آج تم اتنی پیاری لگ رہی ہو جی چاہتا ہے۔ آگے کہہ دوں''۔ انہوں نے جملہ ادھورا چھوڑا۔ میرا چہرہ تپنے لگا۔

''کاشف! آپ بے باک ہوتے جا رہے ہیں اتنی بیباکی اور بے تکلفی اچھی نہیں ہوتی۔ چارم ختم ہو جاتا ہے''۔ میں نے الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ میری اس بات پر وہ مسکرا کر رہ گئے۔

''اپنا ہاتھ ادھر لاؤ!''

''لیکن کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''اچھے بچے پوچھا نہیں کرتے جیسا میں نے کہا ہے ویسا ہی کرو''۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا تو انہوں نے ایک سو ایک روپے عیدی میرے ہاتھ پر رکھ دی پھر کہنے لگے۔

''سلام نہیں کرو گی''۔ اب میری کیفیت ایسی تھی۔ عیدی لیتے ہوئے بھی خفت محسوس ہو رہی تھی اور واپس کرنے کی صورت میں بھی ان کی دل آزاری کا خیال تھا، نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن، چار و ناچار رکھ لی۔ جھنجھلا کر کہنے لگے۔

''تم سلام کے معاملے میں بھی کنجوس ہی ہو''۔ شرمندہ ہوتے ہوئے میں نے آداب کیا اتنے میں ابو بھی واپس آ گئے، ہم سب نے اکٹھے کھانا کھایا شام کی چائے پینے کے بعد وہ رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد ابو نے تعریف کی کہ اچھا لڑکا ہے۔

دوسرے روز یہ خوشخبری میں نے کاشف کو سنائی تو بہت اکڑنے لگے۔

عید کے ایک ہفتے بعد کاشف اپنے والدین کو ہمارے یہاں لے آئے۔ وہ لوگ کافی دیر تک ہمارے گھر رہے، مجھے دیکھا اور پسندیدگی کا اظہار کیا پھر ابو سے میرے سلسلے میں بات کی، انہوں نے حامی بھری۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ہم ان کے گھر گئے۔ انہوں نے بڑا خوبصورت مکان بنوایا تھا جو ہمیں پسند آیا۔ اس کے بعد ہماری منگنی کی بات طے ہوئی، شادی محرم کے بعد ہونا قرار پائی۔ منگنی پر دونوں جانب سے انگوٹھیوں کا تبادلہ ہوا، میری انگوٹھی فیروزے کی تھی جو بہت نازک اور خوبصورت تھی۔ منگنی کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہمارے حلقے میں پھیلی۔ اس خبر سے بہت سے لوگ خوش ہوئے تو کچھ ناخوش بھی ہوئے تھے۔ اب ہماری شادی میں دو ماہ باقی تھے۔ دونوں طرف سے شادی کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔ اس ہنگامے میں دن تیزی سے گزر رہے تھے میں حسب معمول دفتر جارہی تھی، میرا ارادہ تھا کہ شادی سے بیس پچیس روز قبل چھٹی لے لی جائے۔ میرے کچھ کپڑے درزی کے پاس تھے اور کچھ سل کر آ چکے تھے، میری دوست گوٹے ٹانکنے اور بیلیں لگانے میں میری مدد کررہی تھیں، جن میں سیما اور مارگریٹ کا نام سرفہرست تھا۔

چھٹی کا دن تھا میں صبح دیر تک سوتی رہی۔ بیدار ہوئی تو طبیعت کچھ بوجھل بوجھل سی تھی، رات بھر بڑے ڈراؤنے اور بھیانک خواب نظر آتے رہے جنہیں میں نے ذہن سے جھٹک دیا، منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کیا اور دوپٹے پر گوٹا ٹانکنے لگی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔

گھنٹی کی آواز پر میں بری طرح چونک پڑی، ریسیو کیا تو ایک نحیف سی آواز ابھری۔

''عاشی بیٹے میں کاشف کا ابو جناح اسپتال سے بول رہا ہوں''۔ یہ سنتے ہی ایک لمحے میں بے شمار خیالات اور وسوسے بجلی کی رو کی طرح ذہن میں ڈور گئے کیونکہ اس سے قبل کبھی کاشف کے ابو نے ہمارے ہاں فون نہیں کیا تھا۔ دل پر قابو پاتے ہوئے بمشکل میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے انکل؟ خیریت تو ہے نا''

''ہاں بیٹے! خیریت ہی ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں تم فوراً جناح اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں پہنچ جاؤ۔ میں یہاں انتظار کررہا ہوں''۔ انہوں نے گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے کہا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ کوئی بات چھپانے کی کوشش کررہے ہیں۔ پھر فون منقطع ہوگیا۔

اس وقت ابو باتھ روم میں تھے۔ میں ان کو اطلاع دیئے بغیر خانساماں کو صورت حال بتا کر اسپتال کی طرف دوڑی وہاں پہنچی تو نقشہ دوسرا تھا۔ کاشف کی والدہ زار و قطار رو رہی تھیں اور ان کے والد پریشان پھر رہے تھے۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ میرے قدم ڈگمگانے لگے اپنے اندر ہمت پیدا کر کے کاشف کے ابو سے میں نے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے انکل۔۔۔ کچھ مجھے بھی تو بتائیں؟'' انہوں نے کرب سے میری طرف دیکھا اور مغموم لہجے میں کہنے لگے۔ ''کل رات گھر آتے ہوئے کاشف حادثے کا شکار ہو گیا، کسی گاڑی نے رات کی تاریکی میں اس کی گاڑی کو ٹکر ماردی، سر میں شدید چوٹ آئی ہے، سڑک سنسان تھی، وہ زخمی حالت میں کافی دیر تک وہاں پڑا رہا۔ خون بہت ضائع ہو گیا ایک راہ گیر نے پولیس کو اطلاع دی، تب اسپتال لایا گیا۔ اس وقت وہ آپریشن تھیٹر میں ہے۔ ڈاکٹر نے تشویش ظاہر کی ہے۔ دعا کرو بیٹی خدا اسے ٹھیک کر دے'' ۔یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں نم ہوگئیں میں گم سم کھڑی ان کی صورت تکتی رہی، یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ آیا یہ خواب ہے یا حقیقت، اتنے میں نرس نے آکر خوشخبری سنائی کہ آپریشن کامیاب رہا۔ یہ سنتے ہی کاشف کی والدہ نے وہیں شکرانہ ادا کیا ان کے ابو کے چہرے کی پژمردگی کم ہوئی اور میں۔۔۔ میری کیفیت ایسی تھی جیسے کوئی چھنی ہوئی چیز واپس مل گئی ہو۔

ایک ایک کر کے کاشف کے دفتر کے دوست اور رشتہ دار اسپتال پہنچنے لگے۔ پریس سے متعلق جس شخص کو خبر ملتی وہ آ پہنچتا۔ کاشف کو اسٹریچر پر ڈال کر وارڈ میں پہنچا دیا گیا۔ ان پر بے ہوشی طاری تھی۔ نرس نے کہا انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ ان کے پاس قطعی شور و غل نہ ہو۔ کاشف کے سر کے علاوہ ہاتھوں اور گلے کے اطراف بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ان کی والدہ پیشانی کو چھونے لگیں تو نرس نے ٹوک دیا۔ میں ایک گھنٹے تک وہاں رکی رہی پھر شام کو آنے کا وعدہ کر کے چلی آئی۔ گھر پہنچی تو ابو پریشانی کے عالم میں لان کے قریب ٹہل رہے تھے جیسے ہی میں گیٹ میں داخل ہوئی، وہ لپک کر میرے پاس آئے اور صورت حال معلوم کی۔ میں نے پوری تفصیل بتا دی۔ ان کا چہرہ فق ہو گیا لیکن انہوں نے اپنے آپ کو سنبھال کر مجھے تسلی دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کاشف کی طبیعت معلوم کرنے اسپتال چلے گئے۔ میں اپنے کمرے میں پہنچی تو بستر پر جہیز کے جوڑے بکھرے پڑے تھے جنہیں میں خود اسی حالت میں چھوڑ گئی تھی۔ میں نے جلدی جلدی ان سب کو تہہ کر کے الماری میں

رکھا، جوڑے رکھنے کے دوران نہ معلوم کیوں دل ہولنے لگا۔ برے برے خیالات آنے لگے اور میری آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

ابو اسپتال سے لوٹ کر آئے تو انہوں نے ڈھارس بندھائی اور بتایا کہ اب کاشف کی حالت بہت بہتر ہے۔ یہ سن کر مجھے سکون ملا۔ تین دن تک کاشف پر غنودگی سی طاری رہی، کسی کسی وقت کچھ لمحات کے لئے ہوش آتا اور پھر غنودگی غالب آ جاتی چوتھے دن مکمل طور پر انہیں ہوش آیا۔ باتیں کیں مجھے بلایا دیکھتے ہی کھل اٹھے، نقاہت بھی خاصی تھی اور ڈاکٹر کی ہدایت بھی، اس لئے باتیں زیادہ نہ کیں۔ پورے پانچ دن اسی طرح گزرے۔ چھٹے دن ان کی طبیعت سنبھلی بستر پر اٹھ کر بیٹھنے لگے۔

اس روز میں اسپتال پہنچی تو جوس پی رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی مسکرا دیئے اور فقرہ چست کیا۔

''قاضی جی کو شہر کا اندیشہ کھائے جا رہا ہے۔ بھئی اب تو ہم ٹھیک ہیں، منہ بسورنے کی کیا ضرورت ہے ہنسو بولو'' میں کرسی کھسکا کر ان کے بیڈ کے قریب بیٹھ گئی۔ ان کی والدہ ہم دونوں کو یکجا دیکھ کر باہر چلی گئیں۔ میں نے کاشف سے کہا اگر میں افسردہ نہ ہوتی تو پھر کون ہوتا، آپ کو اندازہ نہیں کہ میں کتنی پریشان رہی ہوں۔ پوری تین راتیں جاگ کر گزاری ہیں اور آپ کیلئے دعائیں مانگی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دعائیں رائیگاں نہیں گئیں۔ دفعتاً موڈ میں آ کر کاشف نے میرے ہاتھوں کو چوم لیا، ''سوئیٹ بے بی آئی لو یو سو مچ، یو ڈونٹ نو''

''عاشی! ایک خواہش ہے''

''کیا؟'' میں نے ملائمت سے پوچھا۔

''جی چاہتا ہے تمہارے ان نازک لبوں کو چوم لوں تم مائنڈ تو نہیں کرو گی؟'' ان کی آنکھوں میں التجا تھی۔

میں نے خاموشی اختیار کی اور انہوں نے آہستگی سے مجھے چوم لیا پھر میری تھوڑی اوپر اٹھائی اور آنکھوں میں جھانکنے لگے۔

''عاشی! تم مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔ خدا گواہ ہے میں تمہاری جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا، یہ محبت بھی عجیب شے ہے انسان کو پاگل کر دیتی ہے، کل تک میں دوسروں پر ہنسا کرتا تھا اور آج اپنی بے وقوفی پر ہنسی آتی ہے۔

''کاشف! میں آپ کو بھول جاؤں یہ ناممکن ہے، ہم ایک دوسرے کو کھونے کے لئے نہیں ملے ہیں خدا نہ

کرے کبھی ایسا لمحہ ہماری زندگی میں آئے، پلیز! آپ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں پریشان ہو جاؤں گی'' اور میری آنکھیں نم ہونے لگیں۔ مجھے سنجیدہ دیکھ کر انہوں نے موضوع بدل دیا۔

''پگلی کہیں کی۔ باتوں ہی باتوں میں آنکھیں بھگو لیں چلو ہنسو تمہارے قہقہے سننے کو کان ترس گئے ہیں'' میں صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''عاشی جانی! خاموش کیوں ہو اگرچہ تمہارا اداس چہرہ بھی دلکش لگتا ہے مگر جب تم مسکراتی ہو تو بہت ہی سویٹ لگتی ہو میں اکثر عالم تصور میں تمہاری موہنی صورت اور رسیلی آواز سنتا اور دیکھتا رہتا ہوں بھئی بولو۔۔۔ کچھ تو بولو'' وہ بچوں کی مانند ضد کرنے لگے۔۔۔

''کاشف پلیز! باتیں کم کریں آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ ذہن پر بالکل بوجھ نہ ڈالیں جب تک میں آپ کے پاس ہوں آپ سونے کی کوشش کریں، باتیں تو زندگی بھر کرنا ہیں''۔ میں نے پیار سے کہا اور ان کی کشادہ پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی اور وہ واقعی سو گئے۔ آہٹ پر چونکی تو میری پشت کی سمت شاہد کھڑے تھے۔ ان کے بائیں کندھے پر کیمرہ لٹکا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں فلیش گن تھی کہنے لگے۔''اب کاشف کی طبیعت کیسی ہے؟''

''ٹھیک ہے''۔۔میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''اگر اجازت ہو تو یہاں بیٹھ جاؤں''۔انہوں نے دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا

''ضرور اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''۔ میں نے ہنس کر کہا۔ مزید پندرہ منٹ ہم دونوں وہاں رکے رہے اس کے بعد ہم ساتھ ہی اسپتال سے باہر نکلے، شاہد نے مجھے گھر تک ڈراپ کیا اور پریس کلب چلے گئے۔

میں بلاناغہ اسپتال جاتی رہی۔ اپنی اور کاشف کی مشترکہ پسند کے لحاظ سے میں روزانہ پھولوں کا ایک خوبصورت سا گلدستہ لے جاتی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس حادثے کو دس دن گزر گئے اور کاشف کی حالت آہستہ آہستہ بہتر ہوتی رہی، میں بھی دفتر جانے لگی۔ واپسی پر روزانہ ایک گھنٹے کے لئے اسپتال ضرور جاتی، انہیں مکمل صحت یابی حاصل ہونے تک اسپتال ہی میں رہنا تھا۔

بارویں دن دفتر سے فارغ ہوتے ہی میں سیدھی اسپتال پہنچی۔ اس روز میں نے کریم کلر کا بیل باٹم سوٹ جس پر

سیاہ ریشم سے کڑھائی کی گئی تھی پہن رکھا تھا۔ مجھے اس سوٹ میں ملبوس دیکھ کر کاشف بہت خوش ہوئے اور ماضی کے خوشگوار لمحوں کو یاد کرنے لگے۔

''عاشی ڈیر! کیا بات یاد دلائی تم نے، تمہیں اس لباس میں دیکھ کر مجھے پہلی ملاقات یاد آ گئی کیسی گھبرائی سی میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ اس وقت مجھے تم پر کتنا پیار آ رہا تھا، تم اندازہ نہیں کر سکتیں۔ چلو اسی بات پر انعام دلواؤ اور انہوں نے بڑھ کر میرے ہونٹوں کی سرخی چرالی۔ میں شرم سے دہری ہو گئی پھر انہوں نے ایک خوبصورت ڈائری میری طرف بڑھائی۔

''ایک امانت تمہیں دے رہا ہوں اسے سنبھال کر رکھنا گو کہ میں ڈائری لکھنے کا عادی نہیں ہوں مگر اس میں ہماری ابتدائی ملاقات سے لے کر آج تک کے حالات لکھے ہوئے ہیں، پلیز! یہاں نہیں اسے گھر جا کر پڑھنا۔''

''مگر کاشف ڈائری ابھی کیوں دے رہے ہو۔ کہانی مکمل تو ہو جائے۔ شادی کے بعد پڑھنے میں زیادہ مزا آئے گا''۔ میں نے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے اصرار پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک گھنٹہ رکنے کے بعد میں نے گھر کے لئے اجازت چاہی تو انہوں نے مجھے روک لیا اور اپنے قریب بیڈ پر بیٹھنے کے لئے کہا پھر میرے ہاتھ کو آہستہ آہستہ دباتے ہوئے سرگوشی کی۔

''عاشی! تھوڑی دیر اور رک جاؤ، آج تم مجھے بہت اچھی لگ رہی ہو۔ میں جی بھر کے تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں، ان حسین لمحات کو آئینہ خیال میں محفوظ کر لینے دو۔ خدارا! آج تم میرے پاس ہسپتال ہی میں رک جاؤ۔ تمہیں میری محبت کی قسم!'' انہوں نے پرسوز انداز میں التجا کی۔

جذبات کے غلبے نے ان کی آواز پر کپکپاہٹ طاری کر دی تھی ان کی کیفیت بڑی عجیب سی تھی۔ اس کیفیت نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا لہٰذا گھر پر فون کر کے میں نے ابو سے ہسپتال میں رکنے کی اجازت مانگ لی۔

ہسپتال میں کاشف کے ساتھ ان کی والدہ بھی تھیں وہ شروع ہی سے بیٹے کے ساتھ تھیں۔ میں کرسی گھسیٹ کر کاشف کے سرہانے بیٹھ گئی۔ ہم دونوں رات کے ایک بجے تک باتیں کرتے رہے پھر نرس نے آ کر انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ آنکھیں موندے لیٹے رہے نہ معلوم کب سو گئے۔ میں ان سے تھوڑے فاصلے پر بیٹھی ایک انگریزی میگزین کی ورق گردانی کرتی رہی، کئی بار جی میں آیا ڈائری کو ایک نظر دیکھ لوں مگر پھر ان کی خواہش

کا احترام آڑے آیا اور میں نے ارادہ ترک کر دیا۔

میرے قریب ہی کاشف کی امی دوسرے بیڈ پر سو رہی تھیں۔ نیند سے میری آنکھیں بھی بوجھل ہونے لگیں چونکہ ہسپتال میں رکنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا، لہٰذا خوف کی ایک لہر سی میرے رگ و پے میں دوڑنے لگی۔ میں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ رات کے سناٹے میں کمرہ مجھے ویران سا محسوس ہوا ایک انجانا خوف میرا پیچھا کرتا رہا، اس ادھیڑ بن میں تین بج گئے، نینداور خوف کے غلبے کو کم کرنے کیلئے میں نے پانی پینے کا ارادہ کیا، گلاس کاشف کے سرہانے رکھا تھا، میں دبے قدموں ان کے سرہانے کی طرف بڑھی جونہی میں گلاس اٹھانے کیلئے جھکی، میری نگاہیں ان کے تکیے پر جم کر رہ گئیں۔ تکیے پر خون کے نشانات تھے۔ گھبراہٹ میں، میں ان کے چہرے پر جھک گئی، خون ان کی ناک سے بہہ رہا تھا۔ میں نے ان کی والدہ کو جگایا اور خود نرس کو اطلاع دینے دوڑ گئی۔ رات کی ڈیوٹی پر متعین ڈاکٹر بمع نرس کے آئے، انہوں نے کاشف کو چیک کیا اور فوراً دوسرے وارڈ میں منتقل کر دیا گیا جہاں انہیں آکسیجن اور خون دیا جانے لگا۔ پھر دماغ کے مخصوص ڈاکٹر کو اسپیشل وزٹ پر بلوایا گیا۔ اس نے بتایا کہ دماغ کی رگ پھٹ گئی ہے اور صورت حال خطرناک ہے۔ یہ انکشاف کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد بھی ڈاکٹر کاشف کی زندگی نہ بچا سکے وہ ایسے سوئے کہ پھر سوتے ہی رہے، موت کی آغوش میں وہ ہم سے کوسوں دور چلے گئے۔

اسی صدمے سے کاشف کی والدہ ذہنی توازن کھو بیٹھیں، ان کے والد کی کیفیت بھی کم و بیش ایسی ہی تھی اور میں۔۔ مجھے نہ معلوم کیا ہو گیا تھا۔ بالکل خاموش، گم سم کھڑی کبھی کاشف کو اور کبھی ان کے والدین کو دیکھتی رہی۔

ابو کو اطلاع مل چکی تھی وہ بھی موجود تھے۔ میں نے رونا چاہا تو آنسوؤں نے ساتھ نہ دیا چیخنا چاہا تو آواز حلق میں دب کر رہ گئی، میں نے ابو کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے، وہ کاشف کے والد کو تسلی دے رہے تھے پھر مجھ سے مخاطب ہوئے بغیر انہوں نے کہا ''خدا کی یہی مرضی تھی''۔ انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور سنبھل کر بولے۔

''تم تو بہت بہادر ہو۔ حوصلہ مت ہارنا''۔ ابو کی ڈھارس نے میرے ضبط کے بندھن توڑ ڈالے اور میں پھوٹ

پڑی۔ میری سسکی بندھ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے دوست احباب جمع ہو گئے، کیسا گھرے سناٹے والا سوگوار دن تھا۔ وہ تین دن تک میں کاشف کے گھر پر ہی رہی۔ اف! یہ دن کتنے کٹھن تھے میرا ہی دل جانتا ہے، پتا نہیں میں کیوں اس بات کو ماننے کو آمادہ ہی نہ تھی کہ کاشف ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔

سوئم کے بعد میں اپنے گھر آئی بے پناہ تنہائی اور اداسیوں کا گھمبیر احساس مجھے محصور کیے ہوتے تھا۔ جہیز کے کپڑوں پر نظر پڑی تو دل چمک اٹھتا جیسے انی چھد گئی ہو۔ میں اپنے کمرے میں مقید گھنٹوں روتی رہتی۔ ان کی دی ہوئی ڈائری نے تو اور قیامت ڈھائی۔ اُف اللہ! میرے بارے میں ان کے خیالات کتنے پاکیزہ تھے انہوں نے میرا کیسا سراپا کھینچا تھا کیسے کیسے برجستہ جملے شگفتہ فقرے۔۔ کاشف اپنے ساتھ میرے حواس بھی لے گئے تھے، میں ہر وقت از خود دل گرفتہ سی رہتی، ابو میری ذہنی حالت سے غیر مطمئن سے رہنے لگے، میں نے دفتر سے لمبی چھٹی لے لی۔ پوری چھٹیاں میں نے تنہا کمرے میں بند رہ کر ہی گزر دیں۔ ابو اور تمام دوست احباب نے بہت سمجھایا مگر اثر کسی کا نہ ہوا۔ آخر تنگ آ کر ابو نے مجھے مری بھیج دیا لیکن وہاں کی شادابیاں بھی میری ویرانیوں کو نہ بدل سکیں، طبیعت جیسی لے کر گئی تھی ویسی ہی واپس آئی پھر دفتر جانا شروع کر دیا لیکن معمولات بالکل بدل چکے تھے۔ اپنے کام سے کام، بالکل خاموش بیٹھی اپنی ذمہ داریاں پوری کرتی رہتی نہ ہنسنا نہ بولنا۔۔ وہ جو میں بڑی بولنے والی، ہنس مکھ اور تیز طرار سمجھی جاتی تھی سب کچھ یکدم ختم ہو چکا تھا جیسے کاشف کے ساتھ میر خوش طبعی بھی اس دنیا سے اٹھ چکی تھی اور میں جیسے ایک خالی خولی جسد خاکی تھی۔۔۔ مٹی کے اس دیئے کی طرح جس میں تیل نہ رہا ہو سوکھی بتی چرچرا چرچرا کر جل رہی ہو۔

میرے تمام جاننے والے اس صورت حال سے پریشان تھے انہیں میری اس تبدیلی پر خواہ مخواہ ترس آتا اور وہ میری دلجوئی کی ہر ممکن کوشش کرتے بالخصوص شاہد اور مارگریٹ۔۔ میرے ابو اف! وہ میرے لئے کتنے اداس اور فکر مند رہنے لگے تھے۔ انہوں نے وہ کون سی کوشش نہیں کی جس کے ذریعہ یہ میری حالت بدلنا ممکن تھی مگر میری حالت ایک ایسی سخت چٹان بن گئی جو اپنی جگہ اٹل تھی اس پر کسی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔

اب سے پہلے بھی مجھے اپنے ابو کی طرف سے ہر طرح کی آزادی تھی۔ میرا خاندان کنزرویٹو نہیں تھا لیکن اب تو ابو نے میری سہیلیوں اور ساتھ میں کام کرنے والے مرد ملاقاتیوں کو کہہ کہہ کر گھر پر بلوانا شروع کر دیا تھا تاکہ

میں بہلی رہوں۔تنہائی کی پژمردہ سوچیں میری صحت کو دیمک بن کر نہ لگنے پائیں۔ چنانچہ شام کو عموماً کوئی نہ کوئی سہیلی آجاتی اور گھنٹوں مجھ سے مختلف موضوعات پر گفتگو کرتی۔ میں سب کچھ سنتی اور ہاں، نا، میں جواب دیتی۔اپنی اس حرکت پر مجھے خود بھی افسوس ہوتا۔ یہ بداخلاقی جو زندگی میں کبھی کسی کے لئے میں نے نہیں برتی تھی، کس طرح سرزد ہو رہی ہے، میں خود کچھ نہیں جانتی تھی۔

کرسمس کے موقع پر مارگریٹ کے یہاں مدعو تھی تقریباً ساری جان پہچان کی صورتیں وہاں موجود تھیں۔جشن منایا جارہا تھا، جام چل رہے تھے۔ مارگریٹ مجھ سے بہت بضد تھی لیکن میں ٹال رہی تھی آخراس نے مجھے مجبور کردیا۔۔ڈنر کے شروع ہونے تک میں بھی اوروں کے ساتھ بیٹھی پیگ کی ہلکی چسکیاں لیتی رہی، لمبے لمبے وقفوں کے ساتھ۔۔تاکہ اوروں کا ساتھ بھی دیتی رہوں اور اپنے ساتھ زیادتی بھی نہ ہو۔ ہلکا ہلکا سرور طاری ہونے لگا تھا، بدن میں گرمی سرایت کرتی جارہی تھیں ایسا لگتا تھا جیسے سر پر بہت بھاری بوجھ تھا جو آہستہ آہستہ کم ہورہا ہے۔طبیعت میں کسی قدر بشاشت لوٹ رہی تھی۔ مجھے یاد ہے میں نے بعض موقعوں پر اس محفل میں مختلف لوگوں کی باتوں پر بڑے لطیف جملے کسے اور بہت سے فقرے چست کئے۔ میری اس غیر متوقع تبدیلی سے مارگریٹ بہت نہال تھی، شاہد بھی آہستہ آہستہ میری طرف کھسک آئے اور پھر محفل کا رنگ دوبالا ہوگیا۔

تقریباً ۲ بجے رات کو ڈنر ختم ہوا اور سب اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ مجھے شاہد نے اپنی گاڑی سے ڈراپ کیا۔اس دن کے بعد سے میں نے سکون دل کی خاطر شام ذرا سی پی لینے میں کوئی جرم نہیں سمجھا۔ مارگریٹ کے ذریعہ وہسکی منگوا کر الماری میں چھپا کر رکھی تھی اور صرف دو چھوٹے پیگ سونے سے کچھ قبل آہستہ آہستہ پی لیتی تھی پھر میں جیسے ماضی کے مزاروں سے نکل کر زندہ لوگوں کی چلتی پھرتی دنیا میں لوٹ آتی تھی۔

اب میرے معمولات بڑی حد تک حسب سابق ہو چلے تھے۔ میں تقریبات میں جانے لگی دفتر میں کسی وقت ہنسنے بولنے بھی لگی۔ میری اس حالت کو مزید تقویت دینے کے لئے شاہد زندگی کے فلسفے سمجھاتے اور قرینے بتاتے۔ بہرحال میں مطمئن سی ہوگئی۔۔میرا رنگ نکھرنے لگا، ہر وقت کی اداسی نے چہرے پر جو پژمردگی قائم کردی تھی، وہ دور ہوگئی تو میں جیسے بارش کے پانی میں نہایا ہوا ایک تروتازہ درخت بن گئی۔

آج بھی میں فوٹوگرافی کی نمائش سے واپس آکر ان خیالات میں جانے کیوں کھوگئی تھی، وہسکی کا ہلکا ہلکا سرور

اب نیند کے خمار میں تبدیل ہو رہا تھا اور پھر جانے کس وقت میں خواب کی وادیوں میں تحلیل ہو گئی۔

ابو میری شادی کرنا چاہتے تھے انہیں اس مسئلہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہونے کے علاوہ میری صحت اور طبیعت کی بحالی مقصود تھی۔ ان کا خیال تھا شادی کے بعد میرے ذہن سے کاشف کی یاد کا کانٹا نکل جائے گا۔

کاشف کی شخصیت ایسی نہیں تھی جو اس طرح میرے دل و دماغ سے محو ہو جاتی، لیکن مجھے ابو پر ترس آنے لگا تھا میں محسوس کر رہی تھی کہ میری فکر میں وہ اپنی صحت کو گھلائے دے رہے ہیں، ہر وقت چپ چپ رہتے اور مجھے گہری چاہت اور آرزو مند نگاہوں سے دیکھتے۔ دیر تک دیکھتے رہتے، بالآخر میں نے ایک دن ابو کی پریشانی دور کر دی ان سے وعدہ کر لیا کہ آپ کی خاطر میں بادل نخواستہ ہی سہی شادی کر لوں گی اور آپ کو خوش رکھنے کیلئے خوش رہوں گی۔

ابھی تک میرے بارے میں جو بات مشہور تھی اس کا تاثر ختم ہونے لگا اور شادی پر آمادہ گی کی چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔ حلقے کے بعض لوگ مجھ سے خواہ مخواہ، غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کرنے لگے، جنہیں میں زیادہ لفٹ نہیں دیتی تھی وہ مجھے مغرور متکبر کہتے اور نہ جانے کیا کیا من گھڑت باتیں ادھر ادھر اڑاتے۔ جس سے ہنس بول لیتی وہ اتراتے پھرتے اور اپنے حق میں طرح طرح کے افسانے گھڑتے۔۔ میں سنتی تو سوچتی، یا اللہ! یہ مرد بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔

ان سب میں سنجیدہ اور مناسب شخص شاہد تھے، لیکن وہ بھی کاشف کا نعم البدل ہرگز نہیں ہو سکتے تھے، میں شاہد کے بارے میں سوچنے لگی، وہ میرے بہت پرانے دوست تھے۔ برسوں کی ملاقاتوں میں کبھی انہوں نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی جو ایک معقول شخص کے شایان شان ہو، وہ بڑے وضعدار سنجیدہ اور سنبھل سنبھل کر بات کرنے والے فلسفی ٹائپ کے انسان تھے اور میرے بہت خیر خواہ۔ انہوں نے ہمیشہ میرے بھلے کی سوچی مجھے زمانے کے نیک و بد سمجھائے۔ وہ مجھے چاہتے بھی تھے اگرچہ انہوں نے کبھی اس کا اشارتاً بھی اظہار نہیں کیا مگر ان کے رویے ایک عورت کے لئے معمہ نہیں تھے۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتے ہیں لیکن کاشف سے میری رغبت دیکھ کر ایک معقول اور حقیقت پسند انسان کی طرح وہ مجھ سے الگ الگ رہنے لگے تھے، اس میں بھی انہوں نے مجھ سے محبت کا حقیقی ثبوت دیا تھا یعنی میری خوشی کے لئے اپنی آرزوؤں کا گلا گھونٹ لیا اور اس غم کو

اپنے فن میں ڈبو کر زندہ رہنے کی کوشش میں لگ گئے۔ یہ سوچ کر مجھے شاہد پر ترس آیا اور دل میں ان کیلئے ایک روشن لپک سی پیدا ہوئی۔ میں نے اشارتاً ابو سے شاہد کی تعریف کر دی، ابو یہ سن کر اچھل پڑے

''واقعی یہ لڑکا بہت اچھا ہے۔ بڑا معقول، مجھے شروع ہی بہت پسند ہے''۔

شاید؟ شاہد کو اس بات کا علم ہو گیا وہ اب بلا ناغہ مجھے دفتر سے پک کر کے گھر چھوڑنے آنے لگے اور میرے ساتھ بیٹھ کر گھنٹوں میٹھی میٹھی مہک دار باتیں کرنا ان کا معمول بن گیا۔ مجھے بھی ان کی باتوں میں بڑا لطف آتا جواباً میرے رویے سے بھی التفات کا رنگ جھلکنے لگا۔

ایک شام شاہد بہت موڈ میں تھے، ابو شہر سے باہر گئے ہوئے تھے، ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی، میں الماری سے وہسکی کی بوتل نکال لائی، دو گلاسوں میں پیگ بنائے اور ایک دوسرے کی صحت کا جام تجویز کیا۔ بوتل میں صرف چار پیگ ہی باقی رہ گئے تھے لہٰذا یہ سلسلہ تادیر جاری نہیں رہ سکا تاہم خاصا سرور طاری ہو گیا تھا۔ میں نے میز پر سے سب چیزیں سمیٹ لیں اور خانساماں کو آواز دی کہ وہ کھانا لگا دے۔ بوندیں موٹی اور تیز ہوتی جا رہی تھیں، ہوا میں بھی تیزی آ گئی تھی، کھانا لگ گیا۔ ہم دونوں کھانا کھانے لگے، کھانے کے ساتھ ساتھ شاہد کی تقریر جاری تھی، وہ مسلسل بولے جا رہے تھے جیسے کھانا ان کے نشے کو دوبالا کر رہا ہو، وہی محبت کی روایتی باتیں، میں نے انھیں ٹوکا۔ ''آپ بہک رہے ہیں جی۔۔ میرے ساتھ ان رومانی مکالموں کی ضرورت نہیں ہے''۔ وہ ہنسے۔

''ہاں! بالکل نہیں ہے، تمہارے لئے اب میرا کوئی حریف نہیں ہے۔ میں نے سب کو شکست دے دی ہے، کوئی میرے مقابلے پر نہیں جم سکا، ہاں کاشف ایک پہاڑ تھا جو ہلائے نہیں ہلتا تھا لیکن میں۔۔ میں بھی کوہکن سے کم نہیں ہوں، میرا تیشہ نہر نکال ہی لایا"۔

میرا سر گھوم رہا تھا جیسے زمین گردش کر رہی ہو اور کرسی جس پر میں بیٹھی ہوئی تھی ہنڈولہ بن گئی ہو، شاہد کی نشیلی باتوں نے مجھے چکرا دیا۔ میرے سامنے ایک دائرہ گھومنے لگا پھر وہ دائرہ پھیلنے لگا۔۔ میں نے دیکھا کہ کاشف اپنی گاڑی پر سوار تیزی سے جا رہے ہیں، گھپ اندھیرے میں پیچھے سے کسی گاڑی نے ٹکر ماری، کاشف گاڑی سمیت اچھل کر دور جا گرے اور پھر میں نے دھندلی آنکھوں سے ایک مرغولہ دیکھا۔۔۔ خاک اور خون کا مرغولہ۔۔۔ جس کے پاس شاہد کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔

میرا نشہ ہرن ہو گیا، میں کرسی سے اچھل کر اٹھی اور رفرش پر ننگے پیر مضبوط قدموں پر کھڑی ہو گئی۔ شاہد کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر معلوم نہیں کیا چیخی اور بے خبر ہو گئی۔

صبح میں بہت نڈھال تھی، ابو آ چکے تھے، ناشتہ پر ملاقات ہوئی انھوں نے شاہد کے بارے میں پوچھا۔

''ابو شاہد اچھا آدمی نہیں ہے۔'' میں نے برجستہ کہا۔

''ارے یہ تم کیا کہہ رہی ہو بیٹی! وہ تو بہت اچھا آدمی ہے''۔ ابو نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی وہ اچھا دکھائی دیتا ہے''۔ میں نے ابو کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

''تو کیا وہ اچھا ہے نہیں''۔ ابو نے حیرت سے پوچھا۔

''نہیں''۔ میں نے تقریباً چیخ کر جواب دیا۔

''وہ ایک خود غرض، سفاک دل بھیڑیا ہے''۔ فرط جذبات سے میری آواز کانپنے لگی۔

''تو کیا۔۔تو کیا۔۔۔ میں سمجھوں بیٹی! کیا اس نے۔۔''

ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ابو میں آپ کی بیٹی ہوں اور اپنی حفاظت کرنا جانتی ہوں لیکن ابو۔۔ اب میں شادی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔۔۔۔۔۔ ہرگز نہیں۔۔۔ ابو''۔ میں نے پر عزم لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ میرے دل و دماغ میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ خیالات کے دھارے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ بار بار کاشف کی موہنی صورت ان میں سے علیحدہ ہو کر نظر آتی تھی اور پھر میں نے سوچا کہ کاشف کے بعد میں نے دو شخصیتوں پر بھروسا کیا تھا، ایک مارگریٹ اور دوسرے شاہد۔۔ مارگریٹ نے شراب جیسی لعنت مجھ پر مسلط کر دی اور شاہد۔۔ جسے میں اپنا سب سے بڑا دوست اور غم گسار سمجھتی رہی، وہی میری خوشیوں کا قاتل نکلا۔۔ سوچوں کی یلغار میں کہیں دور سے علامہ نیاز فتح پوری کی غزل کا مقطع رینگتا ہوا میرے سامنے آ گیا۔

اب تو یہ حالت ہے جیسے دکھ کے کانٹوں پر نیاز
ریشمی چادر کو بے دردی سے کھینچا جائے ہے

سات رنگ ڈائجسٹ 1978ء

مقصد

''عذرا! جلدی سے ناشتہ بنادو، دفتر کے لئے دیر ہورہی ہے''۔ زبیر نے ٹائی درست کرتے ہوئے کہا
''جلدی تو کررہی ہوں، مشین تو نہیں ہوں کہ بٹن دبایا اور ناشتہ تیار، کچھ تو دیر لگے گی، ذرا انتظار کرلیں؟'' اس نے کچن میں ناشتہ تیار کرتے ہوئے اپنا جملہ پورا کیا۔

عذرا اور زبیر کی شادی کو پندرہ سال ہوچکے تھے، ان کے پاس سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ اولاد کی نعمت سے محروم تھے، گو کہ عذرا کا میڈیکل کلیئر تھا مگر زبیر کی وجہ سے وہ ماں نہ بن سکی تھی، اتنے بڑے بنگلے میں ان دونوں کے علاوہ اور کوئی بھی نہیں تھا، ملازمہ صبح آ کر تمام کام کرکے چلی جایا کرتی اس کے بعد تمام دن عذرا کے لئے گزارنا مشکل ہوجاتا۔ زبیر شام چھ بجے تک واپس آتا۔ ایک طویل تنہائی کے باعث وہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔ اس کی زندگی میں کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد وہ قریبی مارکیٹ سے سبزی ترکاری اور گوشت خرید کر لاتی پھر کھانا تیار کرنے، نماز پڑھنے کے بعد تنہائی کھانا کھالیا کرتی پھر تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد عصر کی نماز کا وقت ہوجاتا، نماز سے فارغ ہوکر یا تو وہ ٹی وی دیکھ رہی ہوتی یا کسی کتاب یا میگزین کی ورق گردانی، یہی اس کا مشغلہ تھا۔

روزمرہ کی اسی یکسانیت سے وہ اکتا سی گئی تھی۔ اس کے والدین یا دوست آس پاس نہیں تھے، ان سے ملنے کے لئے بھی اسے ایک ڈیڑھ گھنٹہ صرف کرکے جانا پڑتا کیونکہ ملیر کینٹ کے قریب اس کی رہائش تھی جبکہ اس کے والدین جمشید روڈ کے قریب رہتے تھے۔ فطرتاً وہ بہت بولڈ تھی، زبیر خاموش طبع اور بزدل قسم کا انسان تھا۔ حالات کی یکسانیت اور تنہائی کے باعث عذرا چڑچڑی ہونے کے علاوہ سخت مزاج بھی ہوگئی تھی اکثر و بیشتر وہ بہت ہی معمول باتوں پر زبیر سے الجھتی، چھوٹی موٹی لڑائی بھی ان دونوں کے درمیان ہوجاتی مگر یہ ناراضگی زیادہ دیر قائم نہ رہتی کیونکہ عذرا فطرتاً دل کی صاف تھی یعنی دل میں کدورت نہیں رکھتی تھی۔ لڑائی کے تھوڑی دیر بعد سب کچھ بھول کر نارمل ہوجاتی۔ اس کی لڑائی یا ناراضگی تھوڑی دیر کی ہوتی تھی، اس کی اس فطرت سے زبیر اچھی طرح واقف تھا یہی وجہ تھی کہ وہ اس کی سخت باتوں اور رویے کو نظرانداز کئے رہتا۔ بظاہر وہ شریف تھا مگر

اندرونی طور پر اس کا ذہن مختلف ادھیڑ بن میں لگا رہتا۔ عذرا سے وہ چھٹکارا بھی چاہتا تھا مگر کس بنیاد پر؟ وہ اسے چھوڑ دیتا یا طلاق دیتا، ایسی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ جو انتہائی قدم اٹھانے کا سبب بنتا۔ اس کے بچے اگر نہیں تھے تو اس میں اس کا کوئی دوش نہ تھا۔ شکل وصورت اور خاندان کے اعتبار سے وہ بالکل ٹھیک تھی۔ ان تمام باتوں کے باوجود عذرا زبیر سے ایک اچھی اور شریف بیوی کی طرح نبھاہ کر رہی تھی۔

عذرا اپنے شوہر کی ذہنی کیفیت سے بالکل ناواقف تھی کہ آیا وہ کیا چاہتا ہے؟ کیا سوچتا ہے کیونکہ عذرا کھل کر اپنی دلی کیفیت کا اظہار کرتی تھی جبکہ زبیر اپنے خیالات اور جذبات کو اپنے ہی دل میں چھپا کر رکھتا۔ اپنے کسی کردار یا گفتار سے وہ عذرا کو یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ اس کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے یا کیا کرنے جا رہا ہے۔

''ہیلو سارا! کیسی ہو؟'' زبیر نے اس کے دفتر میں ایک ہفتہ قبل آنے والی لڑکی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں! آپ کیسے ہیں؟'' اس نے لہک کر پوچھا۔ سارا نے ایک ہفتے قبل دفتر جوائن کیا تھا۔ وہ زبیر کے دفتر میں بحیثیت اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ آئی تھی۔ زبیر اس دفتر میں پروڈکٹ منیجر تھا اور اس کی تنخواہ بھی بہت پرکشش تھی۔

سارا نے ایم بی اے کر لیا تھا اسی بنیاد پر اس کی یہ پہلی ملازمت تھی۔ وہ گوری رنگت، دلکش خدوخال اور لمبے قد کی دبلی پتلی نازک اندام سی لڑکی تھی۔ دفتر میں ملازمت پیشہ دیگر نوجوان اس سے فری ہونے کی کوشش کرتے مگر وہ کسی کو لفٹ نہیں کرا رہی تھی۔ اکثر وہ زبیر کے کمرے میں جا کر اس سے گپ شپ کرتی۔ اس طرح دو ماہ گزر گئے۔ زبیر کو سارا پسند آ گئی تھی مگر وہ عذرا کی فطرت اور طبیعت کے باعث ڈرتا تھا۔ سارا سے ملنے اور زیادہ گفتگو کرنے میں صرف عذرا حائل تھی یہی بات زبیر کو کھٹکتی تھی چونکہ زبیر مالی اعتبار سے مضبوط تھا اور ادارے میں اس کی مستحکم پوزیشن کی وجہ سے سارا بھی زبیر میں دلچسپی لینے لگی جبکہ اسے معلوم تھا کہ وہ ایک شادی شدہ مرد ہے۔

''سر! آپ کے گھر سے فون ہے'' آپریٹر نے زبیر کو لائن ٹرانسفر کرتے ہوئے کہا

''ہیلو! خیریت، کیا بات ہے؟'' زبیر نے حیرت سے پوچھا کیونکہ عذرا اس کے دفتر بہت ضروری ہوتا تو فون

کرتی ورنہ وہ خود دن میں ایک بار اسے فون کر لیتا تھا۔

''دراصل اتوار کو عادل کی منگنی ہے، امی نے مجھے خریداری کرنے کیلئے بلایا ہے۔کیا میں چلی جاؤں؟'' عذرا نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں، ہاں چلی جاؤ۔اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے''۔زبیر نے اجازت دیتے ہوئے کہا، عادل عذرا کا چھوٹا بھائی تھا اور اکلوتا بھی تھا۔اس کی ایک بڑی بہن اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھی۔

''سنیئے! میں نے کھانا پکا کر فرج میں رکھ دیا ہے آپ مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھا لیجئے گا، مجھے رات کو عادل گھر چھوڑ جائیگا، آپ کے آنے کی ضرورت نہیں ہے''۔عذرا نے تفصیل سے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے، دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے جانا'' زبیر نے اسے تاکید کی۔

''سارا! آج شام تمہارا کیا پروگرام ہے''۔زبیر نے سوالیہ اندازی میں پوچھا

''کوئی خاص نہیں'' اس نے شانے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''سی ویو چلنے کا موڈ ہے، آؤٹنگ بھی ہو جائے گی اور باتیں بھی''۔زبیر نے برجستہ کہا۔

''ہاں کیوں نہیں، کافی دنوں سے میں بھی سی ویو نہیں گئی۔ٹائم ہی نہیں ملتا۔پھر کوئی ساتھ جانے والا بھی نہیں، بڑے بھائی اپنی فیملی کے ساتھ الگ رہتے ہیں۔میں، امی اور ابو اس کے علاوہ چھوٹا بھائی ندیم ہم اکھٹے رہتے ہیں''۔سارا نے اپنے متعلق بتاتے ہوئے کہا۔

شام پانچ بجے تک ان کی چھٹی ہو جایا کرتی تھی۔چھٹی سے تھوڑی دیر پہلے سارا نے اپنا حلیہ درست کیا پھر اپنے گھر فون پر بتایا کہ آج اسے کسی کام سے جانا ہے، وہ دیر سے آئے گی لہٰذا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔شام چھ بج کر پندرہ منٹ پر سارا اور زبیر اکٹھے دفتر سے اٹھے۔زبیر نے پارکنگ سے گاڑی لی پھر وہ دونوں اکٹھے سی ویو کی طرف روانہ ہوئے۔تمام راستے زبیر سارا اور اس کے گھر والوں سے متعلق معلومات اکھٹی کرتا رہا۔

''زبیر صاحب! آپ کی مسز کیسی خاتون ہیں؟''۔سارا نے اپنی معلومات کیلئے پوچھا۔

''اچھی خاتون ہیں مگر سخت مزاج اور چڑچڑی ہیں'' زبیر نے مختصر جواب دیا

''آپ کے کتنے بچے ہیں؟''اس نے اگلا سوال کیا۔

''بچے نہیں ہیں'' زبیر نے اس بار بھی مختصر سا جواب دیا مگر اسے اپنی خامی نہیں بتائی کہ بچے اس کا میڈیکل کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے نہیں ہوئے، یہ بات اس نے چھپالی۔

اس کے بچے نہیں ہے یہ جان کر سارا کو ایک تقویت سی ملی گویا زبیر سے شادی کا ایک ریزن بن سکتا تھا اگر اس کے بچے ہوتے تو وہ دوستی سے آگے نہ سوچتی مگر اب معاملہ دوسرا تھا۔

چونکہ آج ہفتے کا دن تھا اس لئے سی ویو پر کافی بھیڑ تھی۔ کاروں کی قطاریں ہی قطاریں ہر طرف نظر آرہی تھیں زبیر نے یہاں کار نہیں روکی بلکہ وہ اس رش میں کچھ کنفیوس سا ہو گیا تھا لہٰذا وہ بہت آگے نکل آیا، یہاں اکا دکا لوگ تھے۔اس نے کار روکی اور باہر آ گیا۔سارا بھی کار سے ڈوپٹہ درست کرتے ہوئے اتر آئی۔

یہاں سے سمند کا نظارہ بڑا دلچسپ لگ رہ تھا۔ بہت اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ سارا چلتی ہوئی ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی۔ زبیر بھی اسی کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔ زبیر کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی جبکہ سارا چوبیس پچیس سال کی تھی، یوں دونوں کی عمروں میں پندرہ سال کا فرق تھا۔ عہدہ اور پیسہ ہر فرق کو مٹا دیتا ہے۔ اس وقت سارا کیلئے یہی بات تھی پھر دوسری بات یہ بھی تھی کہ زبیر مردانہ وجاہت پر پورا اترتا تھا۔ اس کا انداز گفتگو اور دھیما پن، اسی پر سارا فدا ہو گئی تھی۔

''تم! میرے بارے میں کیا رائے رکھتی ہو''؟ اس اچانک سوال پر سارا گھبرا سی گئی۔

''ظاہر ہے اچھی رائے رکھتی ہوں ورنہ آپ کے ساتھ یہاں کیوں آتی''۔ سارا نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

اس جواب پر زبیر مطمئن سا ہو گیا۔ اب سارا کو حاصل کرنا اس کے لئے مشکل نہیں تھا۔ آگے کیا کرنا ہے یہ سوال زیادہ مشکل تھا۔ وہ دونوں وہاں ایک گھنٹے تک رہے پھر واپسی پر انہوں نے پارک ٹاور میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد ساڑھے آٹھ بجے کے قریب زبیر نے اسے نرسری پر ڈراپ کیا کیونکہ سارا نرسری پر بنے ایک اپارٹمنٹ میں اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی۔

''اتنی دیر کیسے ہو گئی''؟ اس کی ماں نے پوچھا۔

''کچھ نہیں امی! میں ایکسپو سینٹر گئی تھی، وہاں نمائش میں کئی چیزیں دیکھیں مگر کافی مہنگی تھیں اس لئے خرید نہ سکی

اور واپس آ گئی''۔سارا نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''اچھا چلو کپڑے بدلو، میں کھانا لگا رہی ہوں''۔اس کی ماں ثریا نے کہا۔

''مجھے بھوک نہیں لگ رہی ہے، میں نے ایکسپو میں سینڈوچ وغیرہ کھا لئے تھے بعد میں چائے پیوں گی''۔سارا نے غسل خانے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

رات دس بجے تیز بیل پر زبیر نے دروازہ کھولا۔عذرا کچھ شاپرز لئے اندر داخل ہوئی۔

''یہ کیا خرید کر لائی ہو''؟اس نے پوچھا

''اپنے لئے اور آپ کیلئے کپڑے خریدے ہیں''اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا پھر وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی اور ٹھنڈا پانی پینے کیلئے فرج کھولا۔

''ارے! آپ نے کھانا نہیں کھایا، میں آپ کیلئے آلو گوشت اور چاول پکا کر گئی تھی''۔عذرا نے حیرت سے پوچھا۔

''ایک دوست مل گیا تھا، اس کے ساتھ ہوٹل میں کھا لیا تھا۔اب اکیلے کیا کھاتا''۔اس نے جھوٹ بولا۔عذرا نے اسے کپڑے دکھائے جو اس نے طارق روڈ سے زبیر کیلئے اور اپنے لئے خریدے تھے، اس نے سرسری طور پر ان کپڑوں پر نظر ڈالی اور ٹی وی دیکھنے میں محو ہو گیا۔عذرا کو اس کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آیا کیونکہ زبیر نے پہلی مرتبہ اس کی لائی ہوئی چیزوں کو نظر انداز کر دیا تھا حالانکہ اس سے پہلے کئی بار وہ زبیر کیلئے کپڑے خرید کر لاتی رہی تھی جس کی وہ دل کھول کر تعریف کرتا تھا، اتنے برسوں بعد آج اس کا یہ رویہ ناقابل فہم تھا۔عذرا نے خاموشی سے کپڑے سمیٹ کر الماری میں رکھے اور خود آ کر بستر پر لیٹ گئی۔صبح سویرے چوکیدار نے دستک دی اور گاڑی کی چابی مانگی تاکہ گاڑی صاف کرے۔عذرا نے چابی دی اور خود ناشتہ تیار کرنے لگی۔آدھے گھنٹے بعد چوکیدار نے چابی لا کر واپس دے دی۔

''آج گاڑی صاف کرنے میں بہت دیر لگا دی''۔عذرا نے پوچھا۔

''پائیدان میں بہت مٹی تھی۔کیا آپ لوگ کل کلفٹن گئے تھے؟''چوکیدار نے الٹا سوال کیا۔

''نہیں تو۔میں تو دوپہر میں امی کے گھر گئی تھی اور زبیر دفتر گئے تھے''۔عذرا نے واضح کیا

''کل آپ نے کہاں کھانا کھایا تھا'' عذرا نے ٹیبل پر ناشتہ لگاتے ہوئے سوال کیا

''کیوں، کیا ہوا''؟ زبیر نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''چوکیدار نے بتایا کہ پائیدان میں کافی مٹی تھی جو کلفٹن کے ساحل پر ہوتی ہے''۔اس نے زبیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''عظیم کے ساتھ کلفٹن کے ایف سی گیا تھا وہیں پر ہم نے کھانا کھایا تھا''۔اس نے نظریں جھکائے جملہ مکمل کیا۔

''اچھا'' عذرا نے کہا اور خود بھی ناشتہ کرنے لگی۔

ناشتے کے بعد زبیر اخبار پڑھنے میں مصروف ہوگیا، عذرا نے ٹیبل صاف کردی اور تمام برتن سمیٹ کر کچن میں رکھ دیئے کیونکہ ان کی ملازمہ فرزانہ صبح دس بجے تک آجاتی تھی۔وہ اتوار کو چھٹی کرتی تھی۔عذرا نے زبیر کے کھانے پر جانے اور گاڑی میں کلفٹن کی مٹی کی موجودگی کو سنجیدگی سے نہیں لیا کیونکہ اسے زبیر پر حد سے زیادہ اعتماد تھا لہٰذا وہ اس کے متعلق غلط رائے قائم نہیں کرسکتی تھی۔

''ہفتے کی رات دیر سے گھر پہنچنے پر امی، ابو نے کچھ کہا تو نہیں''۔زبیر نے سارا سے پیر کے دن لنچ ٹائم پر پوچھا۔

''میں نے بات بنادی تھی، وہ لوگ مطمئن ہوگئے تھے اس لئے کسی نے بھی کچھ نہیں کہا''۔سارا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

دن یونہی گزرتے رہے۔زبیر پہلے شام چھ بجے تک گھر آجایا کرتا تھا۔اب وہ آٹھ، نو بجے تک گھر آنے لگا تھا۔عذرا تشویش میں مبتلا رہنے لگی، اب وہ مزید چڑچڑی اور بدمزاج ہوگئی تھی۔تمام دن گھر میں اکیلے پڑے پڑے اس کے اعصاب متاثر ہوگئے تھے۔وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر ہی سے نہیں بلکہ محلے والوں سے بھی الجھنے لگی تھی۔اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔زبیر نے بھی یہ محسوس کیا کہ وہ اکیلے پن سے کافی حد تک متاثر ہو گئی ہے وہ بجائے اسے اچھی کمپنی دینے کے مزید دیر سے گھر آنے لگا تاکہ عذرا کی رہی سہی قوت بھی جواب دے جائے اور اسے دوسری شادی کرنے کا جواز مل جائے۔دروازے پر بیل ہوئی تو عذرا نے دروازہ کھولا۔

''عذرا! یہ تمہیں کیا ہوگیا؟ اتنی کمزور ہوگئی ہو اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑگئے ہیں''۔خالدہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔خالدہ اس کے بچپن کی دوست تھی۔شادی کے بعد وہ لاہور میں مقیم تھی۔بچوں کی چھٹیوں

میں کراچی اپنے میکے آئی ہوئی تھی، آج وہ اکیلے ہی عذرا سے ملنے ٹیکسی سے آئی تھی۔

عذرا نے اسے اپنے اور زبیر کے متعلق پوری تفصیل بتائی اور خاص طور پر زبیر کے غلط رویے کا بھی تذکرہ کیا۔

''عذرا! تم نے کہا کہ زبیر کا میڈیکل کلیئر نہ ہونے کی وجہ سے تمہارے بچے نہیں ہوئے تو اسی وقت تمہیں الگ ہو جانا چاہئے تھا۔ تم نے اس بات کو نظر انداز کر دیا اور اس کی خاطر خود کو اذیت دیتی رہی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبیر کو احسان مند ہونے کے بجائے اس نے الٹا تمہیں پریشانی میں مبتلا کر دیا ہے۔ میری مانو تم بھی اسے نظر انداز کر دو، خود کو مصروف رکھو، امی کے گھر، دوستوں کے گھر آیا جایا کرو''۔ خالدہ نے اسے مشورہ دیا۔

''میں ایسا نہیں کر سکتی''۔ عذرا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''دیکھو! مردوں کی نفسیات ہوتی ہے جتنا بیویاں اس کے پیچھے بھاگتی ہیں وہ اتنا ہی ان سے دور ہوتے ہیں۔ تم زبیر کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دو، خوش رہو، خود کو مصروف رکھو، وہ خود تمہاری طرف راغب ہوگا؟'' خالدہ نے اس کی پریشانی کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ عذرا کی سمجھ میں کسی حد تک بات آ گئی۔ اس نے خالدہ سے وعدہ کیا کہ وہ اس کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرے گی۔

''سنئے! آپ رات کھانا کھا کر آیئے گا کیونکہ میری دوست لاہور سے آئی ہے، میں اس کے پاس جاؤں گی''۔ عذرا نے چائے کپ میں انڈیلتے ہوئے زبیر سے کہا۔

''رات کتنے بجے تک آؤ گی؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں''۔ عذرا نے بے نیازی سے کہا۔ ملازمہ نے دو گھنٹے لگا کر کام کیا، اس کے جانے کے بعد عذرا تیار ہوگئی۔ آج برسوں بعد عذرا نے الماری سے جیولری نکال کر پہنی، کپڑے بھی اسی مناسبت سے پہن لئے۔ تیار ہونے کے بعد اس نے آئینے میں اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ وہ بالکل مختلف لگ رہی تھی۔ اس میں کسی چیز کی کمی ہے، اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس نے زبیر کے ساتھ پندرہ سال گزار دیئے مگر اسے اس کی قدر محسوس نہ ہوئی اگر وہ اپنے امی ابو کو بتا دیتی کہ وہ زبیر کے ساتھ نہیں رہ سکتی تو اس کے والدین اسے زبیر کے ساتھ رہنے پر کبھی مجبور نہ کرتے، کہیں اور اس کی شادی ہو جاتی تو وہ بھی ماں بن چکی ہوتی 'ماں' بننے کی آرزو ہر عورت کرتی ہے۔ ''ماں'' یہ لفظ سننے کیلئے عذرا کے کان ترس گئے تھے۔

عذرا تیار ہو کر پہلے اپنے میکے گئی پھر اپنی دوست خالدہ کے گھر پہنچی، دونوں کافی دیر تک گپ شپ کرتی رہیں، خالدہ کے تین بچوں کو دیکھ کہ عذرا کے دل میں ماں بننے کی خواہش نے سر ابھارا، تھوڑی دیر وہ مغموم رہی پھر ادھر ادھر کی باتوں میں اس کا دھیان بٹ گیا۔ رات دس بجے وہ گھر پہنچی تو زبیر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''اتنی دیر کیسے ہوگئی؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں جب آپ دیر سے آتے ہیں تو میں نے کبھی نہیں پوچھا اور پھر یہ پہلی دفعہ ہی تو ہوا ہے کہ میں آپ کے بغیر اکیلے اتنی دیر باہر رہی، آجکل تو آپ کے پاس میرے لئے تو بالکل ہی وقت نہیں ہے ظاہر ہے میں بھی انسان ہوں تمام دن اکیلے رہتے رہتے اکتا گئی ہوں، خالدہ سے مل کر وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔'' اس نے ایک ہی سانس میں دلی کیفیت کا اظہار کیا اور کپڑے بدلنے کیلئے غسل خانے میں چلی گئی۔ زبیر نے اسے بغور دیکھا، آج وہ بالکل مختلف سی لگ رہی تھی۔ بہت سالوں بعد اس نے جیولری اور اچھے کپڑوں کا استعمال کیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے کی دلکشی میں اضافہ ہوگیا تھا، اس کے علاوہ اس کی گفتگو میں سنجیدگی اور بردباری کا ملا جلا عنصر تھا۔ ان تمام حالات کے پس منظر میں زبیر کی چھٹی حس نے اسے آنے والے خطرے سے کسی حد تک آگاہ کر دیا، وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ معاملہ الجھنے لگا تھا۔

عذرا کی بے رخی اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ عذرا سے چھٹکارا حاصل کر کے سارا کو اپنانا چاہ رہا تھا۔ اب عذرا اس سے دور ہو رہی تھی، اسے یہ بات بھی ناقابل برداشت تھی۔ عذرا کے ہوتے ہوئے سارا اور اس کے گھر والے اس شادی پر کبھی آمادہ نہیں ہوں گے، یہ بات زبیر کو اچھی طرح معلوم تھی، وہ بچوں کی بات کو بنیاد بنا کر عذرا کو طلاق بھی نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس کا اپنا میڈیکل اس کے خلاف تھا۔ اس معاملے کو سلجھانے کی کوئی صورت نہیں بن رہی تھی۔ اس کا ذہن مسلسل اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا، اسی بات کو لے کر اس کی بھوک پیاس سب کچھ ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ بہت دنوں کی سوچ و بچار کے بعد اس نے ایک منصوبہ ترتیب دیا جس کا مقصد یہی تھا کہ سانپ بھی مرے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ پانچ بجے کے قریب بیل بجی عذرا نے دروازہ کھولا۔

''ارے آپ! اتنی جلدی! خیریت تو ہے لگتا ہے طبیعت خراب ہے''۔ عذرا نے ایک ہی سانس میں جملہ پورا کیا۔

''طبیعت وغیرہ سب ٹھیک ہے، میں خود ہی جلدی آ گیا، جلدی سے چائے پلاؤ اور تیار ہو جاؤ، آج رات کا کھانا ہم باہر کھائیں گے''۔ زبیر نے بریف کیس بیڈ روم میں رکھتے ہوئے کہا۔ عذرا کو بڑی حیرت ہوئی کہ آج زبیر کو میرا خیال کیسے آ گیا۔ اس نے جلدی جلدی چائے بنائی اور زبیر کو دی پھر تیار ہونے لگی۔ بڑی مدت بعد آج اس نے اپنے پسند کی نیلی ساڑی استری کر کے پہن لی، اسی مناسبت سے جیولری کا بھی انتخاب کیا، تیار ہو کر وہ دونوں ساڑھے چھ بجے گھر سے نکلے، ساڑھے سات بجے وہ کلفٹن پہنچے۔

''سنئے! مجھے مزار پر جانا ہے''۔ عذرا نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''ہاں! چلو''۔ زبیر نے کہا اور گاڑی وہاں ایک طرف پارک کی۔ عذرا بڑی عقیدت اور احترام کے جذبے کے تحت حضرت عبداللہ شاہ غازی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے زینے طے کرنے لگی وہاں اس نے فاتحہ پڑھی، تھوڑی دیر گزارنے کے بعد وہ واپس آ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے زبیر بھی آ گیا پھر وہ دونوں ساحل کی طرف چل دیئے۔ وہاں لوگوں کا رش تھا۔ زیادہ تر خواتین و حضرات سمندر کی لہروں سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عذرا نے سینڈل ایک طرف رکھے اور خود آہستہ آہستہ چلتی ہوئی پانی میں آگے تک بڑھتی چلی گئی۔ اس کی ساڑی کا بارڈر گیلا ہونے لگا تو گھبراہٹ میں وہ واپس لوٹ آئی۔ زبیر نے کولڈ ڈرنک خریدی اور عذرا کو دی چونکہ اسے ہلکا نزلہ تھا اس لئے اس نے نہیں پی، تھوڑی دیر وہ دونوں گاڑی میں بیٹھے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد زبیر نے کار کا رخ کے ایف سی کی طرف کر دیا وہاں انہوں نے کھانا کھایا، رات کافی دیر بعد وہ گھر پہنچے۔ خلاف معمول آج عذرا بہت خوش تھی، زبیر کی طرف سے جو کڑواہٹ اس کے دل میں تھی وہ دور ہونے لگی۔ پندرہ دن ہو گئے۔ زبیر روزانہ شام چھ بجے تک گھر آ جاتا، کھانا کھانے کے بعد وہ دونوں ایک گھنٹے کیلئے باہر جاتے، تھوڑی دیر آؤٹنگ کرنے کے بعد واپس گھر آتے۔ اس تبدیلی نے عذرا کی صحت پر اچھا اثر ڈالا تھا۔ اب وہ خوش رہنے لگی تھی، طبیعت کی اکتاہٹ اور چڑچڑا پن بھی دور ہو گیا تھا۔

اس نے اپنی دوست خالدہ کو زبیر کی تبدیلی کے متعلق بتایا تو وہ بھی خوش ہو گئی اور عذرا کو سدا خوش رہنے کی دعائیں دیں۔ پہلے جو پڑوسی عذرا سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے، اب وہ بھی اس سے ملنے لگے کیونکہ وہ پہلے سے کافی بدل گئی تھی اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہونے لگی تھی۔

''زبیر صاحب! آج کل آپ گھر جلدی جانے لگے ہیں۔بیگم کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا''۔اس کے دفتر کے دوست اکرم نے پوچھا،اس دوران سارا بھی وہاں موجود تھی۔

''ہاں! کچھ ایسی ہی بات ہے،میرے دفتر آنے کے بعد اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی بھی نہیں ہے۔اس لئے مجھے جلدی جانا پڑتا ہے''۔زبیر نے جھوٹ بولا

زبیر نے عذرا کی وجہ سے اپنے دفتر کے ڈرائیور کو گھر کیلئے بھی ملازم رکھ لیا تھا،اب وہ زبیر کو صبح گھر سے لے جاتا اور شام کو واپس گھر ڈراپ کر دیتا۔اس کے علاوہ اکثر و بیشتر وہ عذرا کو اس کی والدہ کے ہاں ڈراپ کیا کرتا یا پھر کبھی کبھار شاپنگ کروا کر واپس گھر چھوڑ دیا کرتا۔ڈرائیور کی وجہ سے عذرا کو بھی آرام مل گیا تھا ورنہ رکشہ ٹیکسی والوں سے کرائے کی وجہ سے اسے خواہ مخواہ کی جھک جھک کرنا پڑتی تھی۔وہ بہت خوش تھی کہ اب زبیر اس کا بہت خیال رکھنے لگا ہے۔اس بات کا تذکرہ اس نے اپنے والدین سے بھی کیا تھا۔وہ بھی مطمئن ہو گئے تھے کہ چلو بیٹی اپنے گھر میں سکھی ہے۔رات ٹی وی پر خبریں دیکھتے ہوئے زبیر نے نوٹ کیا کہ ٹی وی کا اسکرین بار بار غائب ہو رہا ہے۔

''لگتا ہے ٹی وی کی پکچر ٹیوب خراب ہو گئی ہے''۔زبیر نے عذرا سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''یہ تو بڑا مسئلہ ہو گیا۔پلیز!اسے کل ہی بنوا لیجئے''۔عذرا نے التجا کی۔

''ہاں ٹھیک ہے۔میں دیکھتا ہوں،ٹائم ملا تو الیکٹریشن کو بھجوا دوں گا''۔زبیر نے حامی بھری۔رات دو بجے کراہنے کی آواز پر زبیر کی آنکھ کھلی اس نے دیکھا کہ عذرا درد سے بے چین ہے۔اس نے ماتھا چھو کر دیکھا اسے بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔اس نے عذرا کو پیناڈول کی ایک گولی پانی کے ساتھ کھلا دی تھوڑی دیر بعد وہ سو گیا۔بخار کی وجہ سے صبح عذرا کی آنکھ نہیں کھلی۔زبیر نے اپنے طور پر ہی ناشتہ کیا اور دروازہ لاک کر کے ڈرائیور کے ساتھ دفتر روانہ ہوا۔دس بجے ملازمہ نے بیل بجائی تو عذرا نے اٹھ کر دروازہ کھولا،گھڑی پر نظر پڑی تو دس بجے تھے دفعتاً اسے یاد آیا کہ وہ صبح نہیں اٹھ سکی اور زبیر اسے بتائے بغیر ہی چلا گیا۔باورچی خانے میں جا کر دیکھا تو وہاں چائے کے استعمال شدہ برتن پڑے ہوئے تھے،اسے اطمینان ہو گیا کہ زبیر نے خود ہی ناشتہ کر لیا تھا۔عذرا نے دفتر فون کیا تو زبیر نے اس کی خیریت پوچھی اور اسے تاکید کی کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ جا کر

ڈاکٹر سے دوا لے آئے۔ ملازمہ نے بارہ بجے تک اپنا کام ختم کرلیا۔ عذرا کو کیاریوں اور پودے لگانے کا بہت شوق تھا، اس نے اپنے لان میں مختلف پھولوں کی کیاریاں خوبصورت انداز میں لگائی تھیں۔ وہ روزانہ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد ان پودوں کو پانی دیا کرتی تھی مگر آج اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لئے اس نے پودوں میں پانی ملازمہ سے ڈلوایا۔

ملازمہ کے جانے کے بعد وہ واپس آ کر تھوڑی دیر لیٹ گئی پھر اٹھ کر ناشتہ کیا۔ اس میں کھانا پکانے کی ہمت نہیں تھی، اس نے سوچا وہ کل کا بچا ہوا کھانا دوپہر کو گرم کر کے کھا لے گی، بخار کی وجہ سے اسے نقاہت محسوس ہونے لگی تھی، وہ لیٹے لیٹے ڈرائیور کا انتظار کرتی رہی تا کہ اس کے ساتھ اپنے فیملی ڈاکٹر کے پاس جا سکے۔ ڈرائیور کے انتظار میں وہ سوتی رہی اور وقت کا پتہ ہی نہیں چل سکا۔ دوپہر دو بجے دروازے کی بیل پر اس کی آنکھ کھلی اس نے بڑبڑاتے ہوئے دروازہ کھولا۔

''تم! اتنی دیر سے آئے ہو۔ اب ڈاکٹر کلینک میں کہاں ہوگا؟'' اس نے ڈرائیور خان محمد سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ گاڑی بھی ہماری نہیں ہے''۔ عذرا نے حیرانگی سے پوچھا۔

''یہ میرا دوست ہے، آپ کی گاڑی صاحب اپنے ساتھ کسی کام سے لے گیا ہے۔ یہ میرے دوست کی گاڑی ہے۔ صاحب نے آپ کا ٹی وی جو خراب ہے، وہ منگوایا ہے، میں اسے صدر میں ٹھیک کرانے کیلئے دوں گا''۔ ڈرائیور نے وضاحت کی۔ اس نے گاڑی بالکل گیٹ کے برابر ہی کھڑی کر دی تھی چونکہ عذرا نیند سے بیدار ہوئی تھی اور اسے بخار بھی تھا، لہٰذا اس نے غور ہی نہیں کیا کہ گاڑی پر نمبر پلیٹ موجود نہیں تھی۔

''اچھا! چلو تم لوگ ڈرائنگ روم کے پاس کھڑے رہو، میں ٹی وی کا پلگ وغیرہ نکال لیتی ہوں پھر تم لوگ اسے لے جانا''۔ عذرا نے خان محمد سے کہا اور ٹی وی لاؤنج کی طرف بڑھی، اسے اپنے پیچھے آہٹ سنائی دی، اس نے پلٹ کر دیکھا تو ڈرائیور اور اس کا دوست اس کے پیچھے ہی آ رہے تھے۔

''ارے! تم لوگ کیوں آ رہے ہو، وہیں کھڑے رہو''۔ اس نے ناگواری سے کہا، ڈرائیور نے کچھ کہنے کی بجائے اسے بالوں سے پکڑ کر باہر کی طرف گھسیٹا۔ وہ چیخنے کی کوشش کرنے لگی تو ڈرائیور کے ساتھی نے مضبوطی

سے اس کا منہ بند کر دیا۔ ڈرائیور نے کچن میں رکھا لوہے کا سریا اٹھایا اور زور سے عذرا کے سر پر مارا۔ اس کے سر سے خون کا فورہ نکلا اور وہ بیہوش ہوگئی پھر ان دونوں نے مل کر اس کے ہاتھ پیچھے سے باندھے اور اسے لاؤنج میں پنکھے پر گلے میں رسی ڈال کر لٹکایا تا کہ وہ زندہ ہی نہ بچے اور مر جائے۔ اس کے زندہ بچ جانے کی صورت میں وہ خود مر جاتے، اس کو پنکھے سے لٹکانے کے بعد انہوں نے باتھ روم میں منہ ہاتھ دھویا وہاں سے ہر قسم کے نشانات کو مٹا دیا ہاں البتہ لاؤنج میں عذرا کا خون بہہ رہا تھا۔ یہ کاروائی انہوں نے پچیس منٹ میں مکمل کی پھر فون کے ذریعے کسی کو اپنی کامیابی کی اطلاع دی اس کے بعد ٹیلی فون کا تار کاٹ کر فون سیٹ بھی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اس کے علاوہ الماری وغیرہ کی تلاشی میں جو زیورات اور روپے ان کے ہتھے چڑھے اسے بھی انہوں نے رکھ لیا۔ کمروں میں سامان اس طرح بکھیرا کہ یہ ڈکیتی کی واردات محسوس ہو، یہ سب کام مکمل کرنے کے بعد وہ اطمینان سے دروازہ باہر سے لاک کر کے گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔

چونکہ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا، خواتین عموماً اس وقت گھروں میں آرام کرتی ہیں، چوکیدار کی ڈیوٹی رات آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک ہوتی ہے، محلے کے پندرہ گھروں نے مل کر ایک چوکیدار کو ملازمت پر رکھا تھا، دن کی ڈیوٹی پر کوئی معمور نہیں تھا۔ عذرا اور محلے کی خواتین دن کے وقت دروازہ اندر سے بھی لاک کرتی تھیں تا کہ باہر سے کوئی دروازہ کھول کر اندر آسانی سے داخل نہ ہو سکے یہی وجہ تھی کہ زبیر بھی دروازے پر بیل بجایا کرتا تھا کیونکہ عذرا اندر سے بھی کنڈی لگا لیا کرتی تھی۔ شام چھ بجے زبیر نے دروازے پر بیل دی۔ کافی دیر تک وہ بیل بجاتا رہا مگر وہ نہ نکلی، بار بار بیل بجنے کی آواز پر برابر والی پڑوسن باہر آ گئی۔

''کیا ہوا بھائی جان''؟۔ پڑوسن نے سوال کیا۔

''کافی دیر سے بیل بجا رہا ہوں۔ عذرا دروازہ نہیں کھول رہی ہے''۔ زبیر نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''ہاں! میں نے بھی اسے صبح سے نہیں دیکھا ورنہ جب وہ دوپہر سودا لینے کیلئے جاتی ہے تو مجھ سے مل کر جاتی ہے آج وہ نہیں آئی''۔ پڑوسن نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔

''رات اسے بخار تھا، مجھے دفتر کیلئے دیر ہو رہی تھی، اس لئے میں نے اپنے طور پر خود ہی نے ناشتہ کر لیا تھا، اس کی طبیعت کی وجہ سے اسے جگایا بھی نہیں''۔ زبیر نے تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ سامنے والی خالہ بھی باہر نکل آئیں۔انہوں نے بتایا کہ دوپہر فرزانہ یعنی ملازمہ عذرا کا کام کر کے پھر ہمارے ہاں آئی تھی ،فرزانہ نے بتایا کہ عذرا کو بخار تھا اور وہ ڈاکٹر کے پاس جانے والی تھی۔

زبیر نے پھر بیل بجائی کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔

''ہوسکتا ہے ڈاکٹر کے پاس گئی ہو''۔خالہ نے زبیر کو پریشان دیکھ کر کہا

''ڈاکٹر کے پاس کیسے جاسکتی ہے؟ میں نے گاڑی بھجوائی ہی نہیں ، مجھے آج کے دفتر کے ایک ضروری کام سے ویسٹ ہارف جانا تھا، وہاں میری میٹنگ تھی ، وہیں پر کافی دیر ہوگئی تھی اب اسے لے کر جاؤں گا''۔زبیر نے معصومیت سے کہا۔

''آپ اپنی چابی سے گیٹ کھولیں''۔پڑوسن نے تجویز پیش کی۔

''چابی سے کھول کر بھی کیا فائدہ۔اس نے اندر سے کنڈی لگائی ہوگی''۔زبیر نے وضاحت کی

''ہوسکتا ہے وہ اپنے طور پر ہی ڈاکٹر کے پاس گئی ہو؟''خالہ نے اپنی رائے دی۔زبیر نے بریف کیس کھول کر اس میں سے چابی نکالی اور دروازہ کھولنے لگا۔دروزاہ آسانی سے کھل گیا۔اس نے باہر کھڑی گاڑی گیٹ کے اندر لی اور گیٹ دوبارہ بند کرنے لگا۔اس تمام عمل کے دوران عذرا کی پڑوسنیں باہر کھڑی رہیں پھر خالہ گیٹ کے اندر داخل ہوئی۔اس سے آگے زبیر بریف کیس لئے اندر لاؤنج میں داخل ہوا۔

''یا اللہ! یہ کیا ہوا! ارے دیکھو تو''۔وہ پاگلوں کے انداز میں چیخا، باہر کھڑی پڑوسن بھی ننگے پیر خالہ کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔شور کی آواز سن کر محلے کے بچے بھی بھاگے چلے آئے ، دیکھا تو عذرا خون میں لت پت پنکھے سے لٹکی ہوئی تھی۔اس کے ہاتھ بھی پیچھے بندھے ہوئے تھے، خالہ نے بھی چیخ ماری۔تمام محلے کے لوگ جمع ہو گئے کسی نے 15 کو اطلاع کی تھوڑی دیر بعد پولیس موبائل بھی آ گئی پھر سب نے مل کر عذرا کی لاش اتاری۔ اسے پوسٹ مارٹم کے لئے پولیس اور زبیر گورنمنٹ ہسپتال لے گئے ۔عذرا کے والدین کو اطلاع ملی تو وہ بھی روتے پیٹتے آ گئے ۔پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق اس کی موت دوپہر دو سے تین بجے کے درمیان سر کی چوٹ سے واقع ہوگئی تھی، پنکھے پر لٹکانے سے نہیں ہوئی تھی۔گھر سے زیورات اور روپے بھی غائب تھے، سامان

بکھرا ہوا تھا۔

''یہ واردات کسی جاننے والے نے کی ہے''۔ انسپکٹر نے تمام کمروں اور لاؤنج کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''اگر جاننے والا نہ ہوتا تو وہ صرف زیوارت اور روپے لے جاتا۔ عذرا کی جان نہ لیتا۔ جس بیدردی اور بے رحمی سے اسے قتل کیا گیا ہے، وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ڈاکو یا قاتل اس کو جان سے ہی مارنا چاہتا تھا پھر ایک بات اور بھی اہم ہے کہ خاتون نے خود ہی نے کسی شناخت پر ہی آنے والے کیلئے دروازہ کھولا تھا کیونکہ اندر کی کنڈی صحیح سلامت ہے۔ یہ واردات ڈکیتی کی نہیں بلکہ ڈکیتی ظاہر کرنے کے لئے کی گئی ہے''۔ انسپکٹر نے آخری جملے پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مسٹر زبیر! آپ کی یا آپ کی مسز کی کسی سے دشمنی تو نہیں تھی؟'' انسپکٹر نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں تو ہماری کسی سے کیا دشمنی ہوگی۔ میں صبح کا گیا شام کو آتا اور عذرا تو محلے میں کم آیا جایا کرتی تھی، وہ زیادہ تر گھر ہی پر رہنا پسند کرتی تھی''۔ زبیر نے آنسوؤں کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کی بیٹی سے کسی کی دشمنی تو نہیں تھی''۔ انسپکٹر نے عذرا کے والدین سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''ہماری بیٹی اولاد نہ ہونے کی وجہ سے چڑچڑی تو ضرور تھی مگر وہ ساری تکالیف اپنے آپ ہی جھیل رہی تھی، اپنی ذات سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں دی''۔ عذرا کے ابو نے روتے ہوئے کہا۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ اولاد نہ ہونے کی بناء پر آپ کے داماد اسے ٹیس کر رہے ہوں''۔ انسپکٹر نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات اس لئے نہیں ہوسکتی کہ میری بیٹی کا میڈیکل کلیئر تھا۔ ہاں البتہ زبیر کی وجہ سے بچے نہیں ہوئے''۔ اس کے ابو نے انسپکٹر کا شک دور کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی آپ خود چلاتے ہیں یا ڈرائیور بھی ہے''۔ انسپکٹر نے اگلا سوال زبیر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''عموماً گاڑی میں خود ڈرائیو کرتا ہوں مگر ایک دو مہینے ہوگئے، میں نے دفتر کے ڈرائیور کو رکھ لیا تھا تاکہ عذرا کو

آنے جانے کی سہولت حاصل ہو۔ وہ روزانہ صبح مجھے پک کرتا اور شام کو ڈراپ کر کے چلا جاتا اکثر وہ دوپہر یا سہ پہر کو عذرا کو بازار یا اس کی امی کے گھر چھوڑ آتا"۔ اس نے تفصیل سے بتایا۔

"کیا وہ آج بھی آپ کو دفتر لے گیا تھا"۔ انسپکٹر نے پھر پوچھا۔

"ہاں! وہ صبح مجھے گھر سے دفتر لے گیا تھا پھر وہاں سے دوپہر دو بجے میری ویسٹ ہارف میں ایک میٹنگ تھی وہ میرے ساتھ گیا تھا۔ ہم وہاں سے پانچ بجے دفتر لوٹے تھے چونکہ وہ کافی تھک گیا تھا اس لئے میں نے اسے اپنے ساتھ آنے سے منع کیا اور خود گاڑی ڈرائیو کر کے آ گیا"۔ زبیر نے اس کی پوزیشن کلیئر کی۔

"ڈرائیور کہاں رہتا ہے؟"۔ اس نے پھر پوچھا

"وہ شاہ فیصل کالونی میں رہتا ہے"۔ زبیر نے مختصر جواب دیا۔ انسپکٹر صبح آنے کا کہہ کر چلا گیا۔

عذرا کی لاش ایدھی سرد خانے میں رکھوا دی گئی۔ اگلی دوپہر نماز ظہر کے وقت اسے دفنانے کا پروگرام بنایا گیا۔

صبح سویرے ڈرائیور خان محمد آیا۔ گھر کے باہر شامیانہ دیکھ کر اس نے محلے والوں سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ لوگوں نے بتایا کہ زبیر صاحب کی بیوی کا قتل ہو گیا ہے۔ وہ اداس ہو گیا۔ زبیر کے دفتر کے لوگ بھی تعزیت کیلئے پہنچ گئے مگر سارا نہیں آئی۔

"تم کل کہاں تھے؟" انسپکٹر نے صبح آتے ہی ڈرائیور سے سوال کیا۔

"میں صاحب کو لے کر دفتر گیا تھا وہاں سے دو بجے ہم ویسٹ ہارف گئے تھے پھر ہم پانچ بجے دفتر واپس آئے" خان محمد نے جواب دیا۔

"اس عرصے کے دوران تم کیا کرتے رہے؟" انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔

"میں نے وہاں کینٹین میں کھانا کھایا پھر واپس آ کر گاڑی میں سو گیا"۔ خان محمد نے مختصراً کہا۔

"کوئی ایسا گواہ ہے جس نے تمہیں وہاں دو ڈھائی گھنٹے آرام کرتے دیکھا ہے"۔ انسپکٹر نے سختی سے پوچھا۔

"ہاں کینٹین والا بتا سکتا ہے کیونکہ میں نے کھانا وہیں پر کھایا تھا۔ اس کے علاوہ گاڑی بھی کینٹین کے سامنے کھڑی کی تھی تقریباً پونے چار بجے میں نے چائے وہیں پر پی لی تھی"۔ خان محمد نے تفصیل سے بتایا۔

دوسرے دن انسپکٹر جواد اس کینٹین پر پہنچا تو خان محمد کی بات درست ثابت ہوئی، وہ واقعی وہیں پر موجود تھا لہٰذا

ڈرائیوراس واردات سے بری ہو چکا تھا۔

عذرا کے قتل کو چھ دن ہو چکے تھے مگر قاتل کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔اس کے والدین، محلے والے سب ہی پریشان تھے محلے والے تو بہت ہی خوفزدہ تھے۔ خالہ اور پڑوسن باہر نکلتے ہوئے ڈرنے لگی تھیں۔ زبیر اداس اور پریشان تھا۔عذرا کے والدین اور دیگر رشتہ دار اسے دلاسے دیتے مگر وہ خاموش اور سنجیدہ ہو گیا تھا۔کھانا بھی نہیں کھا رہا تھا۔ پولیس والے دن میں دو بار ضرور آتے کہ شاید کوئی نئی بات معلوم ہو مگر بے سود۔ یہ گھتی سلجھنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔عذرا کے والدین دس دن تک زبیر کے گھر پر رہے پھر رو پیٹ کر واپس اپنے گھر آ گئے۔

''دیکھو نازیہ! عذرا کی بیل سوکھ رہی ہے، وہ روزانہ کیاریوں اور پودوں کو پانی دیا کرتی تھی۔ یہ حادثہ ایک خواب سا لگتا ہے''۔خالہ نے پڑوسن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں! اچھی تھی بیچاری! اللہ اسے غریق رحمت کرے''۔نازیہ نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''آمین!'' خالہ نے جواباً کہا۔
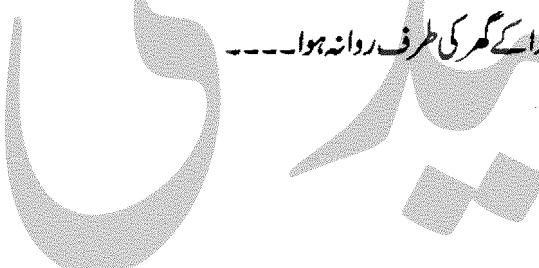
''اللہ نے عذرا کو اولاد نہیں دی اس میں بھی اس کی مرضی تھی اگر آج اس کے بچے ہوتے تو بیچارے یتیم ہو جاتے، یہ حادثہ ہونا ہی تھا پھر اس کے بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا، ہم کب تک زندہ رہتے''۔عذرا کے ابو نے دکھی انداز میں کہا۔

''مگر اسے اولاد کی خواہش بہت تھی۔قسمت میں ہی نہیں تھی ورنہ شاید وہ نہ مرتی۔اس کے بعد اس پر فاتحہ پڑھنے والا تو کوئی ہوتا۔ہم جب تک زندہ ہیں اپنی بیٹی کی مغفرت کیلئے دعائیں کرتے رہیں گے۔ ہمارے بعد کون کرے گا؟'' اس کی امی پلو سے آنسو صاف کرتے ہوئے بولیں۔

''آنٹی! عذرا بہت خوش تھی، مجھ سے کہہ رہی تھی کہ آج کل زبیر میرا بہت خیال رکھتے ہیں، انہوں نے ڈرائیور بھی رکھ لیا ہے، اس کی وجہ سے مجھے ہر جگہ آنے جانے کی آسانی ہو گئی ہے۔اب میں بہت خوش ہوں اکثر ہم کھانا بھی باہر کھاتے ہیں، مجھے کیا پتا تھا کہ اس کی یہ خوشی مختصر عرصے کے لئے ہوگی''۔خالدہ نے لاہور سے فون کر کے عذرا کی ماں کو بتایا اور ہچکیوں سے رونے لگی۔عذرا کی ماں کا بھی دل بھر آیا، ان کے بھی آنسو جاری ہو گئے۔

اتوار کا دن تھا۔ عذرا کے انتقال کو پچیس دن ہو چکے تھے۔ زبیر نے عذرا کی الماری کھولی اس میں سے فریم نکل کر گرا مگر وہ ٹوٹا نہیں، اس خوبصورت فریم میں عذرا اور زبیر کی شادی کی تصویر تھی۔ یہ تصویر خود زبیر نے شادی کی پہلی سالگرہ پر فریم میں لگوا کر عذرا کو گفٹ کی تھی۔

''مجھے معاف کر دو۔ مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔ میں بالکل ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا مگر سارا کی خاطر مجھے وہ کرنا پڑا جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس موقع کے لئے مجھے تمہاری توجہ حاصل کرنا ضروری تھا ورنہ اتنی خوبصورتی سے یہ تمام معاملات حل نہ ہوتے، کسی کو شک بھی نہیں ہوا الٹا تمام لوگ مجھ سے ہمدردی کرتے ہیں، مرتے ہوئے تمہارے گمان میں بھی نہ ہوگا کہ تمہارا قاتل میں ہی ہوں گا کیونکہ دنیا اور تمہاری نظروں میں، میں ایک بزدل اور بے ضرر انسان ہوں سارا اور اس کے گھر والے بھی مجھ پر اس حادثے کے باعث بہت مہربان ہیں۔ اب میرے راستے میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں رہی، سب کچھ میری مرضی اور منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔ مجھے تمہاری ناگہانی موت کا بہت افسوس ہے''۔ زبیر نے خود کلامی کی اور فریم کو واپس الماری میں کپڑوں کے پیچھے رکھ دیا پھر گاڑی نکالی اور گنگناتا ہوا سارا کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔۔۔

"وقت کا پہیہ"

"پرسوں عید ہے شاپنگ کے لئے نہیں جانا ہے۔" روزینہ نے ناشتہ تیار کرتے ہوئے وقار سے پوچھا۔

"میرے پاس پیسے نہیں ہیں شاپنگ کیسے ہوگی؟" اس نے اخبار کی سرخی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟ یہ ہماری شادی کی پہلی عید ہے، دو ماہ قبل تو شادی ہوئی ہے۔ پہلی عید پر شاپنگ بھی نہیں کرائیں گے؟" روزینہ نے حیرت کا اظہار کیا۔

"اب پیسے نہیں ہیں تو کیا چوری کروں؟ کچھ تو خیال کرو" اس نے تیز لہجے میں کہا۔

روزینہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس کا دل بجھ کر رہ گیا۔ وقار کا رویہ شادی کے ایک ماہ بعد ہی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ اس سے عمر میں بارہ تیرہ سال بڑا اور شادی شدہ تھا۔ اس کی بیوی فوزیہ اور دو بچے الگ رہتے تھے۔ یہ شادی وقار اور روزینہ کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی۔ وقار نے یہ شادی اپنی پسند جبکہ روزینہ نے مجبوری کے تحت کی تھی، اس مجبوری میں اس کے گھریلو حالات تھے۔

شادی سے قبل وقار نے کافی لگی لپٹی باتیں کی تھیں کہ اس کی بیوی پھوہڑ ہے۔ ان دونوں کا مزاج نہیں ملتا، وہ شکی مزاج ہے لہٰذا ان دونوں کے درمیان کوئی دلی وابستگی نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں سن سن کر روزینہ کو وقار سے ہمدردی ہو گئی تھی اور وہ اس کی باتوں میں آ گئی تھی۔ روزینہ اور وقار دونوں الگ الگ دفتروں میں ملازم تھے مگر یہ دفتر ایک ہی اپارٹمنٹ میں واقع تھے۔ چھٹی کے وقت دونوں اکٹھے ہی جایا کرتے تھے۔ وہ واپسی پر روزینہ کو اس کے گھر کے قریب ڈراپ کیا کرتا تھا اور خود آگے نکل جاتا کیونکہ اس کا گھر مارٹن روڈ پر تھا۔ ملاقات کے تھوڑے عرصے بعد ہی وقار اور روزینہ کی شادی ہو گئی تھی حالانکہ اس کے گھر والوں نے بہت سمجھایا تھا کہ وہ یہ شادی نہ کرے ورنہ وہ زندگی بھر پریشان رہے گی، ناتجربہ کاری کی بناء پر انجانے میں اس سے یہ غلطی ہو چکی تھی۔ شادی کے بعد اس نے نوکری چھوڑ دی تھی اور اپنے والدین سے دور ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتی تھی۔ وقار فلیٹ کا کرایہ بھی مشکل ہی سے ادا کرتا تھا۔ کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کے اخراجات میں بھی بہت تنگ کیا کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر اپنے والدین کے گھر کھانا کھایا کرتی اور وقار اپنی پہلی بیوی کے گھر بچوں کے ساتھ

کھانا کھا کر آتا تھا اور صبح کا گیارات کبھی ایک بجے کبھی دو بجے واپس آیا کرتا۔ گھر آنے کے بعد بھی اس کا موڈ اکثر خراب ہی رہتا۔ روزینہ سے شادی کے بعد اب اسے گلٹی محسوس ہونے لگی تھی۔ لاشعوری طور پر اس کا جھکاؤ فوزیہ کی طرف ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت فوزیہ اور بچوں کا تذکرہ کیا کرتا۔ ان سے ملنے کی تڑپ شدت اختیار کر لیتی تو حیلے بہانے سے زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزارہ کرتا۔ روزینہ کے لئے یہ تمام باتیں ذہنی اذیت کا باعث بنتی رہیں۔ وہ تمام دن اور رات دیر گئے تک تنہا گھر میں وقار کے انتظار میں بیٹھی رہتی، دل گھبرا جاتا تو تھوڑی دیر ٹی وی دیکھتی پھر آف کر کے لیٹی رہتی اس کے باوجود وقت گزارنا مشکل ہو جاتا۔

''روزینہ باجی! عید کے کپڑے خرید لیے کیا؟'' اس کی چھوٹی بہن فرح نے پوچھا۔ روزینہ عید سے ایک دن قبل میکے آئی تھی۔

''نہیں خریدے'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔ اس کی امی شکیلہ نے اس کی طرف دیکھا۔ روزینہ نے بات بدل دی۔

''فرح تم نے عید کے لئے کیا بنوایا ہے؟'' روزینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''باجی! میں نے چوڑی دار پاجامہ اور کام والا کرتا سلوایا ہے۔ کلر بھی بہت خوبصورت ہے'' فرح نے خوش ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''روزینہ! یہ لو''۔ شکیلہ نے ایک شاپر بیٹی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''اس میں کیا ہے''۔ اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کھول کر دیکھ لو'' شکیلہ نے سنجیدگی سے کہا۔

روزینہ نے شاپر کے اندر سے ایک شوخ گلابی رنگ کا سلا ہوا سوٹ نکالا۔ یہ بہت خوبصورت سلا ہوا تھا اس کے علاوہ قمیض کی آستین اور گلے پر ہلکا سلور کلر کا کام بنا ہوا تھا۔

''یہ سوٹ میں نے تمھارے لئے خریدا تھا تا کہ تم عید پر پہن سکو'' شکیلہ نے پرس کھولتے ہوئے کہا پھر اس نے پرس سے دو سو روپے کے نوٹ نکالے اور روزینہ کو دیئے تا کہ وہ چوڑیاں خرید لے۔

روزینہ نے وہ سوٹ واپس شاپر میں ڈال دیا اور دو سو روپے امی کے ہاتھ سے لئے۔ اسے امی سے سوٹ لے کر

وہ خوشی محسوس نہیں ہوئی جو وقار سے سوٹ لینے میں ہوتی۔

''باجی صدر چلیں، وہاں سے میں جوتے خریدلوں گی آپ چوڑیاں بھی لے لینا'' فرح نے روزینہ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ابھی تھوڑی دیر میں چلیں گے'' اس نے لمبی سانس لیتے ہوئے حامی بھری۔ ایک گھنٹے بعد فرح اور وہ دونوں صدر کی طرف روانہ ہوئیں۔ روزینہ نے زیب النساء اسٹریٹ سے فرح کو اس کی پسند کا سینڈل خرید کر دیا پھر اپنی چوڑیاں خریدنے کے لئے بوہری بازار کی طرف چل دی۔

''باجی! ذرا ادھر دیکھئے''۔ فرح نے ایک دکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایک ریڈی میڈ گارمنٹ کی دکان پر وقار فوزیہ اور دونوں بچوں سمیت شاپنگ میں مصروف تھا۔ اس کے ہاتھوں میں جوتوں کے بھی تین ڈبے تھے۔ روزینہ وقار کو دیکھ کر ایک کپڑے کی دکان کی آڑ میں چھپ گئی اور وہیں سے اس کی حرکات نوٹ کرتی رہی۔ شاپنگ کے بعد وقار نے ویلٹ سے کئی نوٹ نکال کر دکاندار کو دیئے اور شاپرز پکڑ کر آگے کی طرف نکل گیا۔ یہ تمام منظر دیکھنے کے بعد روزینہ کا موڈ خراب ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ واپس آنے کیلئے مڑی۔

''باجی! چوڑیاں نہیں خریدیں گی''۔ فرح نے سوال کیا۔

روزینہ نے ایک لمحے کے لئے سوچا کہ اس کی امی نے پیار سے اسے دوسو روپے چوڑیوں کے لئے دیئے تھے اگر وہ نہیں خریدے گی تو انہیں دکھ ہوگا لہٰذا بادل نخواستہ اس نے گلابی رنگ کی چوڑیاں خریدیں اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔

آج چاند رات تھی، تمام سرکاری اور نجی اداروں میں چھٹی تھی۔ وقار صبح ہی سے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے گھر سے چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے روزینہ کو اس کے میکے میں چھوڑ دیا تھا۔

فرح نے گھر آ کر امی کو وقار کے متعلق بتایا۔ روزینہ کا بھائی کمال بھی موجود تھا۔ وہ بینک میں ملازم تھا فی الحال اس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔

''روزینہ تمھارے ایک غلط فیصلے نے ہم سب کو بہت دکھی کر دیا ہے''۔شکیلہ نے بیٹی سے مخاطب ہو کر کہا وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

''اگر میری بات مانو تو اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔تم وقار سے علیحدگی اختیار کرلو کیونکہ تمہارے بچے نہیں ہوئے ورنہ بچوں کے بعد تمھارے مسائل اور بھی بڑھ جائیں گے''۔انہوں نے بیٹی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں امی !فی الحال میرا کوئی ایسا ارادہ نہیں ہے''روزینہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''یہاں آؤ''اس کے بھائی کمال نے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا

''یہ رکھ لو''اس نے ایک سفید لفافہ اس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔اس نے خاموشی سے وہ لفافہ پرس میں رکھ لیا۔روزینہ نے دل میں سوچا کہ اس کی شادی سے گھر کے تمام لوگ پریشان ہیں وقار کی لاپروائی اور خود غرضی نے اسے گھر والوں سے مالی امداد لینے پر مجبور کر دیا ہے۔وہ اپنی نظروں میں خود کو مجرم سمجھنے لگی تھی،تھوڑی دیر میکے میں گزارنے کے بعد وہ اپنے گھر چلی آئی۔وقار ابھی تک گھر نہیں لوٹا تھا۔

اس نے شاپرز سے امی کا دیا ہوا جوڑا نکالا اور اس پر استری کی۔چوڑیاں ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیں۔پرس سے بھائی کا دیا لفافہ کھولا۔اس میں ڈھائی ہزار روپے تھے۔اس نے دو ہزار روپے الماری میں رکھے اور پانچ سو روپے لے کر بازار گئی وہاں سے شیر خورمے اور کھانے کا سامان خریدا اور واپس گھر آگئی۔افطاری کا وقت ہونے والا تھا مگر وقار صبح کا گیا اب تک گھر نہیں لوٹا تھا۔اس نے فرج سے کھجوریں،کسٹرڈ اور شربت کا گلاس نکال کر ٹیبل پر رکھا کیونکہ اس کا روزہ تھا اور افطاری کا وقت ہونے والا تھا۔

سائرن بجا پھر اذان بھی ہوگئی۔اس نے روزہ افطار کیا پھر نماز کے لئے کھڑی ہوگئی۔نماز کے بعد گھر کی صفائی میں لگ گئی۔بستر کی چادر تبدیل کی۔فرنیچر کی ڈسٹنگ کے بعد وقار کا ایک رکھا ہوا جوڑا نکالا اور اس پر استری کرنے لگی۔

اچانک دروازے پر بیل ہوئی۔اس نے دروازہ کھولا۔دروازے پر وقار کھڑا تھا۔اس کے ہاتھوں میں ایک پیکٹ موجود تھا۔وہ منہ بنائے اس کے پیچھے آنے لگی۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟''وقار نے حیرت سے پوچھا۔

''آپ کی شلوار قمیض پر استری کر رہی ہوں۔'' اس نے دھیمے سے کہا۔

''میں کلف والا کرتا شلوار دھوبی سے لے آیا ہوں۔ اسے ہینگر پر ٹانک دو''۔ اس نے وہ پیکٹ روزینہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''آپ صبح کے گئے ابھی آئے ہیں۔ مجھے بازار بھی نہیں لے گئے؟ کم از کم چوڑیاں ہی خرید دیں۔'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں تھک گیا ہوں پھر میرے پاس پیسے بھی تو نہیں ہیں، صبح سے پیسوں کے انتظام میں ہی لگا ہوا تھا مگر کہیں سے پیسے نہیں ملے''۔ اس نے صاف جھوٹ بولا۔

''ہاں! وہ تو میں نے صدر میں دیکھ لیا تھا کہ پیسوں کا انتظام آپ کس کے لئے کرنے گئے تھے، فوزیہ اور بچوں کو شاپنگ کراتے ہوئے صرف میں نے ہی نہیں بلکہ فرح نے بھی دیکھا تھا۔'' روزینہ نے غصے میں کہا۔

''تو گویا اب تم جاسوسی بھی کرنے لگی ہو۔ اپنے کام سے کام رکھا کرو۔ میرے معاملات میں زیادہ دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔'' وقار نے بجائے شرمندہ ہونے کے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''فوزیہ اور بچے آپ کے معاملات ہیں اور میں کسی کی ذمہ داری ہوں۔'' اس نے تنگ آ کر کہا۔

''جب تمہیں پتہ تھا کہ میں شادی شدہ مرد ہوں تو تم نے مجھ سے شادی کیوں کی تھی جبکہ میرے بچے بھی تھے۔'' اس نے چیخ کر کہا۔

''آپ نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کو اپنی بیوی بچوں سے اتنا پیار ہے تو میں آپ سے شادی کیوں کرتی۔'' روزینہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''چلو اب تو معلوم ہو گیا نا۔ اب کیا کرو گی؟'' اس نے پیر پٹختے ہوئے کہا۔ روزینہ روتے ہوئے بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ پندرہ بیس منٹ بعد وقار نے اسے منانے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔

''چلو بازار چلتے ہیں۔'' وقار نے اسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''میرا موڈ نہیں ہے۔ میں نہیں جاؤں گی۔ پیار محبت میں زبردستی کا سودا نہیں ہوتا اگر آپ کو میرا خیال ہوتا تو مجھے بھی شاپنگ کراتے، مجھ سے شادی کے بعد اچانک فوزیہ سے محبت کا جذبہ کیسے پیدا ہو گیا۔ آپ کی اس سے

ذہنی ہم آہنگی تو نہیں تھی، یہ جملہ آپ ہی کہا کرتے تھے پھر اب ذہنی وابستگی کیسے ہوگئی؟'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''دیکھو! تنگ نظر نہ بنوں۔ تمہیں اسے برداشت کرنا ہی ہوگا۔'' وقار نے سخت لہجے میں کہا۔

''آپ عجیب باتیں کر رہے ہیں، تمام دن آپ ان لوگوں کے ساتھ رہے، انہیں شاپنگ کرائی۔ کیا میں نے آپ کو روکا تھا، مجھے تو پتا بھی نہیں ہوتا کہ آپ کب اور کس وقت ان لوگوں سے ملنے جاتے ہیں پھر الٹا مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں یہ تمام باتیں برداشت کرلوں۔ کیا فوزیہ اتنی کشادہ نظر ہے کہ وہ مجھے برداشت کرلے۔'' روزینہ نے چیخ کر کہا۔

''وہ بے چاری تو تمہیں برداشت کر ہی رہی ہے۔ روتی رہتی ہے اور مجھ سے شکوہ کرتی ہے۔ بچے الگ پریشان ہیں۔ میں کیا کروں، کہاں جاؤں''؟۔ اس نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔

''ہاں اب تو وہ بے چاری ہے، پہلے وہ ایک ظالم اور لڑاکا عورت تھی۔ مجھ سے شادی کے بعد وہ ستی ساوتری ہوگئی۔'' روزینہ نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''زیادہ بحث نہ کرو، انسان ایک کتا بھی پالتا ہے تو اس سے محبت ہو جاتی ہے پھر وہ میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں ہے۔ میں اسے کیسے نظر انداز کردوں۔'' وقار نے صفائی پیش کی۔

''آپ سے بات کرنا فضول ہے۔ میں اصول کی بات کر رہی ہوں۔ آپ عورتوں کے انداز میں اپنا مدعا بیان کر رہے ہیں''۔ اس نے چڑ کر کہا۔

''تم بلا وجہ طیش دلا رہی ہو۔'' وقار نے آہستگی سے کہا۔

''اس میں طیش میں آنے کی کیا بات ہے۔ یہ ہماری پہلی عید ہے۔ آپ کو خود ہی میرا خیال کرنا چاہیے۔ پہلی عید پر ہاتھوں میں مہندی بھی نہ رچی ہو تو گھر والے اور پڑوسی کیا سوچیں گے؟ آپ مہندی بھی خرید کر نہیں لائے۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''مہندی تو تم بھی خرید کر لا سکتی تھیں، میرا ساتھ جانا ضروری تھا۔'' وقار نے جواز پیش کیا۔

''آپ نے ٹھیک کہا، میرے ساتھ آپ کا جانا ضروری نہیں۔ فوزیہ کے ساتھ جانا زیادہ ضروری تھا۔'' اس نے

طنز کیا۔

''تم ہر بات میں فوزیہ کا نام مت لو، اس کا اور تمہارا کیا مقابلہ۔ وہ ایک صابر عورت ہے۔ میری بے وفائی جھیل کر بھی وہ خاموش ہے اور تم واویلہ مچارہی ہو۔'' اس نے روزینہ کو کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

روزینہ خاموش ہوگئی، اس نے وقار سے مزید کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ وہ کوئی بات سمجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی تمام تر ہمدردیاں فوزیہ کے ساتھ تھیں۔ اپنے سلسلے میں اسے قائل کرنا مشکل تھا لہٰذا دیوار سے سر ٹکرانے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں جا کھڑی ہوئی، نیچے ایک میلے کا سماں تھا۔ بچے، بڑے، نوجوان اور خواتین ٹولیوں کی شکل میں بازاروں کی طرف رواں دواں تھیں۔ دکانوں پر قمقموں کی جھالریں جگ مگ کررہی تھیں۔ وہ کافی دیر تک یہ مناظر دیکھتی رہی پھر اندر کی طرف پلٹی تو وقار بستر پر سو رہا تھا۔ اس شخص کے ساتھ گزارہ مشکل ہے۔ اس کے تمام ارمان پورے ہوچکے ہیں، اس لئے اسے کسی دوسرے کے جذبات کا احساس نہیں۔ اس نے دل ہی دل میں سوچا اور زیر لب وقار کو کوسنے دیتے ہوئے وہ بھی جا کر سوگئی۔

صبح عید تھی۔ روزینہ نے وقار کو جگایا وہ بھی اٹھ بیٹھا اور عید کی نماز پڑھنے کی تیاریوں میں لگ گیا۔ وہ کپڑے بدل کر عیدگاہ کی طرف چلا گیا۔ روزینہ نماز پڑھنے کے بعد شیر خورمہ تیار کرنے لگی تقریباً ایک گھنٹے بعد وقار واپس آیا، گھر آنے کے بعد اس نے صرف دو سو روپے روزینہ کو عیدی دی، ناشتہ کیا اور فوزیہ کی طرف جانے کے لئے روانہ ہوا۔

''اب کہاں جارہے ہیں''۔ اس نے مختصراً پوچھا

''ظاہر ہے بچوں سے ملنے جارہا ہوں''۔ اس نے تنک کر کہا۔

''واپسی کب تک ہوگی''۔ روزینہ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

''کچھ پتا نہیں۔ جلدی بھی آسکتا ہوں اور دیر بھی ہوسکتی ہے''۔ اس نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

روزینہ نے بالکونی سے جھانکا، وہ اپنی موٹر سائیکل پر سوار ہوکر تیزی سے نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ روزینہ نے ناشتے کے برتن سمیٹ کر کچن میں صاف کیے پھر امی کا دیا ہوا سوٹ پہن لیا اور تیار ہوگئی۔ تیار ہونے کے بعد

اس نے آئینے میں اپنا سراپا دیکھا، وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں پہنیں مگر مہندی نہیں لگی تھی جس سے کمی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بالکل اکیلی اور تنہا اس دو کمرے کے فلیٹ میں قید ہوگئی تھی۔ شدت جذبات سے اس کے آنسو بہنے لگے۔ آنکھوں کا کاجل گالوں پر بہتا ہوا اس کے ڈوپٹے میں جذب ہونے لگا۔ اس نے ٹشو سے کاجل صاف کیا اور اپنے چہرے کو درست کرنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا۔

''عید مبارک ہو۔ اس کے بھائی کمال نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ آپ کو بھی عید مبارک ہو' جواباً اس نے بھی کہا۔

''وقار نہیں ہیں۔ کہاں گئے؟'' کمال نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ ابھی کسی دوست سے ملنے گئے ہیں''۔ اس نے جھوٹ بولا۔

''یہ پہلی عید ہے، تم دونوں کو اس وقت میکے میں ہونا چاہیے تھا''۔

''ہم دونوں نے یہی پروگرام بنایا تھا، ان کے آنے کے بعد ہم آپ کی طرف چکر لگائیں گے''۔ روزینہ نے بات بنائی۔

کمال نے چائے پی اور جاتے ہوئے روزینہ کو پانچ سو روپے عیدی پھر گھر آنے کی تاکید کر کے وہ چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد روزینہ نے اپنا پرس اٹھایا باہر سے فلیٹ کا دروازہ لاک کیا اور خالدہ کی طرف روانہ ہوئی۔ خالدہ اس کے بچپن کی سہیلی تھی۔ روزینہ اس سے اپنی ہر بات شیئر کرتی تھی، خالدہ بھی شادی شدہ تھی، اس کا ایک بیٹا دانیال دو سال کا تھا۔

روزنیہ کو اکیلے دیکھ کر خالدہ پریشان ہوگئی۔ اس نے حقیقت جاننے کی کوشش کی تو روزینہ کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ کافی دیر بعد وہ نارمل ہوئی پھر اس نے تمام قصہ خالدہ کو کہہ دیا۔

''روزینہ! میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم وقار سے شادی نہ کرنا، وہ پکی عمر کا مرد ہے۔ اپنی زیادہ تر لائف اپنی پہلی بیوی کے ساتھ انجوائے کر چکا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے دل میں تمہارے لئے کوئی جذبات نہیں ہیں

کیوں ایسے آدمی کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرنے پر تلی ہو، لعنت بھیجو کمینے پر"۔خالدہ نے اسے سمجھایا۔

"خالدہ! ہوسکتا ہے میرے بچے ہونے کے بعد وہ صحیح ہو جائے" روزینہ نے معصومیت سے کہا۔یہ سب سے بڑی حماقت ہوگی ایسا سوچنا بھی نہیں۔اگر بچے ہوئے تو تمام عمر تمہیں اس کی محتاجی کا سامنا کرنا پڑے گا۔فوزیہ اور بچے اس کی کمزوری ہیں، یہ بات تم اپنے ذہن میں بٹھالو" خالدہ نے زور دیتے ہوئے کہا۔

روزینہ نے دوپہر کا کھانا وہیں کھایا۔کھانے کے بعد خالدہ نے اپنے شوہر آصف کے ساتھ اپنی گاڑی میں اسے اس کے میکے میں ڈراپ کیا۔روزینہ کو اکیلے گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر شکیلہ کا ماتھا ٹھنکا۔

"وقار آج بھی تمہارے ساتھ نہیں آئے اور تمہیں اکیلا ہی بھیج دیا" انہوں نے غصے میں پوچھا۔

"وہ صبح کے گھر سے گئے لوٹے نہیں تو میں بور ہوگئی اور خود ہی چلی آئی" روزینہ نے وضاحت کی۔

"یہ نئی نویلی دلہن ہے، ذرا اس کا حلیہ تو دیکھو؟ ہاتھوں میں مہندی نہیں، شوہر ساتھ نہیں، یہ کیسی سہاگن ہے؟" شکیلہ نے روزینہ کے ابو جاوید سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔فرح اور کمال بھی حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔وہ سر جھکائے صوفے پر بیٹھی امی کی گفتگو سنتی رہی۔اس کے پاس ان تمام باتوں کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔چار بجے کے قریب دروازے پر بیل ہوئی تو کمال نے دروازہ کھولا۔

"عید مبارک ہو" وقار نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا:

"آپ کو بھی مبارک ہو" کمال نے جواباً کہا اور ناگواری سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"روزینہ یہاں آئی ہے کیا؟" اس نے گھبراہٹ میں فرح سے پوچھا۔

"جی ہاں بھائی جان! باجی یہیں موجود ہیں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔

"آؤ میاں! یہاں آنے کا خیال کیسے آگیا" روزینہ کے ابو جاوید نے پوچھا

"ہماری بیٹی لاوارث نہیں ہے کہ جو تمہاری مرضی میں آئے سلوک کرو گے۔غضب خدا کا پہلی عید پر بچی اکیلی ہی میکے چلی آئی، ساتھ لاتے ہوئے تمہیں تکلیف ہو رہی تھی"۔شکیلہ نے غصہ بھرے لہجے میں وقار کی کلاس لی۔

"وہ مجھ سے پوچھے بغیر ہی آگئی ورنہ میں خود ہی اسے لے آتا۔اکیلے آنے کی اسے کیا ضرورت تھی؟" وقار نے صفائی پیش کی۔

''تم تو عید منانے اپنے پہلے گھر گئے تھے، وہ کس کے ساتھ عید مناتی'' شکیلہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''یہ تمام باتیں روزینہ کو پہلے ہی سے معلوم تھیں پھر افسانہ بنانے کا کیا فائدہ۔'' اس نے تنک کر کہا۔

شکیلہ کو وقار کا یہ جواب اور انداز پسند نہیں آیا لہٰذا وہ اٹھ کر اندر کمرے میں چلی گئیں۔ روزینہ باہر آئی تو سامنے وقار کو دیکھا وہ نظریں نیچی کر کے دوبارہ اندر جانے لگی تو وقار نے اسے روک لیا۔

''یہاں اکیلے آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمہاری اس حماقت سے یہ تماشہ کھڑا ہو گیا۔ چلو گھر چلیں'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تھوڑی دیر بعد چلیں گے'' روزینہ نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں ابھی چلو'' اس نے زور دے کر کہا۔

''میں ابھی نہیں جاؤں گی، آپ کو جانا ہے تو آپ چلے جائیں'' اسے بھی ضد چڑھ گئی۔

''ٹھیک ہے تم خود ہی آ جانا'' یہ جملہ کہہ کر وقار دروازے سے باہر نکل گیا۔ فرح دونوں میاں بیوی کی تکرار سنتی رہی۔

''باجی! بھائی جان غصے میں تھے، آپ کو ان کے ساتھ جانا چاہئے تھا'' فرح نے تشویش سے کہا۔

''مجھے ان کے غصے کی پرواہ نہیں، انہوں نے شادی کے بعد سے اب تک میرے لئے کیا کیا ہے؟ فلیٹ کا کرایہ بھی ایک ماہ کا چڑھ گیا ہے، مالک مکان ناراض ہو رہا تھا۔ گھر کا سودا تک لا کر نہیں دیتے، انہیں یہ تک احساس نہیں ہوتا کہ میں بغیر کھائے پیئے کیسے رہ سکتی ہوں'' وہ سسک پڑی، شکیلہ نے بھی یہ باتیں سن لیں انہیں بہت دکھ ہوا۔ بیٹی کے غلط فیصلے نے ان کا سکون چھین لیا تھا۔

''کیا چاہتی ہو؟'' انہوں نے روزینہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''امی! اب میں وقار کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ ان دو مہینوں میں، میں اتنی ذہنی اذیت برداشت کر چکی ہوں کہ آپ کو بتا بھی نہیں سکتی، باقی زندگی اس جہنم میں گزارنے سے تو یہی بہتر ہے کہ میں علیحدگی اختیار کر لوں''۔ اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔ اس کے ابو جاوید بھی اس کے فیصلے سے متفق تھے۔ روزینہ باسی عید کو بھی اپنے گھر نہیں گئی، عید کے تیسرے دن وہ کمال کے ساتھ اپنے گھر پہنچی تو وقار وہاں نہیں تھا۔ حسب اوقات وہ فوزیہ اور

بچوں کے پاس گیا تھا۔ روزینہ نے اپنے تمام کپڑے اور سامان کو پیک کیا۔ اس کے بھائی کمال نے ایک سوزوکی کرائے پر لی اور تمام سامان اس پر لاد کر روزینہ کے ساتھ اپنے گھر آیا۔ رات وقار نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا تو اس کا سر چکرا گیا کیونکہ روزینہ کے جہیز کا تمام سامان غائب تھا۔ الماری، ڈریسنگ ٹیبل، صوفے اور دیگر تمام سامان کمرے میں موجود نہ تھا، بیڈ بھی نہیں تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ معاملہ کافی سنگین ہو گیا ہے۔ وہ اسی وقت بائیک اسٹارٹ کر کے روزینہ کے میکے پہنچا۔ بیل بجانے کے بعد وہ اندر داخل ہوا۔

''روزینہ، روزینہ'' اس نے آواز دی۔

''کیا بات ہے''۔ شکیلہ نے پوچھا۔

''گھر کا سامان کیوں اٹھالیا'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''اب روزینہ تمہارے ساتھ نہیں رہے گی، وہ تم سے طلاق لے رہی ہے اگر تم اسے طلاق نہیں دو گے تو وہ کورٹ سے خلع لے گی۔'' انہوں نے فیصلہ سنایا۔

''مجھے روزینہ سے بات کر لینے دیں، ہوسکتا ہے آپ لوگوں نے اس پر دباؤ ڈالا ہو'' وقار نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

''ہم نے روزینہ پر کوئی دباؤ نہیں ڈالا۔ تم سے شادی کا فیصلہ بھی اس نے ہماری مرضی کے خلاف کیا تھا اور اب علیحدگی بھی اپنی مرضی سے اختیار کر رہی ہے سمجھے تم'' روزینہ کے ابو جاوید نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

اتنے میں روزینہ بھی کمرے میں داخل ہوئی، وہ سخت ذہنی دباؤ اور ٹینشن میں تھی۔

''روزینہ یہ کیا حماقت ہے؟'' وقار نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''حماقت'' آپ سے شادی تھی۔ مجھے آپ سے اور آپ کی بیوی بچوں سے سخت نفرت ہے، ان کی باتیں سن سن کر میرا دماغ سن ہو گیا ہے۔ آپ نے مجھے ہمیشہ ڈی گریڈ کیا، فوزیہ جیسی لڑاکو اور تنگ نظر خاتون سے میرا مقابلہ کر کے مجھے ذہنی اذیت پہنچاتے رہے۔ میری عزت نفس مجروح ہوتی رہی، شادی کو دو ماہ ہو گئے ان دو مہینوں میں آپ نے مجھے کوئی خرچہ نہیں دیا۔ مکان کا کرایہ بھی باقی ہے ایسی غربت اور کسمپرسی میں دن گزارنے سے بہتر ہے کہ آدمی خود کمائے اور کھائے، خوش رہے۔ لفظ ''خوشی'' مجھے آپ سے تو کبھی بھی مل ہی نہیں سکتی لہٰذا

یہی بہتر ہے کہ ہم الگ ہو جائیں۔ میں مزید سسکنا نہیں چاہتی۔ میرا مہر پچاس ہزار تھا وہ میں آپ کو معاف کرتی ہوں کیونکہ جس شخص نے کبھی پانچ سو روپے مجھے نہیں دیئے، وہ پچاس ہزار کیا دے گا۔'' روزینہ نے کہا اور اندر چلی گئی پھر تھوڑی دیر بعد باہر آئی۔

''یہ لیجئے یہ آپ کا لاکٹ سیٹ ہے جو آپ نے شادی پر دیا تھا'' اس نے وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں مجھے نہیں چاہیئے اسے تم ہی رکھ لو'' یہ کہہ کر وقار باہر نکل گیا۔ روزینہ اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔

دو دن بعد وقار نے طلاق نامہ وکیل کے ذریعے روزینہ کے گھر کے پتہ پر بھجوا دیا تھا۔ طلاق ملنے کے بعد روزینہ نے سکون کا سانس لیا۔ طلاق حاصل کرنے کا اسے کوئی دکھ بھی نہیں تھا کیونکہ وقار نے شادی کے بعد اسے اپنائیت کا احساس ہونے ہی نہیں دیا تھا، ہر وقت اس کے ذہن پر فوزیہ اور بچوں کا بھوت سوار رہتا تھا۔ دستر خوان پر بیٹھ کر سکون سے کھانا کھانے کی بجائے وہ بچوں کی کمی محسوس کرتا۔ فوزیہ کے پکائے کھانوں کی تعریف سے روزینہ کا دل چھلنی کرتا رہتا۔ قدم قدم پر اسے بیوی بچوں کی یاد ستاتی، روزینہ یہ تمام باتیں کب تک برداشت کرتی آخر وہ ایک عورت تھی۔ اپنا دل کتنا کشادہ رکھتی کہ تمام باتیں صبر و تحمل سے نظر انداز کرتی۔ یہ تو جان بوجھ کچوکے دینے والی بات تھی۔ اس شادی اور طلاق کے دوران اس نے کافی بڑا سبق حاصل کر لیا تھا، اس نے کان پکڑ لیے تھے کہ کبھی بھی کسی شادی شدہ مرد سے شادی ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ زندگی بھر کنواری رہ کر جینا بہتر ہے کہ کسی مرد کی دوسری بیوی بن کر اپنا سکون برباد کرے۔ طلاق کے بعد روزینہ نے ایک نجی کمپنی میں ملازمت اختیار کر لی، یہاں سے اسے ماہانہ دس ہزار مل رہے تھے کیونکہ وہ اکاؤنٹس سے وابستہ تھی، اب وہ بہت خوش اور پر سکون تھی۔ گھر والے بھی اسے خوش دیکھ کر مطمئن تھے۔ روزینہ کو طلاق دینے کے بعد وقار واپس فوزیہ کے پاس لوٹ گیا۔ روزینہ سے شادی کے بعد فوزیہ پہلے کے مقابلے میں بہتر ہو گئی تھی۔ وہ رو رو کر وقار سے دوسری شادی کرنے کا شکوہ کرتی حالانکہ فوزیہ نے اپنی شادی کے بعد بارہ سال وقار سے لڑ جھگڑ کر اور اسے بیجا تنگ کر کے گزارے تھے، جیسے ہی وقار نے دوسری شادی کی اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ وہ خود کو مظلوم ثابت کرنے کے لئے مختلف طریقے استعمال کرتی رہی جس سے وقار کو گلٹی محسوس ہوتی تھی جس کی وجہ سے وہ روزینہ

کو محبت اور توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ فوزیہ نے روزینہ کی قربت ختم کرنے کے لئے اپنے دونوں بیٹوں کو ہتھیار کے طور پر استعمال کر لیا تھا جس کا نتیجہ روزینہ اور وقار کے درمیان طلاق کی صورت میں نکلا چونکہ فوزیہ گھریلو خاتون تھی اس لئے اس نے سازشوں کے ذریعے اپنے سہاگ کو بچا لیا جبکہ روزینہ پڑھی لکھی لڑکی تھی، وہ اصولوں کی جنگ لڑتی رہی جو بالآخر ہار گئی، وہ اپنا حق دلائل کے ذریعے حاصل کرنے کی کوشش میں سرگرداں ہونے کے باوجود سازشوں کی بھینٹ چڑھ گئی۔

''فوزیہ! جلدی سے میری شرٹ کا بٹن ٹانک دو'' وقار نے ناشتہ کرتے ہوئے کہا۔

''بھئی! ابھی کوئی دوسری شرٹ پہن لیں۔ جلدی میں مجھے بٹن بھی نہیں ملے گا، تلاش کرنا پڑے گا۔ میرے پیروں میں درد ہو رہا ہے۔'' فوزیہ نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم نے پھر پہلی والی حرکتیں شروع کر دیں ان ہی حرکتوں کی وجہ سے میں نے روزینہ سے شادی کی تھی''۔ اس نے غصہ سے فوزیہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ اتنی اچھی تھی تو آپ کو کیوں چھوڑ گئی، میں نے برسوں آپ کے ساتھ گزارے، وہ ڈھائی مہینے آپ کے ساتھ نہ رہ سکی'' فوزیہ نے طنز کیا۔ وقار دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

روزینہ اور وقار کے درمیان علیحدگی کو چھ ماہ گذر گئے۔ ان گزرے ہوئے چھ ماہ کے دوران روزینہ نے وقار کو یاد نہ کیا چونکہ ان دونوں کے درمیان چاہت کا رشتہ صرف چند دنوں پر محیط تھا، تلخیاں اتنی زیادہ رہیں کہ وہ چند دن اپنی اہمیت کھو چکے تھے، ہاں البتہ اب دھیرے دھیرے وقار کو اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ فوزیہ اپنی پرانی روش پر اتر آئی تھی، معمولی معمولی باتوں پر لڑنا اور ہر وقت روزینہ سے شادی اور پھر طلاق کے قصہ کو جواز بنا کر طنزیہ گفتگو کرنا اس کا معمول بن چکا تھا۔

''آپا کے بیٹے کی سالگرہ ہے، مجھے اور بچوں کو نئے کپڑے خرید کر دیں'' فوزیہ نے حکم صادر کیا۔

''پچھلے مہینے نعیم چاچا کے بیٹے کی شادی پر تمہیں اور بچوں کو نئے کپڑے سلوا دیئے تھے وہی پہن لو''۔ وقار نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''وہ کپڑے تو سب نے دیکھ لئے ہیں، میں وہ کپڑے نہیں پہنوں گی'' اس نے زور دے کر کہا۔

''سب نے دیکھ لئے ہیں تو کیا ہوا؟ کسی دوسرے کے کپڑے تو نہیں تھے نا! تمہارے اپنے ہی تھے، دوسری بات یہ ہے کہ اس ماہ میرا بجٹ ویسے ہی آؤٹ ہو گیا ہے، فالتو اخراجات کے لئے بالکل گنجائش نہیں ہے کچھ تو میری مالی پوزیشن کا خیال کرو'' وقار نے وضاحت کی۔

''ہاں! سارا خیال میں ہی کروں، دوسری شادی کے لئے تو بڑی جلدی جلدی پیسے نکل گئے تھے، میرے لئے مشکل ہو گیا ہے''۔فوزیہ نے طنزیہ کہا۔

''فضول بکواس مت کرو۔تمہاری اور بچوں کی وجہ سے میں نے روزینہ کا حق مارا۔شادی کے بعد سے طلاق کے دوران میں اسے کچھ بھی خرید کر نہ دے سکا جس کا آج تک مجھے دکھ ہے، شاید اللہ بھی مجھے معاف نہ کر سکے'' اس نے غصہ سے کہا۔

''اچھا! روزینہ کا اتنا خیال تھا تو اسے طلاق کیوں دی تھی؟۔طلاق نہ دیتے، ساتھ رکھ لیتے، میں نے تو اسے چھوڑنے کے لئے دباؤ نہیں ڈالا تھا''۔فوزیہ نے ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے کہا۔

''روزینہ سے شادی کے بعد تم مگر مچھ کے آنسو بہا بہا کر مجھے بلیک میل کرتی رہیں، اس کے علاوہ بچوں کو سکھا پڑھا کر میرے پیچھے لگا دیا تھا، خود کو بدلنے کا ناٹک بھی اچھا کر لیا تھا۔یہ تمام باتیں مجھ پر دباؤ ڈالنے کیلئے تو تھیں۔اسے طلاق دینے کے بعد تمہارے پرانے ہتھکنڈے دوبارہ شروع ہو گئے'' وقار نے چیخ کر کہا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔

اب وہ روزانہ دفتر سے گھر آنے کی بجائے اپنے مختلف رشتہ داروں اور دوستوں کی طرف نکل جاتا۔رات 8 یا 9 بجے کے قریب گھر میں داخل ہوتا، کھانا کھانے کے بعد تھوڑی دیر TV پر خبریں دیکھتا اور سو جاتا، جس دن وہ گھر پر جلدی آجاتا اس دن فوزیہ حیلے بہانے سے روزینہ کا تذکرہ چھیڑ دیتی، جس کے بعد ان دونوں کے درمیان جھگڑا ہو جاتا، دونوں میاں بیوی کے جھگڑوں نے ان کے دونوں بیٹوں پر برا اثر ڈالا تھا۔بڑا بیٹا اپنی کلاس میں کارکردگی کے اعتبار سے پیچھے رہ گیا تھا جبکہ چھوٹا بیٹا اس سال فیل ہو گیا تھا۔

دن گذرتے رہے فوزیہ کے نامناسب رویئے نے وقار پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔اس کے تمام بال سفید ہو گئے تھے بچے الگ پریشان تھے، دیکھتے ہی دیکھتے روزینہ سے علیحدگی کو پانچ سال کا عرصہ بیت گیا۔

روزینہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی، اس کے بھائی کمال کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کا ایک بیٹا ندیم دو سال کا تھا، وہ زیادہ تر روزینہ کے پاس رہتا تھا۔ ندیم کی وجہ سے روزینہ بہت خوش تھی اس کی معصوم باتوں اور حرکتوں نے اسے ماضی بھلانے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ صبح 9 بجے دفتر جاتی اور شام 6 بجے تک گھر واپس پہنچا کرتی۔ واپس آنے کے بعد اس کا وقت ننھے ندیم کے ساتھ گزرتا۔ پانچ سالوں کے دوران وقار کا بڑا بیٹا ریاض میٹرک کر چکا تھا جبکہ چھوٹا شجاع میٹرک میں تھا۔ بچوں کے بڑے اور باشعور ہونے کے بعد فوزیہ کا رویہ مزید بگڑ گیا۔ وہ بچوں کے بل بوتے پر وقار کو ہر وقت اذیت دیتی رہتی تھی، طنزیہ گفتگو اور معمولی باتوں کو بلاوجہ طول دینا اس کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکا تھا۔ آج اتنے برسوں بعد وقار کو احساس ہونے لگا کہ اس نے بلاوجہ ایک پڑھی لکھی لڑکی کو فوزیہ پر قربان کر دیا تھا۔ روزینہ ایک سمجھدار اور صابر لڑکی تھی۔ روزینہ کو اس کی ذات سے بہت تکلیف پہنچی تھی۔ فوزیہ کے رونے دھونے میں آ کر اس نے روزینہ کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی جائے روزینہ کو چھوڑنے کے وہ فوزیہ کو چھوڑ دیتا تو یہ زیادہ صحیح فیصلہ ہوتا۔ اب اسے اس بات کا احساس ہونے لگا تھا، یہ بات شدت اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اس نے فوزیہ کو بلاوجہ روزینہ پر اہمیت دی تھی۔

''کہاں کی تیاری ہے؟'' فوزیہ نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا

''تمہیں کیا، میں کہیں بھی جاؤں۔ تم اپنے کام سے کام رکھو'' وقار نے چڑ کر جواب دیا پھر وہ سوٹ کیس میں اپنے ضروری کاغذات اور کپڑے رکھنے لگا۔

''ابو آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' بڑے بیٹے ریاض نے پوچھا۔

''بیٹا میں دبئی جا رہا ہوں وہاں مجھے اچھی کمپنی میں جاب مل گئی ہے۔ میری غیر موجودگی میں اپنی امی کا خیال رکھنا''۔ اس نے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ابو میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں'' چھوٹے بیٹے شجاع نے کہا۔

''ٹھیک ہے پہلے تم دونوں اپنی پڑھائی مکمل کر لو اس کے بعد میں تم دونوں کو وہیں بلا لوں گا''۔ وقار نے ان کی طرف شفقت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی 2 بجے فلائٹ تھی لہٰذا اس نے روکھے انداز میں فوزیہ کو خدا حافظ کہا اور گھر سے سامان لے کر صبح گیارہ

بجے ایئرپورٹ کیلیئے روانہ ہوا۔ دبئی جانے کے بعد اس نے ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی وہاں جانے کے ایک سال تک اس نے پابندی سے بیوی بچوں کو پیسے بھجوائے۔

''امی! ابو کا فون آیا تھا، انہوں نے ہم دونوں بھائیوں کو پاسپورٹ بنوانے کے لئے کہا ہے۔ وہ ایک ماہ کا ویزہ بھجوائیں گے تا کہ ہم دبئی دیکھ سکیں'' بڑے بیٹے ریاض نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

فوزیہ نے بچوں کا ارجنٹ پاسپورٹ بنوایا، اسی دوران ویزہ بھی آگیا تھا، دونوں بچے دبئی روانہ ہوگئے۔ فوزیہ اطمینان سے گھر میں آرام کرنے لگی کیونکہ گزرے ایک سال کے دوران اس نے گھر کی حالت بدل دی تھی۔ مارٹن روڈ کے کواٹر کو اس نے رنگ وروغن کروا کے نئے فرنیچر سے سجالیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ بینک بیلنس بھی اس کے پاس تھا۔ دونوں بچوں کو اس نے دبئی اس لئے بھی بھجوادیا تھا تا کہ وہ دونوں وقار کے فلیٹ کو دیکھیں اور یہ معلوم کریں کہ وہ اکیلا ہے یا پھر مزید کوئی شادی تو نہیں کرلی۔

دونوں بچے دبئی پہنچے تو یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ ان کے باپ کی پوزیشن کافی مستحکم ہے۔ ان کو ایک فلیٹ کمپنی سے ملا ہوا تھا، اس کے علاوہ گاڑی بھی موجود تھی اور ایک ملازم کھانا پکانے پر مامور تھا۔ بچوں کو دبئی گئے ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ ان دو ماہ کے دوران ان کے چار پانچ فون آچکے تھے مگر انہوں نے اپنے آنے کے متعلق کچھ بھی اشارہ نہیں دیا تھا۔ وہ حیران تھی کہ بچے ابھی تک کیوں نہیں پہنچے تھے، اس کے پاس وقار کا فون نمبر بھی نہیں تھا کیونکہ وقار نے اسے اپنا فون نمبر دیا ہی نہیں تھا، اسے ضرورت محسوس ہوتی تو وہ خود ہی فون کرلیا کرتا تھا، تین ماہ گزر گئے۔ بچے نہیں آئے ہاں البتہ فوزیہ کا خرچہ پہنچتا رہا۔

دروازے پر بیل ہوئی۔ فوزیہ نے دوڑ کے دروازہ کھولا۔

''کیا ہے؟'' اس نے آنے والے سے پوچھا۔

''آپ کا پارسل ہے''۔ ٹی سی ایس والے نے جواب دیا اس نے دستخط کر کے پارسل وصول کرلیا۔

کمرے میں داخل ہو کر اس نے پارسل کھولا۔ اس میں بڑے بیٹے ریاض کا خط تھا۔ اس نے خط پڑھا۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے اور شجاع کو دبئی میں اچھی جگہ نوکری مل گئی ہے اور وہ دونوں ابو کے فلیٹ میں رہتے ہیں۔ اب وہ تینوں مستقل دبئی میں ہی رہیں گے، اس کا خرچہ بھجواتے رہیں گے، وہ فکر نہ کریں، خط کے علاوہ پارسل میں

ایک پچاس ہزار کا چیک اور ایک سوٹ پیس تھا، دونوں چیزیں اس نے سنبھال کر رکھ لیں۔

اس نے سوچا کہ اس کے بچے اس کو چھوڑ گئے اگر وہ چاہتے تو اسے بھی وہیں بلا لیتے۔ وہ ان کے بغیر یہاں کیا کرے گی، اسے وقار پر غصہ آیا کہ یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب وقار کی سوچی سمجھی سازش ہے، فون نمبر اس کے پاس تھا نہیں وہ کہاں رابطہ کرتی، رات گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی، وہ بستر سے اٹھ بیٹھی اور قریب رکھا فون اٹھایا۔

''ہیلو! کون؟'' اس نے ریسیور کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔
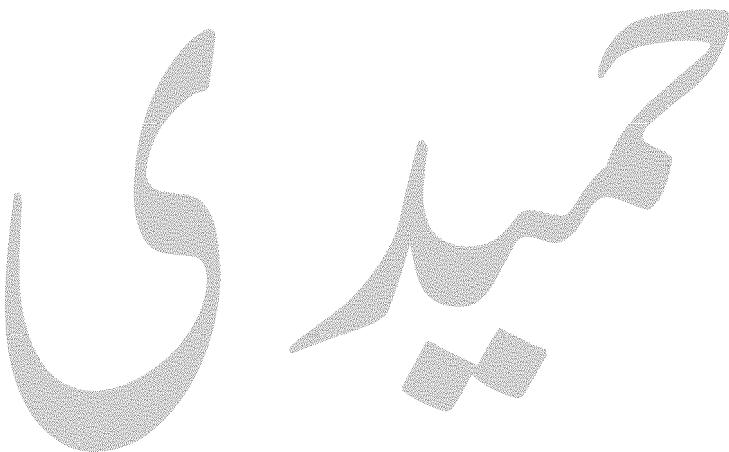
''ریاض بول رہا ہوں، کیسی ہیں امی، آپ کو پارسل ملا''؟ اس نے سوال کیا۔

''ہاں! آج ہی ملا، اچانک تم دونوں نے دبئی میں کیسے ملازمت اختیار کر لی، یہ سب کچھ وقار کا منصوبہ لگتا ہے۔ مجھے بھی بلا لو'' اس نے تیز لہجے میں کہا۔

''نہیں امی! ہم آپ کو یہاں نہیں بلا سکتے کیونکہ لڑائی جھگڑوں سے تنگ آ کر تو ابو نے یہاں ملازمت اختیار کر لی تھی۔ ہم دونوں بھی آپ کے مزاج سے بددل ہو چکے تھے، یہاں ہم سکون سے رہ رہے ہیں۔ آپ کراچی میں سکون سے رہیں، ہم آپ کو پیسے وقت پر بھجواتے رہیں گے، آپ پریشان مت ہوں۔ یہاں آنے کے بعد اندازہ ہوا کہ آپ کی شکی طبیعت اور بد مزاجی نے ہم دونوں بھائیوں اور ابو کی شخصیت پر کتنا برا اثر ڈالا تھا، ہماری شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی تھی، ہم زیادہ تر گھر سے باہر رہ کر اپنا وقت گزارا کرتے تھے، یہاں مصروفیات نے تمام یادیں بھلا دی ہیں اور ہم خوش و خرم ہیں۔'' ریاض نے سنجیدگی سے کہا۔

فوزیہ کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا، ریاض کی باتیں بہت دور سے سنائی دیتی محسوس ہوئیں۔ وہ بستر پر دراز ہو گئی، اس کی حرکتوں نے پہلے شوہر کو دور کر دیا تھا اب اس کے بچے بھی اس سے دور چلے گئے، اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے اپنے رویوں سے اس کی زندگی اتنی بے رنگ اور سونی سونی ہو جائے گی مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا، زندگی کے اس مقام پر وہ بالکل تنہا کھڑی تھی، اس کی نظروں میں روزینہ کا چہرہ گھوم گیا، جیسے وہ اس کی حالت پر قہقہے لگا رہی ہو، جن بچوں کو اس نے روزینہ کے خلاف ہتھیار کے طور پر استعمال کر لیا تھا ان ہی بچوں کو وقار نے اس کے خلاف استعمال کر لیا۔ فوزیہ کو ایک ایک کر کے اپنی تمام زیادتیاں یاد آنے لگیں جو اس نے وقار

کے ساتھ کی تھیں، اس کے علاوہ روزینہ کو وقار کی زندگی سے ہٹانے کے لئے اس نے وہ تمام ہتھکنڈے استعمال کرلیے تھے جو وہ کرسکتی تھی یعنی رونا دھونا اور خود کو مظلوم ثابت کرنا، اس کے علاوہ مختلف عاملوں کے چکر بھی لگاتی رہی تا کہ جادو کے زور سے وہ روزینہ کو وقار سے الگ کردے۔ آج قدرت نے اسے اس کے اپنے بچوں سے نہ صرف دور کردیا تھا بلکہ ان کے دل و دماغ میں ماں سے نفرت کا جذبہ بھی پیدا ہوگیا تھا اور۔۔۔ وقار اس کی آواز بھی سننے کا روادار نہ تھا، یہ صحیح معنوں میں مکافاتِ عمل تھا جو صرف قدرت کی طرف سے تھا۔ انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا بھی ہے، زمانے سے یہی ہوتا رہا ہے اور ہوتا رہے گا، کبھی کبھی وقت کا پہیہ الٹا بھی چلتا ہے۔

دیر آید درست آید

''سمیرا! آؤ میں تمہیں یونیفارم پہنادوں'' اس کی امی فوزیہ نے اسے قریب بلاتے ہوئے کہا۔ وہ دوڑ کر امی کے قریب پہنچی، فوزیہ نے اسے فراک پہنادی پھر موزے پہنا کر کالے جوتے بھی اس کی طرف بڑھا دیئے، اس کے بعد دو چٹیا بنا کر اسے محلے کی دیگر بچیوں کے ساتھ اسکول روانہ کرادیا۔

سمیرا کی ایک چھوٹی بہن حمیرا کو بخار تھا لہٰذا وہ چھٹی پر تھی۔ فوزیہ اپنے شوہر عباس اور دو بچیوں سمیت شہر کی ایک کچی آبادی کے چھوٹے سے مکان میں رہتی تھی۔ اس کا میکہ ڈھاکہ میں تھا، وہ اپنے شوہر کے ساتھ شادی کے کچھ عرصے بعد پاکستان چلی آئی اور کراچی میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ عباس ایک کپڑے کی دکان میں سلیز میں تھا۔ پیسے معقول مل رہے تھے مگر اتنے نہیں کہ وہ شہر کے کسی اچھے علاقے میں رہتا۔

وقت تیزی سے گزرتا رہا۔ عباس کے خاندان میں بھی اضافہ ہوا یعنی اب اس کے چار بچے تھے، دو بیٹیاں اور دو بیٹے، دونوں بیٹیاں بڑی تھیں اور بیٹے چھوٹے۔ سمیرا اب میٹرک میں، حمیرا نویں میں علی تیسری اور سلمان دوسری جماعت میں زیر تعلیم تھا۔

فوزیہ اور عباس کے سامنے والے مکان میں سلطان کا خاندان آباد تھا۔ ان کا مکان دو سو گز پر بڑا خوبصورت بنا ہوا تھا، سلطان کے تین بیٹے اور ایک بیٹی عابدہ تھی۔ سلطان کی بیوی نسرین بڑی مغرور خاتون تھی کیونکہ وہ کسی سابقہ میجر کی بیٹی تھی، اس کا بڑا بیٹا عمران بہت ہنس مکھ اور با اخلاق نوجوان تھا، وہ اپنی ماں سے ہٹ کر فطرت میں اپنے باپ سلطان پر گیا تھا۔ فوزیہ اور نسرین کو اس محلے میں رہتے تقریباً سولہ برس ہو چکے تھے۔ عمران اور سمیرا کا بچپن ساتھ ساتھ گزرا تھا۔ بچپن سے جوانی تک کا سفر انہوں نے اکھٹے گزارا تھا۔ عمران اب انٹر طالب علم تھا، بچپن کا ساتھ جوانی میں محبت کا روپ اختیار کر چکا تھا۔

سمیرا گو کہ بہت خوبصورت تو نہ تھی ہاں البتہ اس میں بلا کی کشش تھی یہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی اسکول آتی جاتی تو نہ چاہنے کے باوجود کئی لوگوں کی نظریں اس کا طواف کرتیں۔ عمران اور سمیرا کی محبت نسرین اور فوزیہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ حسب عادت نسرین نے فوزیہ اور اس کے بچوں سے ملنا جلنا کم کردیا اور عمران پر بھی دباؤ ڈالا کہ وہ

سمیرا کے گھر نہ جایا کرے۔ والدین کی بے جابندش سے مجبور ہوکر وہ دونوں اکثر باہر ملا کرتے، کسی ریسٹورینٹ یا کسی تفریحی مقامات پر۔ ایک دن عباس نے ان دونوں کو رکشے پر جاتے ہوئے دیکھ لیا، پھر کیا تھا ایک قیامت تھی۔ اس دن عباس نے سمیرا پر ہاتھ اٹھالیا، اسے بہت مارا۔ پندرہ دن کے اندر اس نے اپنا مکان اونے پونے بیچ کر شہر کے وسطی حصے میں ایک فلیٹ خرید لیا اور وہ سب وہاں شفٹ ہوگئے۔ سمیرا نے یہ دوری کیسے برداشت کی، اس درد کو اس کے علاوہ اور کوئی نہ جان سکا۔ عمران بھی اداس رہنے لگا۔ امیری اور غریبی کے فرق کے علاوہ ذات پات اور اعلیٰ نسلی کے گھمنڈ نے دو چاہنے والوں کی دنیا میں آگ لگادی پھر ایک دن معلوم ہوا کہ عمران کی شادی ہوگئی، اس انکشاف نے سمیرا کو اندر سے توڑ دیا وہ بکھر گئی، اس کے خواب بھی بکھر گئے، بمشکل اس نے خود کو سنبھالا، اس نے گریجویشن کیا۔ عباس نے ایک چھوٹی سی کپڑے کی دکان خرید لی، اب ان کے مالی حالات پہلے سے بہت بہتر ہوگئے۔ سمیرا کے کئی رشتے آئے مگر اس نے شادی نہیں کی۔ تنگ آ کر عباس اور فوزیہ نے چھوٹی بیٹی حمیرا کی شادی اچھے خاندان میں کردی۔

سمیرا نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا، اس کے دو چھوٹے بھائی بھی اسکول میں زیر تعلیم تھے۔

''سمیرا! جلدی چلو، پوائنٹ مس ہوجائے گی'' امبر نے گھڑی دیکھتے ہوئے اشارہ کیا۔

''ہاں چلو ورنہ دیر ہوجائے گی''۔ سمیرا نے تیز قدم بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

سمیرا اور امبر دونوں نے اسی سال جرنلزم میں داخلہ لیا تھا۔ دونوں کی رہائش بھی قریب قریب تھی یعنی وہ برنس روڈ کے علاقے میں رہتی تھیں جہاں سے یونیورسٹی بھی دور تھی اور ٹریفک کا رش بھی اس علاقے میں زیادہ تھا۔

وقت اپنی پوری رفتار سے رواں دواں تھا۔ اس دوران حمیرا کے ہاں ایک بیٹا دانیال پیدا ہوا۔ سمیرا نے جرنلزم میں ماسٹرز کرلیا اور ایک مقامی روز نامے میں میگزین انچارج کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرلی اور بہت مصروف ہوگئی۔ اس ملازمت میں اسے نہ صرف عزت حاصل ہوئی بلکہ مالی اعتبار سے بھی اسے کافی فائدہ ہونے لگا، وہ بدل گئی، اس کا انداز، اس کی سوچ، غرض کے اس کا حلیہ بھی بدل گیا۔ وہ سمیرا جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہوجایا کرتی تھی اور دیگر بڑے گھرانوں کی لڑکیوں کے کپڑے اور زیورات کو دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتی تھی۔ آج اس کے پاس سب کچھ تھا وہ خود اس کا اپنا تھا۔ اتنا سب کچھ ہونے کے باوجود اس کے دل میں

ایک کسک سی تھی، کچھ کھو جانے اور چھن جانے کا احساس آج بھی اس کے دل میں تازہ تھا۔ وہ آج بھی عمران کو نہ بھول پائی تھی، کبھی کبھی اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ ایک بار اس کی عمران سے ملاقات ضرور ہو۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ عمران کہاں ہے آیا وہ اس شہر میں موجود ہے یا بیرون ملک ہے، پتا نہیں کیوں عمران سے ملنے کی خواہش اس کے دل میں شدت سے موجود تھی۔

''میڈم! آپ کا فون ہے''۔ اس کے اسسٹنٹ جمال نے بلند آواز سے کہا، وہ چونک گئی کیونکہ وہ عمران کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

''ہیلو! آپ کون بول رہے ہیں؟'' سمیرا نے پوچھا۔

''جی! میں سجاد ہوں۔ کیا آپ میگزین انچارج سمیرا ہیں؟'' اس نے الٹا سوال سمیرا سے کیا۔

''جی ہاں! میں سمیرا ہوں، فرمایئے آپ کو کیا کام ہے؟'' اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''دراصل ہم نے مری میں ایک بہت خوبصورت اور بڑا ہوٹل بنایا ہے تاکہ وہاں سیاحوں کو ہر طرح کی سہولت حاصل ہو سکے۔ اس کے علاوہ اس کی خاص بات یہ ہے کہ مری کے دیگر ہوٹلوں اور ریسٹ ہاؤسز کے مقابلے میں ہمارا ہوٹل سستا اور معیاری ہے۔ ہم اگلے ہفتے اس ہوٹل کی اوپننگ کر رہے ہیں، اس سلسلے میں ہم چند صحافیوں کو وہاں لے جانے کا بندوبست کر رہے ہیں لہٰذا آپ کو بھی مدعو کیا جا رہا ہے۔ کیا آپ وہاں آئیں گی؟'' سجاد نے وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے! میں آپ کو کل فائنل بتا دوں گی، آپ کل اس وقت فون کر لیجئے گا'' سمیرا نے جواب دیا۔

گھر پہنچ کر سمیرا نے اپنے ابو عباس سے مری جانے کی اجازت طلب کی قدرے انکار کے بعد انہوں نے اجازت دے دی۔ اگلے دن سجاد کا فون آیا تو سمیرا نے مری جانے پر رضامندی کا اظہار کیا کیونکہ دفتر والے بھی سمیرا کو وہاں بھجوانا چاہتے تھے تاکہ میگزین کیلئے کچھ نیا مواد اور آرٹیکل مل سکے۔

یہ سفر کل چار دن کا تھا۔ ہوٹل کی اوپننگ اتوار کو تھی۔ ہفتے کی صبح شہر کے کل دس صحافی سمیرا سمیت اسلام آباد روانہ ہوئے، جہاز کے آنے جانے اور ٹھہرانے کا بندوبست ہوٹل کی انتظامیہ نے کیا تھا۔ ان صحافیوں میں تین فوٹو گرافرز بھی شامل تھے۔ سمیرا کی زندگی کا یہ پہلا سفر تھا کیونکہ بچپن سے آج تک اس نے کوئی سفر نہیں کیا تھا۔

بچپن میں حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ سفر کرتی۔ اس کی امی فوزیہ نے شادی کے بعد ڈھاکہ بنگلہ دیش بننے سے پہلے چھوڑ دیا تھا پھر کبھی وہ پلٹ کر وہاں نہیں گئی۔ بیٹی کی جدائی کے صدمے سے سمیرا کے نانی نانا برسوں پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے تھے لہٰذا رشتہ دار نہ ہونے کی وجہ سے کبھی سفر ہو ہی نہ سکا، ہاں البتہ اس کی چھوٹی بہن حمیرا شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ پورے پاکستان کا سفر کر چکی تھی۔

ہفتے کی صبح چھ بجے عباس نے بیٹی کو ایئر پورٹ پر ڈراپ کیا۔ ایئر پورٹ میں داخل ہونے کے بعد سمیرا کو ان کے روزنامے کا فوٹو گرافر آصف نظر آیا پھر تھوڑی دیر بعد دیگر اخبارات کے صحافی بھی پہنچ گئے، انہیں موجود دیکھ کر سمیرا کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی کیونکہ پہلا سفر بغیر گھر والوں کے اسے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ بورڈنگ کے بعد وہ جہاز میں داخل ہوئے۔ صبح سات بجے کی فلائیٹ تھی، وہ ونڈو کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے برابر والی سیٹ پر اس کا فوٹو گرافر آصف بیٹھ گیا، تھوڑی دیر جہاز نے رن وے پر دوڑتا رہا اور پھر یکدم زمین سے بلند ہوا، سمیرا کو چکر سا آ گیا، خوف کے مارے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، پھر دھیرے دھیرے اس نے اپنی انکھیں کھول دیں اور کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا تو زمین بہت دور ہو چکی تھی۔ بڑی بڑی عمارتیں بچوں کے کھلونے کی مانند نظر آ رہی تھیں البتہ سورج بہت صاف شفاف اور چمکدار دکھائی دے رہا تھا، وہ حیرت سے تمام مناظر کو دیکھ رہی تھی۔

اتنے میں ایئر ہوسٹس ایک بڑی ٹرالی کھسکاتی ہوئی لے آئی، اس پر بہت ساری ٹریز تھیں جن میں ناشتہ رکھا تھا۔ اس نے ایک ٹرے سمیرا کے سامنے اسٹینڈ پر رکھ دیا۔ اس ٹرے میں دو توسٹ، پنیر، مکھن، بوائل انڈہ اور جوس رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ چائے بھی لے آئی، سمیرا نے ناشتہ کر لیا، ناشتے کے بعد ایئر ہوسٹس تمام مسافروں کی ٹرے جمع کر کے واپس لے گئی۔

تقریباً پونے نو بجے کے قریب جہاز چکلالہ ایئر پورٹ پر اتر گیا، سمیرا بھی تمام مسافروں کے ساتھ جہاز سے باہر آئی۔ ایئر پورٹ پر مری ہوٹل کی انتظامیہ نے صحافیوں کو لانے کیلئے کوسٹر کا انتظام کیا تھا۔ تمام صحافیوں نے اپنا اپنا سامان کوسٹر میں رکھا اور خود بھی سوار ہوئے۔ اب کوسٹر کا سفر شروع ہوا۔ چکلالہ سے اسلام آباد اور پھر وہاں سے مری چونکہ اکتوبر کا مہینہ تھا، موسم بھی اچھا تھا لہٰذا سفر بڑا خوشگوار رہا اور وہ سب دوپہر تک مری کے اس

ہوٹل پہنچے جس کی اگلے دن اوپننگ تھی۔ یہ ہوٹل کافی بڑا، کشادہ اور خوبصورت تھا۔ صحافیوں کو کل چھ کمرے دیئے گئے تھے یعنی ایک کمرے میں دو صحافی جبکہ سمیرا کو ایک الگ کمرہ دیا گیا تھا کیونکہ ان تمام لوگوں میں صرف وہی خاتون تھی۔ وہ تمام کے تمام دوسری منزل پر تھے، سمیرا نے اپنا بیگ کھولا اور اس میں سے کپڑے نکال کر ہوٹل کی الماری میں ہینگر پر لٹکا دیئے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنا برش، پرفیوم اور میک اپ کا سامان ڈریسنگ ٹیبل پر سجا دیا خود باتھ روم میں فریش ہونے کیلئے داخل ہوئی، ایک گھنٹے بعد وہ تیار ہو کر نیچے ڈائننگ روم میں آئی اور وہاں کے بوفے میں شامل ہوگئی وہاں دیگر صحافی بھی تھے۔ کھانا عمدہ تھا۔

''ہیلو مس سمیرا! میں سجاد ہوں''۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو آپ سجاد ہیں''۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسی انداز میں کہا۔

''آپ اس ہوٹل میں کیا ہیں؟'' سمیرا نے سوال کیا۔

''جی! میں یہاں پی۔ آر۔ او۔ ہوں''۔

''اس ہوٹل کا مالک کون ہے؟'' سمیرا نے لاشعوری طور پر پوچھا۔

''مسٹر عمران احمد اور غفران احمد، یہ دونوں بھائی ہیں۔ ان ہی کا ہوٹل ہے''۔ سجاد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس انکشاف نے سمیرا کے ہوش اڑا دیئے، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، برسوں پرانے ساتھی سے ملنے کی خواہش اس طرح اچانک پوری ہوگی، اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا، وہ خود بہت بدل چکی تھی۔ برسوں پہلے اس کے لمبے لمبے بالوں کی خوب موٹی اور لمبی سی چوٹی ہوا کرتی تھی اور اب اس کے خوبصورت بال شانوں تک تراشے، کھلے اور بکھرے رہتے تھے۔ ماضی میں وہ بہت ہی شرمیلی اور کم گو ہوا کرتی تھی مگر اب وہ بہت بولڈ اور خوش گفتار تھی، بیوٹی پارلر نے پرکشش چہرے کو مزید خوبصورت اور دلکش بنا دیا تھا۔ کپڑوں کا انتخاب اور اس کی ڈیزائننگ نے اس کی شخصیت میں چار چاند لگا دیئے تھے۔

اتوار کے دن شام چار بجے ہوٹل کی اوپننگ تھی۔ عمران کو دیکھنے اور ملنے کے احساس نے سمیرا کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ وہ تمام رات پہلو بدلتی رہی۔ پتا نہیں عمران کتنا بدل گیا ہوگا وہ کیسا ہوگا؟ ایسے بہت سارے سوالات اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔ جوں توں صبح ہوئی۔ سمیرا نے شام کے لباس کا انتخاب کیا اور کپڑے

پریس کروانے کیلئے بھجوائے، تھوڑی دیر بعد کپڑے پریس ہو کر آ گئے، دیگر صحافی بھی دوپہر کھانے کے فوراً بعد شام کی تقریب کی تیاریوں میں لگ گئے۔ سمیرا نے کریم کلر کی ساڑی جس پر سرخ رنگ کا چوڑا بارڈر بنا ہوا تھا، اس کی مناسبت سے سرخ رنگ کا بلاوز پہنا اس کے علاوہ اسی سے میچ کر کے جیولری پہنی، آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی، اس کے دیگر ساتھی بھی نظر بچا بچا کر اسے دیکھ رہے تھے، ٹھیک چار بجے وہ ہوٹل کے وسیع لان میں داخل ہوئی، اس لان کو بہت خوبصورت انداز میں آراستہ کیا گیا تھا، اسٹیج بھی بہترین تھا، لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، دیکھتے ہی دیکھتے لوگوں کی کثیر تعداد اکھٹی ہوگئی۔ سمیرا اور اس کے دیگر ساتھی سامنے کی طرف موجود تھے، اچانک سمیرا کو چند جانے پہچانے چہرے نظر آئے، ایک خاتون جو خاصی موٹی سی تھی یقیناً وہ نسرین تھی یعنی عمران کی امی، اس کے ساتھ ہی عابدہ عمران کی بہن نظر آئی، پیچھے ایک گورے رنگت کی خوش شکل خاتون جو دو بچوں کے ساتھ آگے کی طرف بڑھ رہی تھی غالباً یہ عمران کی بیوی ہے، سمیرا نے اندازہ لگایا۔

چند ہی لمحوں بعد تھری پیس میں ملبوس عمران اسٹیج کی طرف بڑھنے لگا، سمیرا کی آنکھیں اس کا طواف کرنے لگیں، برسوں پہلے والا دبلا پتلا سا نوجوان عمران اب ایک بارعب شخصیت بن چکا تھا۔ اس کے وزن میں بھی اضافہ ہوا تھا اور اس کا رنگ روپ بھی بدل چکا تھا اسے دیکھتے ہی سمیرا کے دل میں ایک عجیب سا احساس ابھرنے لگا کچھ کھونے کا غم یکدم عود کر آ گیا۔ اس کی آنکھیں نم ہوگئیں خاص طور پر اس نے نسرین کو دیکھ کر نفرت سے منہ موڑ لیا، اسی کی بدولت ہی عمران اس سے چھین گیا تھا۔

تقریب شروع ہوگئی مقررین نے ہوٹل سے متعلق تعریفی کلمات ادا کیے آخر میں عمران نے چند باتیں کیں، سمیرا نے غور سے انہیں سنا اور نوٹ کیا۔ عمران کے ساتھ غفران نہیں تھا۔ تقریب کے آخر میں لوگوں کو ہائی ٹی پیش کی گئی، سمیرا نے صرف چائے پر اکتفا کیا، وہ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامے ایک کونے میں کھڑی عمران کی حرکات کو نوٹ کرتی رہی۔ عمران نے کئی بار سمیرا کو دیکھا مگر نہیں پہچان سکا پھر دیگر لوگوں کے ساتھ بات چیت کرتا رہا، سجاد نے عمران کا تعارف صحافیوں سے کرایا جب وہ سمیرا کے پاس پہنچا تو اس نے عمران سے کہا۔ ''یہ ملک کے معروف روزنامے کی میگزین انچارج سمیرا عباس ہیں''۔ عمران کے ہاتھوں سے چائے کی پیالی چھوٹ کر نیچے جا گری، وہ ڈگمگا سا گیا۔

''سر خیریت تو ہے۔ کیا ہوا طبیعت تو ٹھیک ہے نا''۔ سجاد نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

''اٹس آل رائٹ، ڈونٹ وری''۔ عمران نے سمیرا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ عمران کی کیفیت کو سمیرا بخوبی جانتی تھی لہٰذا اس نے عمران کے متعلق نہ کچھ پوچھا اور نہ ہی کچھ کہنا گوارا کیا۔ وہ تیزی سے اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔ عمران اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ہوٹل کی تقریب کی ساری خوشی ماضی کے تکلیف دہ یادوں میں گم ہو کر رہ گئی۔ وہ یکدم سنجیدہ ہو گیا، تمام مہمانوں کو الوداع کرنے کے بعد اس نے اپنے گھر والوں کو ہوٹل کے کمروں میں واپس بھجوا دیا جہاں وہ سب ہوٹل کی اوپننگ کیلئے اسلام آباد سے مری پہنچے تھے۔

سمیرا نے اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے تبدیل کیے پھر کاغذ قلم سنبھال کر ہوٹل پر آرٹیکل لکھنا شروع کیا۔ رات نو بجے تک اس نے اپنا کام ختم کر لیا۔ دس بجے کے قریب ویٹر نے دستک دے کر کھانے کے متعلق پوچھا تو اس نے کھانا اپنے کمرے میں ہی منگوا لیا، کھانے کے بعد اس نے چائے پی پھر وہ چہل قدمی کرنے کی غرض سے نیچے اتر آئی وہاں اس کے دیگر ساتھی بھی موجود تھے، وہ سب خوش گپیوں میں مصروف نظر آ رہے تھے۔

''کیا بات ہے؟ سمیرا نیند نہیں آ رہی ہے''۔ فواد نے پوچھا جو ایک مقامی انگریزی اخبار کا کامرس رپورٹر تھا۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں، بس کھانا دیر سے کھایا تھا نا سوچا ذرہ سی دیر ٹہل لوں''۔ اس نے وضاحت کی۔

''ہوٹل تو اچھا اور خوبصورت بنا ہوا ہے، مسٹر عمران بھی اچھے سلجھے ہوئے انسان ہیں۔ لگتا ہے یہ ہوٹل کافی چلے گا''۔ فواد نے سمیرا سے مخاطب ہوتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''ہاں! یہ بات تو ہے''۔ اس نے مختصر جواب دیا اور آگے لان کی طرف بڑھ گئی جہاں رنگ برنگے قمقموں نے ہوٹل کی سجاوٹ میں کئی گنا اضافہ کیا تھا۔

''سمیرا! تم کیسی ہو؟'' مانوس سی آواز نے اسے چونکا دیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے پیچھے عمران کھڑا تھا۔

''ٹھیک ہوں! تمہیں دیکھ کر نہیں لگتا کہ میں کتنی ٹھیک ہوں؟''۔ اس نے طنزیہ انداز میں جواب دیا۔

''اتنے برسوں بعد بھی تم مجھ سے اب تک ناراض ہو''۔ عمران نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں عمران! میں تم سے ناراض نہیں ہوں۔ میری قسمت ہی اچھی نہیں تھی۔ اس میں کسی کا کیا قصور۔ میں کسی کو بھی الزام نہیں دیتی، ہو سکتا ہے اس میں میرے لئے کوئی بہتری ہو''۔ اس نے ایک آہ بھرتے ہوئے جملہ پورا

کیا۔

''تم پہلے کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہوگئی ہو۔ میں آج بھی تمہیں مس کرتا ہوں، مجھے یہ جان کر اور بھی زیادہ خوشی ہوئی کہ تم ایک معروف صحافی اور ایک بڑے روز نامے کی میگزین انچارج بن گئی ہو۔ خدا کرے تم مزید ترقی کرو''۔ عمران نے اس کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے دلی جذبات کا اظہار کیا۔

''تمہاری اس عزت افزائی کا شکریہ مگر میرے لئے تمہاری ان باتوں میں اب کوئی چارم نہیں رہا۔ وقت گزر بھی گیا اور بدل بھی گیا نہ میں وہ رہی اور نہ ہی تم وہ رہے۔۔ ہاں البتہ تم سے ملنے کی خواہش ضرور تھی، وہ پوری ہوگئی''۔ سمیرا نے خشک لہجے میں کہا پھر واپس اپنے دیگر ساتھیوں کی طرف پلٹ آئی، کچھ دیر ان کے ساتھ گپ شپ کرنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

رات دیر تک وہ جاگتی رہی، گزرے دنوں کی تلخ یادوں نے اسے پوری رات بیقرار رکھا۔ صبح دیر تک وہ سوتی رہی۔ دس بجے ناشتے کے بعد وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ مری کی سیر کرنے نکل کھڑی ہوئی۔ مری کے بازار سے اس نے اپنے گھر والوں کے لئے سوئیٹرز اور شالیں خریدیں پھر کچھ ڈرائی فروٹ خریدے۔ اس کے بعد کیبل کار کے ذریعے پوری مری کی سیر کر لی حالانکہ بلندی پر جاتے ہوئے اسے بہت ڈر لگ رہا تھا مگر دیگر ساتھیوں کی موجودگی میں اس کی گھبراہٹ کچھ کم ہوگئی۔ شام ہوتے ہی دھند چھانے لگی، تھوڑے تھوڑے فاصلے کی چیزیں دھند میں گم ہونے لگیں، یہ منظر دیکھ کر اسے مزہ بھی آیا اور خوف کا احساس بھی ہونے لگا۔ اس کے فوٹو گرافر آصف نے اس کے کئی پوز لئے پھر وہ دونوں کافی دور تک پیدل چلنے لگے چونکہ موسم بہت اچھا تھا لہٰذا وہ دونوں موسم کا لطف اٹھانے لگے، ایسا منظر بھلا کراچی میں کہاں ملتا، کراچی میں شور شرابہ اور ٹریفک کا دھواں تو انسان کو بے حال کر دیتا ہے جبکہ یہاں مری میں اونچے اونچے ہریالی میں ڈھکے پہاڑ، دور تک پھیلا سبزہ اس کے علاوہ گھنے درختوں کے جھنڈ، ماحول میں بسی سوندی سوندی خوشبو جذبات کو بے چین کر دیتی ہے۔ سمیرا اس ماحول اور منظر کو پوری طرح انجوائے کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ آصف کے ساتھ دو گھنٹے تک ٹہلتی رہی پھر تھکن محسوس ہونے پر واپس ہوٹل اپنے کمرے میں پہنچ گئی۔ رات کا کھانا اس نے کمرے ہی میں کھایا۔ انہیں صبح دس بجے مری سے اسلام آباد کیلئے روانہ ہونا تھا اور وہاں سے شام سات بجے کی فلائیٹ سے کراچی واپس پہنچنا تھا۔ سمیرا

نے رات ہی کو اپنے تمام کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر دیے تھے صرف سفر کا ایک جوڑا ہینگر میں رہنے دیا۔
دروازے پر دستک ہوئی، اس نے ہڑ بڑا کر کمرے کی مدہم روشنی میں وال کلاک کو دیکھا، رات کے تقریباً ساڑے گیارہ بجے تھے، وہ حیران ہوئی کہ اس وقت کون ہوگا؟ اس نے جلدی سے میز پر رکھا ہوا ڈوپٹہ اوڑھا اور کمرے کے اندر سے ہی پوچھا۔ ''کون ہے؟''
''میں ہوں عمران!'' آواز بھی آہستہ تھی۔ اس نے دروازہ کھولا وہ اندر داخل ہوا۔ سمیرا نے گھبرائے انداز میں باہر دیکھا کہ کوئی اسے دیکھ تو نہیں رہا، اطمینان کرنے کے بعد وہ اندر کی طرف مڑی۔
''کہو! اس وقت ایسی کیا خاص بات تھی کہ تم نے صبح ملنے کے بجائے رات کو ملنے میں قباحت محسوس کی''۔ اس نے جھلا کر پوچھا۔
''ناراض کیوں ہوتی ہو سمیرا، بھلا میں صبح تم سے سب لوگوں کی موجودگی میں کیسے مل سکتا تھا، اس لئے اب چلا آیا''۔ اس نے نظریں چراتے ہوئے جواب دیا۔
''ہوں، صبح سب کی موجودگی میں ملنا پسند نہیں، رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح مجھ سے ملنے چلے آئے، اتنے بڑے مقام پر پہنچ کر اور سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود آج بھی تم نہ صرف بزدل بلکہ مجبور بھی ہو، بالکل ماضی کی طرح آنٹی! کے کہنے پر تم نے لڑکیوں کی طرح شادی کے لئے حامی بھر لی تھی''۔ سمیرا نے طنز کے تیر برسا دیئے۔ وہ تلملا کر رہ گیا۔
''دراصل میں تم سے یہ کہنے کے لئے آیا تھا کہ میں آج بھی تمہیں چاہتا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟'' اس نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔
''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ میں ایک شادی شدہ آدمی سے کس طرح شادی کر سکتی ہوں جبکہ تمہارے بچے بھی ہیں، میں ایسا گناہ نہیں کر سکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ تم اپنے گھر والوں کے پریشر میں رہتے ہو، اسی پریشر کی بنیاد پر تم مجھ سے دور ہوئے اور اب میری اچھی خاصی زندگی کو کیوں برباد کرنے پر تلے ہوئے ہو، تمہاری ماں ایک گھمنڈی عورت ہے اور میں ایسی ڈکٹیٹر کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ مجھے بخشو''۔ سمیرا نے ایک ہی سانس میں اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میری شادی کو بارہ سال ہو چکے ہیں مگر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر اولاد ہو بھی جاتی تو بھی میں افشاں کے ساتھ نہیں رہتا، شادی کے بعد سے اب تک ہمارے درمیان اختلافات کے علاوہ کچھ بھی نہیں ہے، افشاں کو تمہارے اور میرے ماضی کا علم ہے۔ یہ تمام باتیں امی نے اس سے کہہ دی تھیں، اختلافات کی اصل وجہ بھی یہی ہے، پرسوں تم سے ملنے کے بعد میں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا''۔
عمران نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔
''یکطرفہ طور پر تم یہ فیصلہ کیسے کر سکتے ہو؟ تمہارا یہ فیصلہ مجھے بالکل قبول نہیں۔'' سمیرا نے درشتی سے کہا۔
''پلیز! مجھے مت ٹھکراؤ، میں مانتا ہوں کہ ماضی میں مجھ سے بہت بھول ہوگئی، اس وقت میں میچور نہیں تھا اور خود کفیل بھی نہیں، آج میرا اتنا بڑا کاروبار ہے، غفران اگر میرے ساتھ ہے تو اس کا اس کاروبار میں معمولی سا شیئر ہے، یہ لو میرا وزیٹنگ کارڈ، تم جب بھی اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو تو مجھے بتا دینا۔ اللہ حافظ' وہ اپنا مدعا بیان کر کے کمرے سے تیزی سے باہر کی طرف نکل گیا۔ سمیرا نے دوازہ بند کرلیا اور بستر پر دراز ہوگئی۔ وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوگئی، سوچ سوچ کے اس کے سر میں درد ہونے لگا بلآخر پرس میں سے اس نے ڈسپرین کی ایک ٹکیہ نکال لی اور پانی میں گھول کر پی گئی تھوڑی دیر بعد اسے نیند آ گئی۔
صبح آٹھ بجے اس کی آنکھ کھلی۔ نہا دھو کر وہ فریش ہوگئی۔ ناشتہ کمرے میں کیا اس کے بعد واپسی کی تیاری کرنے لگی۔ دس بجے ان کی کوسٹر آ گئی دیگر تمام صحافی ساتھیوں سمیت وہ بھی کوسٹر میں سوار ہوئی، جب کوسٹر گیٹ سے باہر نکل رہی تھی تو اس وقت عمران نے ہاتھ ہلا کر سب کو خدا حافظ کہا خاص طور پر اس کی نظریں سمیرا کا طواف کرتی رہیں۔
موسم ابر آلودہ تھا۔ کوسٹر میں انڈین گانے اونچی آواز سے سبھی سن رہے تھے، سمیرا بھی موسیقی کے سروں میں کھو سی گئی۔ وہ مری سے واپس جا تو رہی تھی مگر اسے پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا جیسے کوئی چیز کھو گئی ہے، ایک اداسی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہی تھی، وہ گاڑی سے باہر جھانکنے لگی، پہاڑوں کے پیچھے کالے گھنے بادل امڈ امڈ کر آگے کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے وہ ان کی گاڑی کا تعاقب کر رہے ہوں، گاڑی کی رفتار تیز تھی ہر چیز بڑی تیزی سے پیچھے دوڑ رہی تھی تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد وہ اسلام آباد پہنچے۔ اسلام آباد پہنچنے کے بعد انہوں نے کوسٹر

روک کر ایک مقامی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ پنڈی پریس کلب گئے انہوں نے پنڈی کے صحافیوں سے ملاقات کی اور وہاں کے حالات کا جائزہ لیا۔ پنڈی پریس کلب کے صدر نے انہیں شام کی چائے پر مدعو کرلیا اور گپ شپ کی۔ شام پانچ بجے وہ سب پریس کلب سے ایئر پورٹ کے لئے روانہ ہوئے۔ ایئر پورٹ پہنچ کر سمیرا نے اپنے ابو عباس کو فون پر بتایا کہ وہ رات نو بجے تک کراچی پہنچ جائے گی پھر اس نے ایئر پورٹ لاؤنج سے کچھ ٹافیاں اور چاکلیٹس خریدیں۔ اناؤنسمنٹ کے ساتھ ہی سمیرا اور دیگر ساتھی جہاز کے لئے روانہ ہوئے۔ جہاز نے ٹھیک سات بجے ٹیک آف کیا۔ نو بجے تک وہ سب کراچی ائیر پورٹ سے باہر نکل چکے تھے۔ اسلام آباد روانگی کے وقت سمیرا کے پاس ایک بیگ تھا لیکن اب واپسی پر اس کے پاس دو بیگ تھے کیونکہ اس نے مری سے کافی شاپنگ کی تھی۔ ٹھیک دس بجے وہ اپنے فلیٹ پر پہنچی۔ آصف اسے ڈراپ کر کے چلا گیا تھا۔ بھائیوں نے سامان اندر رکھا۔ عباس نے بیٹی کو گلے لگالیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا جب سمیرا اتنے دونوں گھر سے باہر رہی، کھانا اس نے جہاز میں ہی کھالیا تھا جبکہ اس کی امی فوزیہ نے بیٹی کی پسند کا کھانا تیار کرلیا تھا۔ سمیرا نے کپڑے بدلنے کے بعد بیگ کھول کر امی ابو اور بھائیوں کے لئے خریدی ہوئی چیزیں انہیں دے دیں۔ ابو کیلئے سوئیٹر، اپنی امی کیلئے شال، چھوٹی بہن حمیرا کے لئے اور اپنے لئے شالیں، بھانجے کے لئے سوئیٹر اور بھائیوں کے لئے بھی سوئیٹر خریدے تھے، اس کے علاوہ چاکلیٹس اور ڈرائی فروٹ بھی اس نے اپنی امی کو دیئے تاکہ وہ تمام لوگوں کو دے سکیں۔ رات تقریباً بارہ بجے تک وہ گھر والوں سے خوش گپیاں کرتی رہی اس کے بعد سوگئی۔ صبح دیر سے دفتر جانا ہوا کیونکہ تھکن ابھی نہیں اتری تھی۔ شام کو وہ جلدی گھر آ گئی۔

''امی! اب ہم یہاں نہیں رہیں گے، مکان شفٹ کرنا چاہئے کیونکہ علی اور سلمان بھی بڑے ہوگئے ہیں، تین بیڈ روم کے مکان میں اب گزارہ نہیں ہوسکتا۔ میں نے گلشن بلاک دو میں تین سو گز کا ایک مکان دیکھا ہے جو کافی کشادہ اور مین روڈ پر ہے، کرایہ بھی معقول ہے۔ ہم اپنا یہ فلیٹ کرائے پر اٹھادیں گے اور اس میں مزید پیسے ملا کر نیا مکان لیں گے'' سمیرا نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا چونکہ تجویز معقول تھی لہٰذا تمام گھر والے رضامند ہوگئے۔

یوں پندرہ دنوں بعد انہوں نے گھر تبدیل کرلیا۔ نئے مکان میں فون بھی تھا لہٰذا سمیرا اس خواری سے بچ گئی۔ یہ

مکان کشادہ، ہوادار اور شاپنگ سینٹر سے قریب تھا اس کے علاوہ بس اسٹاپ کا فاصلہ بھی کم تھا جبکہ اس کے ابو کے پاس ایک سوزوکی کار تھی جس میں وہ اپنی دکان جایا کرتے تھے۔ سمیرا کوچ سے اپنے دفتر جاتی رہی۔ اب کچھ دنوں سے دفتر کی کوسٹر صبح نو بجے دیگر تمام ساتھیوں کو لیتی ہوئی سمیرا کے گھر کے قریب سے اسے بھی پک کر کے دفتر لارہی تھی یوں کوچ کے انتظار کا مرحلہ بھی ختم ہوگیا، نئے گھر میں شفٹ ہونے کے بعد وہ اور اس کے خاندان کے سب ہی افراد بہت پرسکون ہونے کے علاوہ خوش تھے کیونکہ یہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ اس کے علاقے میں پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ سمیرا نے موبائل فون بھی لے لیا تھا۔ اس کی وجہ سے اسے آسانی ہوگئی تھی، موبائل فون کی بدولت دفتر اور گھر کا فاصلہ سمٹ گیا تھا یہی وجہ تھی کہ اگر دفتر میں کبھی دیر ہوجاتی تو اس کے والدین کو پریشانی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

جمعہ اور ہفتے کا دن اس کا بڑا مصروف گزرتا تھا کیونکہ ہر اتوار کو اس کا میگزین شائع ہوتا جس کی وجہ سے ان دودنوں اس پر کام کا لوڈ زیادہ ہی رہتا۔ آج بھی وہ دفتر سے بہت دیر بعد گھر پہنچی تھی، فریش ہوکر اس نے کھانا کھایا پھر اپنے کمرے میں آرام کی غرض سے چلی آئی، تھوڑی دیر تک اس نے اخبار کا مطالعہ کیا پھر سرہانے رکھے موبائل کو آف کرنے کے لئے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ بیل بجنے لگی۔ اس نے حیرت سے گھڑی کی طرف دیکھا رات کے تقریباً ساڑھے بارہ بج رہے تھے اس نے موبائل کے اسکرین پر نمبر کو نوٹ کیا تو وہ پنڈی کا کوڈ تھا۔

''ہیلو! کون؟'' اس نے مختصراً پوچھا۔

''سمیرا! میں عمران ہوں، تم کیسی ہو؟ میں نے تمہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟'' اس نے معذرت کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں، میں ابھی سونے کی کوشش کررہی تھی مگر تمہیں میرا موبائل نمبر کس نے دیا''؟ اس نے حیرت سے پوچھا

''یہ نمبر میں نے تمہارے فوٹو گرافر آصف سے لیا تھا، اس نے بھی بڑی حیل وحجت کے بعد تمہارا نمبر مجھے دیا ہے۔'' عمران نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کیوں، کیسے فون کیا'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''بس، مجھے تمہاری یاد آ رہی تھی۔ آصف نے بتایا کہ تم نے مکان بھی بدل لیا ہے بہرکیف نیا گھر مبارک ہو'' اس نے ایک ہی سانس میں جملہ مکمل کیا۔

''خیر مبارک! جہاں تک مجھے یاد کرنے کا تعلق ہے۔ پلیز تم مجھے یاد مت کرو، مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ میں ماضی کو بھول چکی ہوں، جن باتوں سے کچھ حاصل نہ ہو، وہ بات کرنا مناسب نہیں لہٰذا میں اس مسئلے پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی۔'' سمیرا نے سرد مہری سے کہا۔

''سمیرا، تم بہت بدل گئی ہو، دل آزادی کی باتیں مت کرو، حالات نے اگر تمہیں زخم دیئے ہیں تو میں بھی زخمی ہوا ہوں، میرے جذبات بھی کچلے گئے ہیں، میں بھی خوش نہیں ہوں، تم مجھے یوں ہرٹ مت کرو اگر مجھے تم سے محبت نہ ہوتی تو میں اس طرح رات گئے تمہیں فون نہ کرتا، میں جس مقام پر ہوں اور جس طرح کی پرآسائش زندگی گزار رہا ہوں میرے لئے لڑکیوں کی کمی نہیں ہے، اتنے برسوں بعد بھی میں آج تک اپنے دل میں اور زندگی میں تمہاری کمی محسوس کرتا ہوں، یہ بات تم کبھی نہ جان سکوگی، کاش تم جان سکو''۔ عمران نے جملہ مکمل کرنے کے بعد فون کی لائن کاٹ دی۔

لاشعوری طور پر سمیرا نے کافی دیر تک موبائل کو آن رکھا تا کہ عمران دوبارہ فون کرے مگر اس نے نہیں کیا بالآخر سمیرا نے فون آف کیا اور لائیٹ بجھا کر آنکھیں موند کر بستر پر پڑی رہی مگر نیند کوسوں دور تھی۔ اسے رہ رہ کر عمران کے آخری جملے کسی نتیجے پر پہنچنے کے لئے مجبور کر رہے تھے۔ رات کے تین بج گئے مگر وہ کسی صورت سو نہ سکی مجبوراً اس نے سکون کی ایک گولی لے لی اور سونے کی کوشش کرنے لگی۔ صبح اتوار کا دن تھا دفتر کی چھٹی تھی لہٰذا صبح پانچ بجے کے قریب اس کی آنکھ لگ گئی۔ دوپہر بارہ بجے تک وہ سوتی رہی۔ دروازے کی تیز دستک نے اسے بیدار کر دیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اس کی امی اور ابو پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے۔

''کیا ہوا؟ بیٹا خیریت تو ہے، تم آج اتنی دیر تک سوتی رہی۔ تم تو کبھی نو بجے سے زیادہ سوتی ہی نہیں ہو، ہم تو پریشان ہو گئے تھے''۔ فوزیہ نے بیٹی پر گہری نظر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''دراصل! کل میں بہت تھک گئی تھی، رات دیر تک پڑھتی رہی لہٰذا نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ صبح کے قریب آنکھ لگی تھی ظاہر ہے پھر جلدی کیسے اٹھتی''۔ سمیرا نے صفائی پیش کی۔ اس کی امی اور ابو نے اطمینان کا سانس لیا۔

سمیرا نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا۔ پھر موبائل کو چارج کے لئے رکھا اور ناشتے کیلئے ڈائننگ روم پہنچی۔
فوزیہ نے اس کے لئے پراٹھا اور آملیٹ تیار کر لیا تھا، ناشتے کے دوران اس نے اپنے اخبار کا مطالعہ کرنا شروع کیا۔ اس نے میگزین چیک کیا، آج کا میگزین بہت بھرپور تھا، اس کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔
ناشتے کے بعد اس نے اپنے تین چار جوڑے کپڑے استری کر لئے تاکہ دفتر جانے میں سہولت ہو، وہ عموماً اتوار کے دن اپنے زیادہ سے زیادہ کپڑے استری کر کے ہینگر میں لگا کر رکھا کرتی، اس طرح دفتر سے آنے کے بعد اسے کپڑے استری کرنے کی زحمت سے نجات مل جاتی اور آرام کرنے کا موقع ملتا تھا۔
اس رات کے بعد عمران نے تقریباً پندرہ دن تک فون نہیں کیا نہ چاہنے کے باوجود سمیرا کو اس کے فون کا انتظار تھا جب بھی موبائل کی گھنٹی بجتی سمیرا ایکدم چونک سی جاتی مگر وہ عمران کا فون نہ ہوتا کچھ دنوں سے وہ چڑ چڑی ہو گئی تھی، دفتر میں بھی اس کا رویہ جارحانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھی اور دوست اس کے اس بدلے رویے کو نوٹ کر رہے تھے۔
''سمیرا! تم نے کئی دنوں سے مجھے فون نہیں کیا۔ آنٹی بتا رہی تھیں کہ تم کچھ پریشان سی ہو۔ دفتر میں معاملہ ٹھیک تو ہے نا۔ کوئی پریشانی والی بات تو نہیں ہے''۔ اس کی دوست امبر نے گھر آتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ امبر ٹی وی پر نیوز ایڈیٹر تھی۔
''نہیں تو اللہ کا شکر ہے میری جاب بالکل ٹھیک ہے۔ دراصل کام کی زیادتی اور کم خوابی کی وجہ سے ذہنی دباؤ پیدا ہو گیا ہے اور کوئی خاص بات نہیں''۔ اس نے بات بناتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد سے سمیرا نے اپنے رویے میں تبدیلی کر لی۔ اپنے خیالات اور جذبات کو فی الحال دبا دیا، خوش رہنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو گئی۔

خواتین کا عالمی دن منایا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں اسے اپنے میگزین کے حوالے سے اندرون سندھ جانا پڑا۔ وہ اپنے فوٹو گرافر آصف کے ساتھ لاڑکانہ، سکھر، گڑھی یاسین، خیر پور اور مورو گئی وہاں اس نے بے شمار خواتین اور لڑکیوں سے ملاقاتیں کیں۔ ان میں باپردہ اور بے پردہ سبھی خواتین شامل تھیں وہاں جانے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ وہ ان تمام خواتین سے زیادہ خوش نصیب ہے کہ آزادی سے ہر جگہ آ جا سکتی ہے، اپنی پسند اور

ناپسند کا اظہار کرسکتی ہے، اپنی رائے کا استعمال بھی کرسکتی ہے مگر ترقی کے اس نئے دور میں جہاں ملکوں کے فاصلے اتنے سمٹ گئے ہیں کہ لمحوں میں جہاں چاہیں رابطہ کرسکتے ہیں، بات چیت ہوسکتی ہے۔انسان نے چاند ستاروں کے فاصلوں کو خلائی مراکز سے زمین کے قریب تر کرلیا ہے، اس جدید دور میں سندھ کی دیہی عورت آج بھی مرد کی غلام ہے۔اس کی ظاہری اور باطنی سوچ پر مرد کا پہرہ ہے۔اس کی پسند اور ناپسند تو بہت دور کی بات ہے، کسی عورت کو ہلاک کرنا ہو تو کاروکاری کا سہارا لے کر اسے زندہ درگور کیا جاتا ہے۔حوا کی بیٹی اتنی مظلوم ہوگی یہ تو کبھی ''اماں حوا'' نے بھی نہیں سوچا ہوگا۔خواتین کے عالمی دن کے حوالے سے سروے مکمل کرنے کے بعد جب سمیرا اندرون سندھ سے واپس لوٹی تو وہ بہت اداس اور افسردہ تھی ۔اس نے اللہ کا شکرادا کیا کہ وہ وہاں پیدا نہیں ہوئی، وہ تین دن بعد رات گئے گھر لوٹی، تھکن سے اس کا برا حال تھا، فریش ہونے کے بعد اس نے پہلی فرصت میں اپنا سروے مکمل کیا اور سوگئی۔

اگلے دن وہ دفتر دیر سے پہنچی مگر اپنا کام مکمل کرادیا، یوں رات بارہ بجے گھر واپس لوٹی ۔اتوار کو جب اس کا میگزین آیا تو اس کا سروے ہر طبقے میں پسند کیا گیا۔سمیرا اپنے سروے پر اتنی خوش نہیں تھی جتنی وہ سندھ کے پس منظر اور ماحول سے دلبرداشتہ تھی ،اسے وہ تمام باتیں اور واقعات جو وہاں سے معلوم ہوئیں بالکل ڈراؤنا خواب لگ رہے تھے۔وہ کئی دن تک جی بھر کے سو نہ پائی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ سمیرا کا موڈ ٹھیک ہونے لگا جو بات طبیعت پر گراں گزرے، انسان اس کو پہلے بھولنے کی کوشش کرتا ہے، سمیرا نے بھی یہی کیا۔خواتین کا عالمی دن اپنی تلخ یادوں کے ساتھ ایک سال کے لئے پس پردہ چلا گیا۔آزادی نسواں اور حقوق خواتین پر سیمینار کرنے والی مختلف تنظیمیں اور این ۔جی۔اوز، خوب دھواں دھار تقاریر کرنے کے بعد تھک ہار کر کسی اور ایشو پر لگ گئیں۔

عید قریب تھی ۔رمضان کا آخری عشرہ عبادت میں گزرتا ہے۔سمیرا نے بھی اس سال کافی اہتمام کیا تھا۔اس کی چھوٹی بہن حمیرا اپنے بیٹے کے ساتھ ان کے ہاں کچھ دنوں کے لئے آ گئی تھی۔سمیرا نے تمام گھر والوں کے لئے خاص طور پر حمیرا اور بھانجے کیلئے خوب شاپنگ کی تھی۔چاند ہوجانے کے بعد حمیرا کا شوہر عرفان بیوی اور بیٹے کو اپنے گھر لے گیا۔صبح عید تھی۔سمیرا نے ایک دن پہلے ہی عید کا انتظام کرلیا تھا، مختلف قسم کے کھانے اور میٹھے

پکوان تیار کرنے کے بعد فریج میں رکھ دیئے تاکہ عید کے دن پریشان نہ ہونا پڑے۔

اگلی صبح عید کی نماز پڑھنے کے بعد سمیرا تیار ہو گئی۔ گیارہ بجے کے قریب مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کے ابو کے دوست، اس کی بہن حمیرا اپنے شوہر اور بچے کے ساتھ آدھمکی، اس کے علاوہ چند ایک نئے پڑوسی بھی آن پہنچے۔ دوپہر تک ان سب کی مہمانداری ہوتی رہی اور اس طرح شام کے چار بج گئے۔ سمیرا آرام کی غرض سے اپنے کمرے میں آکر لیٹ گئی، تھوڑی دیر اخبار کی ورق گردانی کرتی رہی، موبائل کی بیل پر اخبار ہاتھ سے چھوٹ گیا، اسکرین پر نمبر دیکھا تو کوئی اندازہ نہیں ہو سکا کیونکہ آنے والا نمبر بھی کسی موبائل ہی سے تھا۔

''ہیلو؟'' اس نے دھیرے سے پوچھا۔

''عید مبارک ہو؟ کہو کیسی ہو؟'' عمران نے بغیر رکے جملہ پورا کیا۔

''خیر مبارک! میں ٹھیک ہوں۔ تم کیسے ہو؟'' سمیرا نے برجستہ پوچھا۔

''شکر ہے کہ تم نے میرا حال تو معلوم کیا، یہ بھی غنیمت ہے''۔ اس نے شوخی سے کہا۔

''گھر میں سب کیسے ہیں، خاص طور پر تمہاری امی'' سمیرا نے چبھتے لہجے میں پوچھا۔

''وہ ٹھیک نہیں ہیں۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھا ہوا ہے'' عمران نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''بلڈ پریشر بڑھنے کی کیا وجہ ہے، کیوں دوا سے افاقہ نہیں ہوا'' سمیرا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''دراصل میں نے کل رات ان سے کہہ دیا تھا کہ میں سمیرا سے شادی کر رہا ہوں بس اس کے بعد ہی سے ان کی طبیعت بگڑ گئی تھی''۔ عمران نے اٹکتے ہوئے بات مکمل کی۔

''ان کی طبیعت خراب ہونے کے باوجود بھی تم اپنی بات پر قائم ہو۔ یاد کرو آج سے برسوں پہلے بھی انہوں نے اپنی ضد اور تکبر کی بناء پر ہمیں ایک دوسرے سے دور کر دیا تھا، اب بھی وہی صورت حال ہے، صرف فرق اتنا ہے کہ اب تم خود مختار ہو، وہ تمہیں مجبور نہیں کر سکتیں'' سمیرا نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''شاید یہی بات ہے، بہرکیف اب میں صرف اپنی زندگی خود جینا چاہتا ہوں، بہت قربانی کا بکرا بن چکا، تم مجھے فیصلہ کر کے بتاؤ کہ تم نے کیا سوچا ہے، میں فوراً شادی کرنا چاہتا ہوں''۔ عمران نے پرزور لہجے میں کہا پھر چند

سرسری باتوں کے بعد فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

اس دفعہ سمیرا سنجیدہ ہوگئی کیونکہ عمران اس کا پہلا پیار تھا، وہ خود مختار ہی نہیں بلکہ معاشرے میں اس کا ایک اہم مقام بھی تھا، اس کے علاوہ اس کی گھمنڈی ماں کو نیچا دکھانے کا ایک سنہری خوبصورت موقع بھی اس کے ہاتھ آ رہا تھا، اسی کی وجہ سے وہ زندگی کی رنگینیوں کو بالکل ہی فراموش کر چکی تھی، اس کی زندگی کے کئی قیمتی سال بغیر کسی مقصد کے ہی بیت گئے تھے ورنہ آج اس کے آنگن میں کئی بچوں کی کلکاریاں گونج رہی ہوتیں۔ اس سوچ و بچار میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ اس نے عمران کا نمبر ڈائیل کیا اور اسے اپنے فیصلہ سے آگاہ کیا۔ فوزیہ اور عباس نے بیٹی کے فیصلے پر اعتراض نہیں کیا۔ برسوں کے انتظار اور صبر نے سمیرا کے دامن کو خوشیوں سے بھر دیا۔ آج وہ دو خوبصورت بچوں کی ماں اور مسز عمران کے نام سے جانی جاتی ہے۔ عمران کی ماں نسرین بنگلے کے ایک کونے میں پڑی ندامت کی زندگی گزار رہی ہے جبکہ افشاں نے دوسری شادی کرنے پر عمران سے طلاق لے لی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔ دیر آید درست آید۔

یادوں کے جھرونکے

''ڈاکٹر صاحب! کیا نائلہ کو ہوش آ گیا؟'' کمال نے بیتابی سے پوچھا

''نہیں ابھی نہیں آیا، وہ کومہ میں چلی گئی ہے، ہوسکتا ہے وہ کومہ سے واپس آ جائے یا پھر نا آ سکے، آپ ذہنی طور پر کسی بھی خبر کے لئے تیار رہیں'' ڈاکٹر مشتاق نے وضاحت کی اور آئی سی یو سے او پی ڈی کی طرف چل دیا۔

کمال نے اپنے جوتے اتار کر اسٹینڈ پر رکھے اور خود آئی سی یو میں داخل ہوا جہاں نائلہ موت وزیست میں مبتلا تھی۔کمال آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بیڈ کے قریب پہنچا، اس کے منہ اور ناک پر نلکیاں لگی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ خون اور گلوکوز بھی چڑھ رہا تھا مگر وہ بیہوش تھی، مصنوعی طور پر زندہ تھی، اس کا اپنا دل ودماغ کام نہیں کر رہا تھا، اس کا چہرہ بھی زرد تھا اور جسم بے جان۔ وہ پانچ منٹ تک اس کے سرہانے کھڑا رہا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''صاحب! آپ دعا کریں، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا''۔آئی سی یو میں موجود اٹینڈنٹ نے کمال سے کہا

''یہ آپ کی کون ہیں؟'' اٹینڈنٹ نے سوال کیا

''میری کزن ہیں'' کمال نے جھوٹ بولا جبکہ وہ اس کی دوست تھی پھر وہ باہر آ گیا، باہر نکلتے ہی اس کی نظر نائلہ کے شوہر وقاص پر پڑی، وہ اپنے چار بچوں سمیت اسپتال میں نائلہ کو دیکھنے آیا تھا۔وقاص نے نفرت سے کمال کو دیکھا، بچے بھی ان دیکھی کیئے آگے بڑھ گئے۔ان کے رویے سے کمال کو بڑی تکلیف پہنچی۔ وہ تیزی سے اسپتال سے باہر نکلا پھر اپنی بائیک اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

نائلہ گورے رنگت کی خوش مزاج خاتون تھی۔اس کا قد لمبا تھا۔وہ ملتان کی رہنے والی تھی۔اس کی بڑی بہن کا انتقال ہوا تو گھر والوں نے زبردستی اس کی شادی اس کے بہنوئی وقاص سے کر دی تھی۔وقاص سے دو بیٹے تھے۔نائلہ کی شادی کے وقت ایک بیٹا دس سال کا اور دوسرا آٹھ سال کا تھا، اس شادی سے نائلہ خوش نہیں تھی، ایک الھڑ لڑکی کے خواب چکنا چور ہو چکے تھے۔وہ تصور میں خود کو دلہن دیکھا کرتی تھی، اس کے خوابوں کا شہزادہ اس کا

اپنا عمر رسیدہ بہنوئی ہوگا اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا

نائلہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ساتویں جماعت پاس تھی، اس کے گھریلو حالات بھی اچھے نہیں تھے۔اس کے والدین بڑی مشکل سے اپنا گزر بسر کر رہے تھے ہاں البتہ اس کا بہنوئی یعنی شوہر تھوڑی بہت ٹھیکیداری کرتا تھا جس سے کچھ آمدنی ہورہی تھی۔کام کاج کرنے کے معاملے میں وہ مستقل مزاج نہیں تھا۔تین چار مہینے ٹھیکیداری کرتا باقی کے مہینے بیکار گھر میں پڑا رہتا۔غصے کا تیز اور شکی مزاج تھا۔معمولی معمولی باتوں پر چراغ پا ہوجاتا اور کبھی کبھار نائلہ پہ ہاتھ بھی اٹھالیتا۔نائلہ اس سے تنگ تھی۔میکے والوں کی غربت نے اسے وقاص کے ساتھ رہنے پر مجبور کر دیا تھا۔اس کی شادی کو دس سال ہو چکے تھے۔ان دس سالوں میں اس کی دو بیٹیاں پیدا ہوئیں۔نو سالہ صائمہ اور آٹھ سالہ فائزہ، ان دونوں بچیوں کی وجہ سے وہ وقاص کے ساتھ نباہ کر رہی تھی۔گھریلو حالات اور ماحول کے سبب نائلہ نے اپنا حلیہ بھی بدل لیا تھا۔دو دن بعد وہ بالوں میں کنگھا کرتی، بالوں کا جوڑا بے ہنگم طریقے سے بناتی، تمباکو والا پان ہر وقت دانتوں میں دبائے رکھتی جس کے سبب اس کے ہونٹ کتھے سے لال رہتے۔اس کے علاوہ کپڑے بھی عجیب و غریب انداز کے پہنتی، اس کا مقصد صرف تن ڈھاپنا خود کو سجانا سنوارنا نہیں تھا۔

''نائلہ! ہم بچوں سمیت کراچی چلتے ہیں'' وقاص نے اس سے مخاطب ہوکر کہا۔

''کیوں''؟ نائلہ نے تنک کر پوچھا۔

''میرا دوست سلیم کہہ رہا تھا کہ کراچی میں ٹھیکداری کا کام بہت زیادہ ہے اور وہاں اس کام کے پیسے بھی کافی ملتے ہیں'' اس نے نائلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر کراچی میں ہمارا کوئی، عزیز رشتہ دار نہیں ہے، ہم کس کے سہارے وہاں رہیں گے''۔نائلہ نے پریشانی کے عالم میں کہا

''کیوں نہیں ہیں؟ میری چچی ثریا وہاں رہتی ہیں، ان کے بچے بھی وہاں کام کرتے ہیں''۔وقاص نے اس کی تشویش دور کرتے ہوئے جواب دیا۔

''یہاں ملتان میں تو ہمارا اپنا ذاتی مکان ہے خواہ چھوٹا ہی سہی، کراچی میں کیسے مکان مل سکتا ہے، سنا ہے وہاں

کے فلیٹوں اور مکانوں کا کرایہ بہت زیادہ ہے'' ۔ نائلہ نے وضاحت کی۔

''میرے پاس تھوڑے سے پیسے ہیں، اس سے ہم کرائے کا مکان لے لیں گے، میری ٹھکیداری چل گئی تو دیگر گھر کا سامان بھی خرید لیں گے'' ۔ وقاص نے اپنی پلاننگ بتاتے ہوئے کہا۔

''دیکھ لو! کہیں پریشانی نہ ہو جائے پھر بچوں کا بھی ساتھ ہے'' ۔ نائلہ نے حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ مالک ہے، تم ہمت تو کرلو'' اس نے زور دیتے ہوئے جواب دیا۔

تقریباً پندرہ دن بعد وہ سب کراچی پہنچے۔ وقاص کے چاچا اور چاچی لائنز ایریا میں رہتے تھے۔ وقاص اپنی پوری فیملی سمیت ان کے گھر پہنچا۔ لائنز ایریا میں اُس کی چاچی اسی گز کے مکان میں مقیم تھی وہ علاقہ کافی گنجان تھا جہاں سے اسکوٹر بھی بمشکل گزر سکتا تھا، یہ علاقہ دیکھنے کے بعد نائلہ کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی کیونکہ ملتان جہاں وہ رہتی تھی وہاں کی گلیاں کافی کشادہ تھیں، یہاں اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا۔

دو تین دن کی بھاگ دوڑ کے بعد انہیں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر مل گیا۔ یہ مکان ایک سرونٹ کوارٹر سے بھی چھوٹا تھا۔ ایک بیڈ روم، چھوٹا سا صحن جس میں ایک طرف باورچی خانہ بنا ہوا تھا، بیڈ روم کا دروازہ نہیں تھا بلکہ اس پر پردہ ڈلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا واش روم جس میں بمشکل ایک آدمی سما سکتا تھا۔

نائلہ ملتان سے آتے ہوئے اپنے ساتھ دو بچھانے کی دریاں لے آئی تھی جس پر پورا خاندان رات کے وقت گزارہ کر رہا تھا۔ کراچی آنے کے پندرہ دن بعد وقاص کو ٹھیکداری کا کچھ کام مل گیا، اس کے علاوہ نائلہ کے سوتیلے بڑے بیٹے ارسلان کو ایک دکان پر ڈھائی ہزار کی نوکری مل گئی کیونکہ وہ آٹھویں جماعت پاس تھا، اس لئے کسی بڑی جگہ نوکری نہیں کر سکتا۔ چھوٹا بیٹا کامران گھر ہی پر بیٹھا رہتا تھا یا محلے کے لڑکوں کے ساتھ مٹر گشت کرتا۔ اپنی دونوں بچیوں کو نائلہ نے گورنمنٹ اسکول میں داخل کر دیا تھا تا کہ وہ کسی قابل ہو جائیں۔

وقت گزرتا رہا۔ کراچی میں رہتے انہیں دو سال ہو گئے، یہاں آنے کے بعد بھی ان کے حالات جوں کے توں ہی رہے۔ ملتان سے یہاں منتقل ہونے کے باوجود وقاص کے طور طریقے نہیں بدلے، کام چوری کی عادت وہی رہی یعنی تین چار ماہ کام کرنا اور باقی مہینے آرام کرنا۔ گھر میں کوئی ساز و سامان نہیں تھا۔ ان دو سالوں میں

ان کے گھر میں صرف دو چار پائیوں کا اضافہ ہوا تھا اس کے علاوہ تین ٹین کے صندوق خریدے گئے جس میں کپڑے ٹھنسے ہوئے تھے۔

''خالہ امی! کیا پکایا ہے؟ ارسلان نے دکان سے واپسی پر پوچھا

''آلو مٹر کے ساتھ روٹیاں پکائی ہیں'' نائلہ نے بیزاری سے جواب دیا۔

''کئی دنوں سے ہم دال اور سبزیاں کھا رہے ہیں، کبھی گوشت بھی پکا لیا کریں'' ارسلان نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ گوشت پکالوں! تمہارے ابو کا کوئی کام نہیں ہے۔ تمہارے ڈھائی ہزار میں گھر کا کرایہ اور گزارا کیسے ہو سکتا ہے''۔ نائلہ نے لمبی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

ارسلان خاموش ہو گیا۔ وہ اپنے ابو کی خصلت جانتا تھا کہ وہ زیادہ عرصے ٹک کر کام نہیں کرتے بس گھر میں بیٹھے بیٹھے سب کا جینا حرام کرتے رہتے ہیں۔

''نائلہ! تم کہیں نوکری کر لو'' اس کی پڑوسن ناصرہ نے کہا۔

''تم پاگل ہو گئی ہو، میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں، کراچی کے راستے بھی ٹھیک طرح سے نہیں جانتی، مجھے کون نوکری دے گا''۔ اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''ہمارے ہاں کل شام کا اخبار آیا تھا، اس میں خواتین کے لئے سنہری موقع کے نام سے ایک اشتہار چھپا تھا، وہاں کوشش کر کے دیکھ لو''۔ ناصرہ نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''لاؤ وہ اخبار مجھے دے دو تا کہ میں ارسلان سے کہوں کہ وہ مجھے اس جگہ لے جائے، جہاں کا اشتہار چھپا ہے''۔ نائلہ نے رضامند ہوتے ہوئے کہا۔

اگلے دن نائلہ نے صندوق میں سے صاف ستھرے کپڑے نکالے پڑوسن سے استری لی اور اسے پریس کرنے کے بعد ارسلان کے ساتھ مطلوبہ دفتر روانہ ہوئی۔ وہ دفتر میکلوڈ روڈ یعنی آئی آئی چندریگر روڈ پر واقع تھا، یہ ایک اخبار کا بڑا کشادہ دفتر تھا وہاں کافی لوگ موجود تھے، انہیں دیکھ کر نائلہ نروس ہو گئی، ایڈیٹر کے چیمبر میں انٹرویو ہو رہے تھے۔ تین چار لڑکیوں کے بعد اس کی باری تھی۔

''آپ کا نام''؟ جنرل منیجر نے پوچھا

''نائلہ''اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ''اگلا سوال پوچھا گیا

''جی! میں شادی شدہ ہوں''اس نے دھیمے لہجے میں جواب دیا

''اس سے پہلے کبھی کسی جگہ کام کیا ہے''۔جنرل منیجر ذیشان نے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں''۔اس نے کہا

''آپ کی تعلیم کتنی ہے''؟

''جی میں زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہوں''نائلہ نے برجستہ کہا

''پھر آپ کیسے کام کریں گی؟''ذیشان نے پوچھا

''آپ جو بتائیں گے وہی کروں گی''اس نے جواب دیا

''ہمیں ایسی خاتون کی ضرورت ہے جو ہمارے اخبار کیلئے کلاسیفائیڈ اشتہار لے آئے''ذیشان نے وضاحت کی۔

''یہ کلاسیفائیڈ اشتہارات کیا ہوتے ہیں''۔نائلہ نے تعجب سے پوچھا

''یہ چھوٹے موٹے روزمرہ کے اشتہارات جیسے''ضرورت ہے''یا پھر چھوٹی دکان والے اپنی دکان کی تشہیر کے لئے اخبارات میں ایسے اشتہارات دیتے ہیں، کیا آپ ایسے اشتہارات لاسکتی ہیں''اس نے پوچھا

''کوشش کر کے دیکھ لیتی ہوں شاید میں لانے میں کامیاب ہو جاؤں''۔نائلہ نے پرعزم لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے آپ کل سے صبح نو بجے آ جائیں''ذیشان نے کہا۔

''تنخواہ کتنی دیں گے''؟نائلہ نے پوچھا۔

''ہم آپ کو کرائے کی مد میں تین ہزار دیں گے اگر آپ ماہانہ پچاس ہزار کا بزنس لائیں گی تو اس پر ہم آپ کو دس پرسنٹ الگ دیں گے''۔اس نے وضاحت کی۔

''ٹھیک ہے میں کل سے آجاؤں گی''نائلہ نے کہا

اگلے دن اس نے بچوں کو ناشتہ دے کر اسکول بھیجا۔ارسلان دکان پر چلا گیا۔چھوٹا بیٹا کامران اور وقاص

دونوں گھر پر موجود رہے۔ وہ تیار ہو کر نمائش کے اسٹاپ پر کھڑی رہی، کافی دیر کے بعد 8A کی بس آئی جو چند ریگر روڈ جاتی تھی، وہ اس میں سوار ہوئی اور دفتر پہنچی

دفتر میں ذیشان پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے نائلہ کو بزنس کی کئی باتیں سمجھائیں اس کے علاوہ ریٹ کارڈ اور ٹیرف بھی اسے دیئے پھر اسے ساتھ لے کر اپنی کار کے ذریعے صدر ریگل پہنچا۔ اس نے نائلہ کو دور سے مختلف الیکٹرونک شاپس دکھائیں اور سمجھایا کہ چھوٹے موٹے اشتہارات وہ یہاں سے حاصل کر سکتی ہے۔

''اسلام وعلیکم''! اس نے ایک دکان میں قدم رکھتے ہوئے کہا۔

''وعلیکم واسلام''! آپ کو کیا چاہیئے۔ دکاندار نے سوال کیا۔

''جی! مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں اپنے اخبار کیلئے آپ کا اشتہار لینا چاہتی ہوں''۔ نائلہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہم نے کبھی اخبار میں اشتہار نہیں دیا۔ ہماری دکان پر گاہک ویسے ہی بہت آتے ہیں'' دکاندار نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ اشتہار دے کر تو دیکھ لیں، ہوسکتا ہے گاہک اس سے زیادہ آ جائیں'' نائلہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ دکاندار تھوڑی دیر سوچنے لگا پھر اس نے نائلہ سے وعدہ کیا کہ وہ دو دن بعد اشتہار دے گا۔

وعدہ کے مطابق اس دکاندار نے اخبار کے لئے ایک 10 سینٹی میٹر کا اشتہار دس دنوں کیلئے پانچ ہزار طے کر کے دے دیا۔ نائلہ خوشی خوشی وہ اشتہار لے کر دفتر میں ذیشان کے پاس پہنچی۔ وہ بھی خوش ہوا کہ دو دنوں میں اس نے کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اب نائلہ کی جھجک رفتہ رفتہ دور ہونے لگی، اس میں اعتماد سا پیدا ہونے لگا۔ بیس دنوں کے دوران اس نے پینتیس ہزار کا بزنس کر لیا تھا مگر اس کا گیٹ اپ وہی تھا یعنی بال الجھے ہوئے، منہ میں پان دبا ہوا، کپڑوں کا استعمال بھی بالکل گھریلو انداز کا۔ اس کے شب و روز یکساں ہی رہے۔ کئی بار ذیشان نے اسے ٹوکا کہ وہ اپنا حلیہ درست کرے مگر وہ سنی ان سنی کر دیتی۔ مہینہ ختم ہونے پر اسے تین ہزار روپے کرائے کی مد میں اور پانچ ہزار کمیشن کے ملے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ گھر پہنچ کر اس نے تین ہزار شوہر اور بچوں سے چھپا کر رکھے اور پانچ ہزار سے اپنے گھر کے اخراجات پورے کئے، دو نئے جوڑے بھی سلوا لئے تا کہ دفتر کا بھرم بھی قائم رہے۔

وقت گزرتا رہا۔ وہ صبح جاتی اور شام سات بجے تک گھر لوٹا کرتی۔ گھر پہنچ کر وہ بہت تھک جاتی مگر بچوں کے لئے کھانا پکانا بھی ضروری تھا، کھانے سے فارغ ہو کر وہ بارہ بجے تک سو جاتی۔ دو برس تک اس کا یہی معمول رہا۔ وقاص نے اب کام کرنا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بیوی کی کمائی پر عیش کر رہا تھا۔ نائلہ اس کی کام چوری سے دل ہی دل میں کڑھتی رہتی، کسی دن تنگ آ کر وہ وقاص کو کام کرنے کے لئے کہتی تو وہ گالی گلوچ اور مار کٹائی پر اتر آتا لہٰذا نائلہ نے اسے کام دھندے کا کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ گھر میں اب تک ساز و سامان میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ نائلہ کے آٹھ ہزار سے چھ افراد کا گزارا ہی بمشکل ہوتا تھا پھر مکان کا کرایہ، اس کے علاوہ نائلہ کے آنے جانے اور پان کے اخراجات ہی کافی زیادہ تھے۔ اپنی بڑی بیٹی صائمہ کو اس نے کھانا پکانا سکھا دیا تھا۔ اب وہ کھانا پکانے لگی تھی ہاں البتہ چھٹی والے دن وہ کھانا خود ہی پکا لیتی تھی۔

''امی! ٹی وی لے آئیں ہمیں بہت بوریت ہوتی ہے'' چھوٹی بیٹی فائزہ نے کہا

''کیسے لے آؤں؟ مجھے اتنے پیسے کہاں ملتے ہیں کہ ٹی وی خرید سکوں'' نائلہ نے افسردگی سے جواب دیا۔

''قسطوں پر لے لیجئے۔ صدر میں آپ کے جاننے والے دکاندار ہیں نا، ان سے تو مل سکتا ہے''۔ فائزہ نے تجویز پیش کی''

''سر! مجھے صدر سے قسطوں پر ٹی وی چاہئے اگر آپ نے ضمانت دے دی تو مجھے ٹی وی مل جائے گا''۔ نائلہ نے ذیشان سے التجا کرتے ہوئے کہا۔

دو دن بعد ذیشان نے صدر سے بیس انچ کا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی نائلہ کو قسطوں پر دلوا دیا۔ اس کے بچے بہت خوش ہوئے، وقاص کو بھی بیٹھے بٹھائے مفت کی تفریح مل گئی۔ اب وہ گھر میں جم کر بیٹھ گیا۔ مفت کی روٹی کھا کر آرام سے ٹی وی دیکھتا رہتا اور نائلہ اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرنے کے لئے سڑکوں پر دھکے کھاتی رہی مگر اسے اپنی بیوی پر ترس نہیں آتا تھا۔

نائلہ بہت محنت سے کام کر رہی تھی۔ دفتر کے لوگ بھی اس سے خوش تھے اس کے دفتر میں ایک دوسری خاتون انفارمیشن سے ملنے والے اشتہارات پر کام کر رہی تھی، اس کا نام کنول تھا۔ دوپہر کے وقت نائلہ اور کنول اکثر اکھٹے کھانا کھاتے تھے۔ کنول نے بھی نائلہ کی کافی مدد کی تھی، منیجر مارکیٹنگ ذیشان اپنے تمام بزنس ایگزیکٹو

کے ساتھ محنت اور شفقت سے پیش آتا تھا خاص طور پر وہ خواتین کا بہت احترام کیا کرتا تھا یہی وجہ تھی کہ نائلہ گھریلو خاتون ہوتے ہوئے بھی اس ماحول میں خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔

ایک دن ذیشان نے نائلہ کو سمجھایا کہ وہ سپلیمنٹ پر بھی کام کرے، اس حوالے سے اس نے بیوٹی پارلرز کا نام تجویز کیا یعنی بیوٹی پارلرز پر سپلیمنٹ تیار کرنے کو کہا چونکہ نائلہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی، وہ پریشان ہوگئی، اخبار کے ایڈیٹر سلیم نے کمال کا نام تجویز کیا کہ وہ اس کی مدد سے سپلیمنٹ تیار کر سکتی ہے۔

کمال ادارے میں جنرل رپورٹر، کم گو اور خوش مزاج لڑکا تھا، جب اسے پتہ چلا کر نائلہ اس کے ساتھ بیوٹی پارلر پر کام کرے گی تو وہ پریشان ہوگیا کیونکہ وہ کبھی کسی خاتون کے ساتھ رپورٹنگ کے حوالے سے نہیں گیا تھا، اسے جھجک سی محسوس ہوئی تو ذیشان نے اسے مطمئن کر دیا دو دن بعد کمال اور نائلہ بیوٹی پارلر کے سلسلے میں مختلف علاقوں میں گئے وہاں موجود بیوٹیشن کے انٹرویوز لیے اور ساتھ ہی ساتھ نائلہ نے اشتہارات حاصل کر لئے۔ اس طرح پندرہ بیس دنوں میں انہوں نے کافی اشتہارات اکھٹے کر لیے۔کئی بیوٹی پارلرز نے نائلہ کو مفت سروس دینے کی پیشکش کی جو اس نے قبول کر لی۔

ایک دن نائلہ دفتر آئی تو اس کا حلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔اس کے بال شانوں تک تراشے ہوئے، گولڈن ڈائی سے بہت حسین لگ رہے تھے، چہرے پر فیشل کرنے کی وجہ سے اس کی خوبصورتی میں اضافہ ہوگیا تھا، اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا، لباس کا انتخاب بھی اچھا تھا، اس تبدیلی کو دفتر کے تمام لوگوں نے نوٹ کیا۔

''کیا بات ہے بھئی۔کس پر بجلی گرا کر آ رہی ہو''۔ذیشان نے قہقہہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''ارے بھئی! میں کس پر بجلی گراؤں گی جس پر گرنی تھی وہ تو گر چکی'' نائلہ نے جھینپتے ہوئے جواب دیا۔

سپلیمنٹ کا سلسلہ ایک ماہ تک چلتا رہا۔اس دوران نائلہ اور کمال صبح سے اکھٹے اسکوٹر پر نکل جاتے اور شام پانچ بجے تک دفتر میں ان کی واپسی ہوتی۔اس ایک مہینے کے دوران کمال اور نائلہ ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ یہ بات دفتر کے لوگوں نے بھی نوٹ کی پھر یہ قربت بڑھتی ہی چلی گئی۔نائلہ رات دیر تک کمال کے ساتھ دفتر میں بیٹھی رہتی واپسی پر وہ نائلہ کو اس کے گھر کے قریب ڈراپ کر دیتا، یہ سلسلہ چلتا رہا۔

''نائلہ! آج کل تم بہت دیر سے گھر آنے لگی ہو، کیا بات ہے؟ پہلے شام چھ یا سات بجے تک پہنچ جایا کرتی

تھی۔اب کیا ڈیوٹی بڑھ گئی ہے کیا''؟ وقاص نے طنز کیا۔

''دراصل ایک سپلیمنٹ کی تیاری میں لگی ہوئی ہوں، تھوڑے پیسے زیادہ مل جائیں گے تو بچوں کے کام آئیں گے''۔نائلہ نے اپنا پرس صائمہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے جواب دیا۔

''ارسلان بتا رہا تھا کہ تم کسی شخص کے ساتھ اسکوٹر پر آئی ہو''اس نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں!وہ رپورٹر کمال ہے، دیر ہو گئی تھی تو اس نے مجھے یہاں تک پہنچایا، اس میں کیا بری بات ہے؟''اس نے الٹا وقاص سے سوال کیا۔

''بری بات ہے، میں نہیں چاہتا کہ تم کس غیر مرد کے ساتھ اسکوٹر پر سفر کرو''۔وقاص نے غصے کے عالم میں کہا۔

''جب آپ کو غیر مرد کے ساتھ مجھے دیکھنا اچھا نہیں لگتا تو پھر آپ خود کام کیا کریں، میں گھر بیٹھ جاتی ہوں۔ مجھے بزنس کے لئے دھکے کھانا ویسے ہی اچھا نہیں لگتا''۔اس نے تنک کر کہا اور واش روم میں داخل ہو گئی۔

وقاص دل ہی دل میں اسے کوسنے لگا۔

نائلہ گھریلو حالات سے تنگ تھی پھر وقاص جو اس کی عمر سے کافی بڑا تھا ایک نمبر کا کام چور، اس کے علاوہ اس پر گالی گلوچ اور مار کٹائی بھی کرتا تھا۔اس سے وہ دل ہی دل میں نفرت کرتی تھی، کمال سے ملاقات کے بعد وقاص اسے کھلنے لگا تھا، وقاص کی باتیں زہر بھری ہوتیں جبکہ کمال کی باتوں میں مٹھاس تھی، وہ نرم روی سے گفتگو کرتا تھا، اس کے علاوہ اس کی شخصیت بھی اچھی تھی یہی وجہ تھی کہ نائلہ کا جھکاؤ اس کی طرف ہوتا چلا گیا۔

اخبار میں سپلیمنٹ چھپا جو بہت کامیاب رہا۔تحریر و ترتیب پر کمال اور نائلہ کا نام لکھا گیا تھا۔ بزنس میں ان دونوں کی جوڑی کامیاب رہی لہٰذا ادارے نے مستقل بنیاد پر ان دونوں کو بزنس کے حوالے سے اکٹھے رکھنے کا فیصلہ کیا اب نائلہ اور کمال ہر جگہ اکٹھے آیا جایا کرتے، ان کی جوڑی دیگر اخبارات میں بھی مشہور ہونے لگی۔ نائلہ کا حلیہ اتنا بدل گیا تھا کہ اب اس کے رشتہ دار بھی اسے نہیں پہچانتے تھے، وقاص اس کو نکھرتا دیکھ کر جلتا رہتا۔ اب تو اس کے بچے بھی باپ کے بہکاوے میں آ کر، ماں جلی کٹی سنایا کرتے، وہ خاموشی سے سب کی باتیں سن کر پی جاتی۔

کمال سے ملنے کے بعد نائلہ کو جینے کا سلیقہ آ گیا تھا۔اس میں زندگی کی امنگ پیدا ہو گئی تھی اب وہ ہر وقت ہنستی

مسکراتی نظر آنے لگی تھی، اتنا تو وہ بھی جانتی تھی کہ کمال اسے کبھی نہیں مل سکتا کیونکہ وہ ایک شادی شدہ اور بچوں کی ماں تھی جبکہ کمال اس کا ہم عمر اور کنوارہ تھا۔ ان کا ملاپ کبھی بھی نہیں ہو سکتا تھا یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے نائلہ کمال کی طرف بڑھتی رہی، اس طرح ان دونوں نے حقیقت کو نظر انداز کر دیا تھا، وہ صرف آج کے لئے سوچ رہے تھے، مستقبل کے متعلق سوچنا فضول تھا، اس میں تلخیوں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

''سر! آپ سے ملنے کیلئے کوئی وقاص صاحب آئے ہیں'' پیون نے ذیشان سے کہا۔

''اندر بھیجو'' ذیشان نے جواباً کہا۔

''جی! فرمایئے آپ کو کس سلسلے میں ملنا ہے؟'' ذیشان نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''نائلہ اکثر آپ کا تذکرہ کرتی رہتی ہے۔ میں نائلہ کا شوہر ہوں''۔ وقاص نے اپنا تعارف کرایا۔

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر'' ذیشان نے خوشی کا اظہار کیا۔

''نائلہ رات کافی دیر سے آتی ہے، کیا آپ لوگ چھٹی کا وقت مقرر نہیں کرتے؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''دیکھیے وقاص صاحب! اخبار میں آنے کا وقت تو مقرر ہے مگر جانے کا نہیں خاص طور پر بزنس کرنے والے دیر تک موجود رہتے ہیں'' اس نے معاملہ سمجھ کر سلجھانے کی کوشش کی۔

''یہ کمال کون ہے؟ نائلہ اکثر اس کے ساتھ آتی ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ نائلہ کو اس کے علاوہ کسی اور کے ساتھ بھیجا جائے؟'' وقاص نے اصل معاملے کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

''کمال ہمارا بہت اچھا رپورٹر ہے، نائلہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں ہے، اس لئے رپورٹنگ کے لئے اسے ساتھ جانا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ وہ بزنس بھی کافی کر رہی ہے، ورنہ اس کے لئے مشکل ہو جاتی'' ذیشان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''دیکھیے! کوشش کریں کہ وہ گھر جلدی پہنچ جائے، بچے بھی اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں، آپ کی مہربانی ہوگی'' وقاص التجا پر اتر آیا۔

''ٹھیک ہے میں اسے گھر جلدی بھجوا دیا کروں گا'' اس نے وقاص کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

نائلہ اور کمال پانچ بجے دفتر پہنچے تو ذیشان نے ان دونوں کو اپنے چیمبر میں بلوایا۔

''نائلہ! آج تمہارے شوہر دفتر آئے تھے، وہ شکایت کر رہے تھے کہ تم کافی رات گئے گھر پہنچتی ہو، پلیز! تم جلدی گھر جایا کرو ورنہ ادارے کا نام خراب ہوگا، مجھے تمہارے گھریلو حالات کا اندازہ ہے، تمہارا کام چور شوہر سونے کی چڑیا کو کھونا نہیں چاہتا پھر بچے بھی تم سے بدظن ہو جائیں گے۔'' ذیشان نے اسے سمجھایا۔

نائلہ کا موڈ خراب ہو گیا اسے اندازہ نہیں تھا کہ وقاص اس کے دفتر تک آ جائے گا، وہ خاموشی سے گھر اکیلی ہی چلی گئی۔ دوسرے دن نائلہ دیر تک پڑی سوتی رہی۔

''امی! اٹھیں دفتر نہیں جانا ہے، ہمیں اسکول کے لئے بھی دیر ہو رہی ہے'' صائمہ نے ماں کو جگاتے ہوئے کہا۔

''نہیں اب میں دفتر نہیں جاؤں گی، تمہارے ابو کمائیں گے اور میں گھر پر رہوں گی''۔ اس نے چلاتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس کر رہی ہو''؟۔ وقاص نے چیختے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو کل میرے دفتر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ میری پوزیشن بھی خراب کر دی، مجھ پر شک کرنے کے بجائے اپنے اعمال درست کریں، گھر میں بیٹھے بیٹھے بیوی کی کمائی پر ہاتھ صاف کرتے رہتے ہیں''۔ نائلہ نے بولڈ ہو کر کہا۔ اس جملے پر وقاص آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے نائلہ کی پٹائی کر دی، بچوں نے بیچ بچاؤ کرایا، وہ کافی دیر تک روتی رہی، آج اس نے چھٹی کر لی یعنی دفتر نہیں گئی۔

دفتر میں کمال تمام دن بور ہوتا رہا وہ نائلہ کے متعلق سوچنے لگا کیونکہ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ نائلہ کا شوہر دفتر آیا تھا لازمی طور پر کوئی ایسی بات ہوئی ہوگی کہ نائلہ دفتر نہیں آئی، وہ اس مسئلے پر سوچتا رہا، اگلے دن نائلہ دفتر آئی تو اس کے چہرے پر نیل کے نشان تھے، جو اس بات کا ثبوت تھے کہ اس کے شوہر نے تشدد کیا تھا، ذیشان کے پوچھنے پر نائلہ نے تمام قصہ سنایا، اسے بھی بہت افسوس ہوا، اب نائلہ شام سات بجے تک گھر جانے لگی تھی، وہ معاملے کو آگے بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔

دن گزرتے رہے، ادارے میں نائلہ کو تین سال ہو گئے، اس کی مالی حالت تھوڑی سی بہتر ہو گئی تھی مگر گھر میں ساز و سامان بالکل نہیں تھا، وہی چھوٹا سا مکان، وہی ماحول اور بس۔ مہنگائی اتنی زیادہ تھی کہ اس کی آمدنی سے صرف پیٹ کا دوزخ ہی بھر پاتا تھا ہاں البتہ بچوں کے کپڑے اور اسکول کی فیس وقت پر ادا ہو جاتی تھی

حالانکہ وہ مہینے کے آٹھ سے دس ہزار کماتی تھی مگر پس انداز نہیں کر پاتی تھی، وہ خود اس بات سے پریشان تھی کہ آخر بچت کیوں نہیں ہوتی۔

"کنول! یہ بتاؤ کہ میری کمائی سے میں کچھ بچالوں ایسا نہیں ہو پاتا آخر اس کی کیا وجہ ہے"؟ نائلہ نے ادارے کی ساتھی خاتون سے پوچھا۔

"یہ پرابلم تو میرے ساتھ بھی ہے، بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ عورت کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی، مرد تھوڑا بھی کمالے تو اس میں گزارا ہو جاتا ہے"۔ کنول نے اس سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"سر ذیشان نے مجھے دو بڑے کلائنٹ دیئے ہیں، آج کل میں اس پر کام کر رہی ہوں" نائلہ نے معلومات دیں۔

"کچھ کامیابی ہوئی" کنول نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیا خاک کامیابی ہوتی وہاں کا میڈیا منیجر مجھ سے بیس پرسنٹ ایڈوانس مانگ رہا ہے، میں کہاں سے دوگی" نائلہ نے افسردگی سے کہا۔

"سر ذیشان سے بات کرو شاید وہ تمہیں کوئی راستہ بتادیں؟" کنول نے تجویز پیش کی۔

"میں نے ان سے بات کی تھی، انہوں نے پندرہ پرسنٹ پر ڈن کرنے کے لئے کہا ہے"۔ نائلہ نے وضاحت کی۔

"اس میں سے تمہیں کیا ملے گا"؟ کنول نے تعجب سے پوچھا۔

"صرف دس پرسنٹ اور بس" نائلہ نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

ایک دن نائلہ ایک ایجنسی میں اشتہار کے سلسلے میں گئی، اتفاق سے اس دن کمال اس کے ساتھ نہیں تھا۔

"جاوید صاحب! ہمارا اخبار بھی نیشنل ڈیلی ہے۔ آپ اپنی میڈیا لسٹ میں ہمیں بھی شامل کرلیں"۔ نائلہ نے میڈیا منیجر سے کہا۔

"کلائنٹ راضی نہیں ہوگا، وہ ریجنل اخبارات کو شامل کرنا نہیں چاہتا"۔ جاوید نے صفائی پیش کی۔

"مگر میں نے چھوٹے موٹے ریجنل اخبارات میں بھی آپ کا ایڈ دیکھا ہے"۔ نائلہ نے برجستہ کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کا اخبار بھی اس میڈیا پلان میں شامل ہو'' جاوید نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

ہفتے اور اتوار کو زیادہ تر ایڈورٹائزنگ ایجنسیاں بند ہوتی ہیں۔ ان دو دنوں کے دوران اخبارات کے دفتر میں بزنس کرنے والے کم ہی آتے ہیں یا پھر جلدی گھر کو لوٹ جاتے ہیں۔ ہفتہ کا دن تھا نائلہ آج ذرا دیر سے آئی تھی۔ کمال دفتر میں موجود نہیں تھا وہ کنول کے ساتھ بیٹھی گپ شپ کر رہی تھی اچانک فون کی گھنٹی بجی تو کنول نے فون ریسیو کیا پھر اس نے ریسیور نائلہ کی طرف بڑھایا۔

''ہیلو! کون'' نائلہ نے پوچھا۔

''جاوید نیرنگ ایجنسی سے بول رہا ہوں''

''جی فرمایئے! آپ کیسے ہیں؟'' نائلہ نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں کیا آپ اس وقت آ سکتی ہیں'' جاوید نے سوال کیا۔

''کیا میرا اشتہار ہو گیا ہے'' نائلہ نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ابھی نہیں ہوا بس ہو جائے گا'' جاوید نے کہا۔

''پھر آپ مجھے کیوں بلا رہے ہیں۔ کیا آپ کا دفتر کھلا ہے؟'' نائلہ نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں دفتر بند ہے میں اپنے گھر سے بات کر رہا ہوں''۔ اس نے جواب دیا۔

''آپ مجھے اپنے گھر پر بلا رہے ہیں، کوئی خاص بات ہے'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''خاص بات ہی ہے'' جاوید نے جواباً کہا۔

''گھر پر آپ کی بیوی بچے تو ہوں گے، چلو ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی''۔ نائلہ نے معصومیت سے کہا۔

''بیوی بچے گھر پر موجود نہیں ہیں، وہ گئے ہوئے ہیں''۔ جاوید نے بوکھلاتے ہوئے کہا۔

''بیوی بچے گھر پر موجود نہیں ہیں اور آپ مجھے بلوا رہے ہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہے۔ میں ایسے اشتہار پر لعنت بھیجتی ہوں۔ خبردار جو آپ نے مجھے آئندہ فون کیا''۔ نائلہ نے غصے میں فون کو پٹخ دیا۔

''کیا ہوا۔ خیریت تو ہے؟''۔ کنول نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو کتنا ذلیل ہے، مجھے اشتہار کا لالچ دے کر گھر پر بلوا رہا تھا۔ میرے سامنے ہوتا تو اس کا منہ نوچ لیتی''۔

نائلہ نے غصے سے کانپتے ہوئے جواب دیا۔کنول نے اسے چپ کروا کر پانی پلایا۔

''یہ کونسی ایجنسی کا میڈیا منیجر ہے جو اتنا بدتمیز ہے''۔کنول نے پوچھا

''نیرنگ ایجنسی کا حالانکہ میں کافی ایجنسیوں میں جاتی رہتی ہوں وہاں کے میڈیا والے بہت احترام سے ملتے ہیں، یہ واحد آدمی ہے جو اتنا گرا ہوا ہے''۔نائلہ نے غصیلے انداز میں کہا۔

''ہاں بھئی۔اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، دنیا اسی کا نام ہے''۔کنول نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔

''یار! اس کی دیدہ دلیری تو دیکھو، اخبار کے دفتر میں فون کر کے مجھ سے کہہ رہا ہے میں ایڈیٹر صاحب سے شکایت کرونگی تاکہ آئندہ وہ کسی اور سے ایسی غلط بات کہنے کی ہمت نہ کرے''۔نائلہ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ایڈیٹر کے چیمبر کی طرف روانہ ہوئی۔

عید قریب تھی، اب کی مرتبہ نائلہ کا کمیشن کافی بن گیا تھا۔اس نے تمام بچوں اور شوہر کے کپڑے خریدے، اس کے علاوہ کچھ گھر کے لئے برتن، استری اور واشنگ مشین بھی خرید لی۔تمام سامان صدر سے سوزوکی میں لوڈ کر کے گھر کی طرف روانہ ہوئی، گھر کی گلیاں پتلی ہونے کے سبب ڈرائیور نے سامان باہر مین سڑک پر ہی رکھ دیا۔

نائلہ نے سامان کے پاس کمال کو کھڑا کیا اور خود اپنے گھر کی طرف روانہ ہوئی وہاں سے دونوں بیٹوں کو اپنے ساتھ لے آئی تاکہ سامان وہ گھر میں لے جا کر رکھ دیں۔وقاص سامان کو دیکھ کر خوش ہوا اور بچے بھی خوش ہوگئے۔

''باہر سڑک پر سامان کہاں چھوڑ کر آئی تھیں'' وقاص نے وضاحت طلب کی۔

''سامان کے پاس کمال کو کھڑا کیا تھا پھر وہ چلا گیا''۔نائلہ نے مختصراً کہا

''کیوں؟ اس کے ساتھ آنے کی کیا ضرورت تھی''۔وقاص کا موڈ بگڑ گیا۔

''اکیلے کیسے لاد کر لاتی، کوئی تو بھاؤ تاؤ کرنے والا ہوتا، سوزوکی میں کیا میں اکیلے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ کر آتی ''؟ نائلہ نے تیور بدل کر پوچھا۔

''کمال غیر مرد نہیں جس کے ساتھ تم پھرتی رہتی ہو یہاں سامان لاتے ہوئے تمہیں نخرے سوجھنے لگے''۔وقاص

نے طنز کیا۔ وہ زہر کے گھونٹ پی کر رہ گئی، اس کا موڈ یکدم خراب ہو گیا، وہ دل ہی دل میں وقاص کو کوسنے دینے لگی۔

''کنول! آج تمہارا چہرہ اترا ہوا ہے۔ طبیعت ٹھیک تو ہے نا'' نائلہ نے اس سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

کنول کئی دنوں سے پریشان تھی۔ وہ شوگر اور بلڈ پریشر کی مریضہ تھی۔ پانچ چھ سال قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا، اس کے دو بچے تھے، بڑی بیٹی وجیہہ اور بیٹا اقبال تھا، دونوں بچے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ان دونوں کا خرچہ کنول اپنی ملازمت سے پورا کر رہی تھی۔ دفتر کے لوگ بھی اس کا خاص خیال کرتے تھے کنول کے سسرال والے بھی کسی حد تک اس کی مالی مدد کیا کرتے تھے۔

''نائلہ! کئی دنوں سے میرے پیٹ میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی فیملی ڈاکٹر کو دکھایا تھا، اس نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیئے تھے میں نے آغا خان سے بلڈ ٹیسٹ اور الٹرا ساؤنڈ کروایا تھا۔ کل اس کی رپورٹ آئی ہے۔ اس رپورٹ سے مجھے تشویش ہو رہی ہے''۔ کنول نے پریشانی کے عالم میں کہا

''رپورٹ میں کیا لکھا ہے''۔ نائلہ نے تجسس سے پوچھا۔

''پیٹ میں ٹیومر ہو گیا ہے، میرے فیملی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ فوراً اس کا آپریشن کروا لو ورنہ خطرہ ہے''۔ کنول نے افسردگی سے تفصیل بتائی

''فوراً آپریشن کروا لو دیر مت لگاؤ، اس میں سوچنے کی ضرورت نہیں جو ہم سے ہو سکا وہ ہم بھی کر دیں گے''۔ نائلہ نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''پیسوں کی پریشانی نہیں اتفاق سے اس مہینے میں، میرے کمیشن کے بیس ہزار روپے بنے تھے، وہ اکاؤنٹنٹ نے مجھے پرسوں دے دیئے ہیں کچھ پچھلے بقایا جات ادارے کی طرف ہیں، وہ مجھے یا میرے بیٹے کو بعد میں دینے کا وعدہ کیا ہے''۔ کنول نے وضاحت کی۔

''آپریشن کب کروانے کا ارادہ ہے''۔ نائلہ نے پوچھا

''آج ہفتہ کا دن ہے۔ میں اپنا تمام کام مکمل کرانے کے لیے آئی ہوں اتوار کو اسپتال میں داخل ہو جاؤں گی، شوگر کنٹرول ہونے کے بعد پیر یا منگل کو آپریشن ہو گا۔ تم دعا کرنا''۔ کنول نے دھیرے سے کہا۔ اس کے

چہرے سے اس کی اندرونی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو دفتر آنے کی کیا ضرورت تھی، فون کر لیا ہوتا'' نائلہ نے پیار سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''دفتر آنا ضروری تھا بغیر بتائے اتنا بڑا آپریشن کیسے کراتی، میں انفارمیشن والوں کو بھی بتانا چاہتی ہوں تا کہ میرے علاج کے دوران وہ لوگ میرے اشتہارات دفتر بھجوا دیا کریں''۔ کنول نے وضاحت کی

''چلو آؤ میں تمہیں انفارمیشن تک رکشے کے ذریعے چھوڑ دوں، مجھے بھی اس طرف ایک ضروری کام سے جانا ہے'' نائلہ نے اسے زبردستی اٹھاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ دونوں رکشے کے ذریعے انفارمیشن پہنچیں۔ نائلہ نے کنول کو انفارمیشن کے گیٹ پر اتارا اور اسے خدا حافظ کہتے ہوئے وہ اسی رکشے کے ذریعے صدر الیکٹرونک مارکیٹ کی طرف روانہ ہوئی۔

اتوار کا دن تھا نائلہ نے پورے ہفتے کے کپڑے واشنگ مشین کے ذریعے دھوئے اس طرح دوپہر کے تین بج گئے، اس کی بیٹی صائمہ نے کھانا پکا لیا تھا، ان سب نے مل کر کھانا کھایا۔ نائلہ کافی تھک گئی تھی لہٰذا کھانا کھاتے ہی وہ سو گئی۔ پیر کو وہ دیر سے دفتر پہنچی تو کمال اس کا انتظار کر کے کلائنٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ دفتر سے اپنے کئی کلائنٹ کو فون کرتی رہی، دوپہر تک کمال بھی دفتر پہنچ گیا پھر ان دونوں نے اکٹھے کھانا منگوا کر کھایا۔

''اسلم جاؤ چائے اور پان لے آؤ''۔ نائلہ نے پرس سے پیسے نکال کر پیون کو دیتے ہوئے کہا۔

''کمال پلیز! کنول کے گھر فون لگاؤ، میں اس کی بیٹی سے بات کرنا چاہ رہی ہوں''۔ نائلہ نے اس سے کہا۔

کمال نے آپریٹر سے کنول کے گھر کا نمبر ملانے کیلئے کہا، تھوڑی دیر بعد آپریٹر کرن نے بتایا کہ کنول کے گھر بیل بج رہی ہے مگر فون کوئی اٹینڈ نہیں کر رہا ہے۔

''گھر میں کوئی بھی نہیں ہے''۔ کمال نے حیرت سے کہا

''ظاہر ہے ماں اسپتال میں ہو گی تو دونوں بچے بھی وہیں گئے ہوں گے'' نائلہ نے وضاحت کی

''اسپتال چلیں کیا''؟ کمال نے تجویز پیش کی

''ہاں چلیں مگر پہلے چائے پی لیتے ہیں، اسپتال بھی ایم اے جناح روڈ پر ہے، وہاں سے اس کی خیریت معلوم

کر کے واپسی پر مجھے گھر کے قریب ڈراپ کر دینا''۔ نائلہ نے اپنا پروگرام اسے بتا دیا۔ چائے سے فارغ ہونے کے بعد کمال اور نائلہ اسکوٹر پر سوار ہو کر اسپتال پہنچے۔ ریسپشن سے کنول کا کمرہ معلوم کیا وہاں پہنچے تو کنول کے دونوں بچوں سے ملاقات ہوگئی۔

''کل شام امی کا آپریشن ہوا تھا، آپریشن کے دو گھنٹے بعد انہیں ہوش آ گیا تھا، انہوں نے مجھ سے اور اقبال سے کافی دیر تک باتیں کیں پھر دفتر سے بقایا پیسے لانے کے لیے بھی کہا، خالہ آئیں تھیں، ان سے بھی باتیں کرتی رہیں پھر اچانک ان کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تو ڈاکٹروں نے انہیں آئی سی یو میں منتقل کر دیا ہے، اب وہ وہیں ہیں''۔ کنول کی بڑی بیٹی وجیہہ نے پوری تفصیل بتائی۔ وہ بہت پریشان نظر آ رہی تھی۔ نائلہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور تسلی دی، کمال بھی دونوں بھائی بہن کو تسلی دینے لگا، نائلہ نے وجیہہ سے کہا کہ وہ آئی سی یو میں کنول کو دیکھنا چاہتی ہے، وجیہہ نائلہ کو ساتھ لیے آئی سی یو تک گئی۔ نائلہ نے سینڈل ایک طرف اسٹینڈ پر رکھے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئی، کنول کا بیڈ سامنے ہی نظر آیا، وہ بے جان سی بستر پر پڑی تھی اسے آکسیجن کے ساتھ ساتھ ڈرپ بھی دی جا رہی تھی اس کے علاوہ اس کے ناک اور منہ پر مزید نلکیاں بھی لگی ہوئی تھیں۔ یہ منظر دیکھ کر نائلہ تشویش میں مبتلا ہوگئی وہ تھوڑی دیر بعد باہر آ گئی۔

''کنول کیسی ہے''۔ کمال نے پوچھا۔

''کمال! مجھے کچھ گڑبڑ نظر آ رہی ہے، تم ذرا معلوم تو کرو، مجھے نہیں لگتا کہ وہ زندہ ہے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اسے زبردستی زندہ رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے''۔ نائلہ نے سرگوشی کے انداز میں کہا تاکہ اس کے بچے نہ سن لیں۔ کمال فوراً کاؤنٹر کی طرف گیا اور وہاں سے کافی معلومات اکٹھی کیں کیونکہ وہ صحافی تھا، صحافی بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔

نائلہ! بات سننا'' کمال نے اسے ایک طرف لے جاتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے نا'' اس نے پریشانی سے پوچھا

''خیریت ہی نہیں ہے'' اس نے زیرلب کہا۔

''اللہ خیر کرے کیا ہوا؟'' نائلہ نے کریدا۔

''تم نے مجھ سے کہا تھا کہ کنول کو شوگر ہے اور ڈاکٹر شوگر کنٹرول کرنے کے بعد اس کا آپریشن کریں گے''۔ کمال نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں! کنول نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اتوار کو اسپتال میں داخل ہو جائے گی، پیر یا منگل کو شوگر کنٹرول ہونے کے بعد ہی اس کا آپریشن ہوگا''۔ نائلہ نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس کا شوگر کنٹرول کیئے بغیر ڈاکٹروں نے اس کا آپریشن کیا جس کی وجہ سے اس کا شوگر لیول آپریشن کے بعد ایک ہزار کے قریب ہو گیا تھا، اسی وجہ سے وہ کومہ میں چلی گئی ہے، اس کے گردوں نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ بچے گی۔ دفتر واپس چلو ایڈیٹر اور دیگر لوگوں کو اطلاع کرتے ہیں، یہ زیادہ ضروری ہے'' کمال نے تشویش سے کہا پھر کنول کے بچوں کو تسلی دیتے ہوئے وہ دونوں لفٹ سے اتر آئے اور دفتر کی طرف چل روانا ہوئے۔

کمال نے دفتر پہنچ کر ایڈیٹر اور منیجر ذیشان کو تمام تفصیل بتائی۔ دفتر کے دیگر لوگ بھی باری باری اسے دیکھ آئے، انہوں نے اسپتال کی انتظامیہ سے احتجاج کیا اور خوب شور مچایا، جس ڈاکٹر نے آپریشن کیا تھا، وہ بہت خوفزدہ تھی، اس نے معافی مانگی اور کئی جواز پیش کیئے جس میں کوئی وزن نہیں تھا بہرحال بدھ کی صبح دس بجے کے قریب کنول انتقال کرگئی، اس کے بچوں کے لئے یہ ایک قیامت تھی جس کا مداوا ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کی لاپرواہی ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑ گئی، یہ ایسا قتل تھا جو ناقابل معافی تھا، بات کافی آگے بڑھ گئی مگر لواحقین بات بڑھانا نہیں چاہتے تھے اور یہ سانحہ خاموشی سے داخل دفتر ہو گیا۔

نائلہ کمال اور اس کے دفتر کے لوگ بہت رنجیدہ تھے، اس کے علاوہ انفارمیشن کا عملہ بھی اس کی ناگہانی موت پر کافی افسردہ رہا، وہ ایک اچھی ملنسار اور خوش مزاج، خاموش طبع خاتون تھی۔ نائلہ کئی روز تک سوگ کی کیفیت میں مبتلا رہی، اس واقعہ کے بعد اس کا دل کہیں بھی نہیں لگتا تھا، رہ رہ کر اسے اپنا اور بچوں کا خیال آتا تو وہ کانپ جاتی۔ دو دن وہ دفتر بھی نہیں آئی، اس سانحے نے اس کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا تھا۔ کمال نے اسے بہلانے کے لئے پکنک کا پروگرام ترتیب دیا۔ کمال کا پورا خاندان اور نائلہ کے تمام بچے سوائے اس کے شوہر کے اکٹھے سینڈز پٹ گئے وہاں انہوں نے تمام دن گزارا پھر واپس لوٹے۔ اس سے نائلہ کی طبیعت بہل گئی اور

وہ نارمل ہونے لگی۔ ایک دن نائلہ دفتر پہنچی تو اس کے چہرے پر ورم تھا، ہاتھوں پر نیل پڑے ہوئے تھے۔

''نائلہ کیا ہوا، تمہاری شکل بگڑی ہوئی کیوں ہے؟'' ذیشان نے پوچھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی پھر بتایا کہ اس کے شوہر نے اسے رات کو خوب مارا پیٹا اور صبح گھر سے نکال دیا اور کہا کہ اب گھر مت آنا۔

''آؤ! میرے ساتھ''۔ ذیشان اسے زبردستی کھینچ کر نیچے لے آیا اور کار اسٹارٹ کر کے اسے ویمن پولیس اسٹیشن لے گیا وہاں پہنچ کر اس نے تھانہ انچارج کو نائلہ کے تمام حالات بتائے اور اسے نائلہ کے شوہر وقاص کے خلاف کاروائی کرنے کو کہا۔ ویمن پولیس کے اہلکار وقاص کو تھانے میں لے آئے۔

''تم نے اپنی بیوی کو کیوں مارا'' انچارج نے اونچی آواز سے پوچھا۔

''یہ غیر لوگوں کے ساتھ پھرتی ہے'' وقاص نے فوراً جواب دیا۔

''تم کیا کرتے ہو؟'' انچارج خاتون نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں، کام ملتا ہی نہیں ہے'' اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''تمہاری تعلیم کتنی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''انٹر تک'' وقاص نے کہا۔

''تمہاری بیوی کی تعلیم کیا ہے؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''ساتویں جماعت تک پڑھی ہوئی ہے'' اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

''انٹر پاس کو نوکری نہیں ملتی اور ساتویں جماعت پاس گھر چلا رہی ہے۔ تمہارے بچے پال رہی ہے پھر مار بھی کھا رہی ہے، دوسرے مردوں کے ساتھ بھی پھرتی ہے مگر تمہاری غیرت مر چکی ہے، اتنے الزام لگانے سے پہلے خود کماتے، اس کی کمائی پر عیش بھی کر رہے ہو اور بہتان بھی لگا رہے ہو۔ یہ خاتون ایک اخبار کے دفتر میں کام کر رہی ہے۔ منیجر اور دیگر لوگ اس کی محنت کی تعریف کر رہے ہیں اور تم الٹی بات کر رہے ہو، چار دن حوالات میں رہو گے تو مزاج درست ہو جائیں گے سمجھے۔ تم'' انچارج نے آپے سے باہر ہوتے ہوئے کہا۔

''ذیشان صاحب! آپ کیا چاہتے ہیں''۔ ''انچارج نے اس سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''میں چاہتا ہوں دونوں میاں بیوی آپس میں خوش رہیں اور یہ مار کٹائی کا سلسلہ نا ہو، نائلہ کے گھریلو حالات

اس کے بزنس پر اثر انداز ہونے کی وجہ سے ادارے کا نقصان ہو رہا ہے۔ ان کے بیہودہ رویے کی وجہ سے بچے بھی پریشان رہنے لگے ہیں''۔ ذیشان نے صورت حال واضح کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر وقاص سن رہے ہیں، ذیشان صاحب کیا کہہ رہے ہیں''۔ انچارج نے بلند آواز سے کہا۔

''جی سن رہا ہوں'' اس نے مریل انداز میں جواب دیا۔

''اس مسئلے کا کوئی حل ہے آپ کے پاس تو بتائیے۔ اصولی طور پر آپ کو گھر کی ذمہ داری اٹھانی چاہئے اگر نائلہ یہ ذمہ داری پوری کر رہی ہے تو یہ اس کا آپ پر احسان ہے، حق نہیں''۔ انچارج نے سوال پوچھ کر جواب بھی خود ہی نے دے دیا۔

''آئندہ خیال رکھوں گا اور شکایت کا موقع نہیں دونگا''۔ وقاص نے ہارنے کے انداز میں کہا۔

''پکا وعدہ کر رہے ہیں'' انچارج نے مزید پوچھا۔

''جی ہاں پکا وعدہ کر رہا ہوں'' وقاص نے پوری سنجیدگی سے جواب دیا۔

''نائلہ! تمہارے شوہر وعدہ کر رہے ہیں کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہیں کریں گے اگر انہوں نے آئندہ مار پیٹ کی تو سیدھا میرے پاس آ جانا باقی کا بندوبست میں کروں گی''۔ انچارج نے دھمکی آمیز لہجے میں وقاص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ذیشان نے انچارج کا شکریہ ادا کیا، وہیں پر چائے پی، واپسی پر نائلہ اور وقاص کو ان کے گھر پر ڈراپ کیا پھر خود دفتر پہنچ گیا۔

تقریباً پانچ چھ ماہ سکون سے گزر گئے۔ گھر میں کوئی بدمزگی پیدا نہیں ہوئی، بچے بھی پرسکون رہے۔ نائلہ نے گھر کے لئے ایک الماری خرید لی اس کے علاوہ دوسرا مکان کرائے پر لیا۔ اس میں دو بیڈ اور ایک صحن تھا، باورچی خانہ الگ اور صاف ستھرا بنا ہوا تھا۔ یہ مکان اندر تنگ گلیوں سے ہٹ کر مین روڈ سے قریب تھا۔ بچے بھی خوش ہو گئے۔ بڑی بیٹی نے میٹرک کر لیا تھا، چھوٹی نویں جماعت میں پڑھ رہی تھی، ارسلان کو ایک دفتر میں پیون کی نوکری ملی تھی جس سے ساڑھے تین ہزار مل رہے تھے۔ کامران کو پرنٹنگ پریس میں تین ہزار مل رہے تھے۔ وقاص صرف گھر کی چوکیداری کے نام پر بیٹھا عیش کرتا رہا جس سے اس کا وزن کافی بڑھ گیا تھا مگر کام کرنے کی زحمت اس نے گوارا نہیں کی۔

نائلہ نے پچیس ہزار روپے دفتر میں ذیشان کے پاس جمع کر رکھے تھے کہ آڑے وقتوں میں کام آئیں گے، یہ بات ایڈیٹر کو بھی معلوم تھی، دفتر کے تمام لوگ حتی الامکان اس کی مدد کیا کرتے تھے۔

''امی آج آپ پانچ بجے ہی گھر آ گئیں'' بڑی بیٹی صائمہ نے اس سے پوچھا۔

''ارے نہیں بیٹا! آج میرٹ ہوٹل میں بزنس والوں کا ایک بہت بڑا پروگرام ہے۔ کھانا بھی وہیں کھانا ہے۔ سر ذیشان بھی وہاں آئیں گے، میں اور کمال بھی وہاں جائیں گے واپسی پر دونوں میں سے کوئی بھی مجھے گھر پر چھوڑ دے گا''۔ نائلہ نے تفصیل بتائی۔ یہ بات وقاص نے بھی سنی اور کمال کے نام پر منہ بنالیا، وہ دل ہی دل میں سے برا بھلا کہنے لگا۔

''پرسوں جو سوٹ درزی سے لے کر آئی تھی نا، اس پر استری کر دو جب تک میں پان کھالوں اس کے بعد تیار ہو جاؤں گی''۔ نائلہ نے بیٹی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

استری کرنے کے بعد صائمہ نے کپڑے بستر پر پھیلا دیئے اور خود شام کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔

''صائمہ بات سنو'' نائلہ نے اسے قریب بلایا۔

''تم نے بھائی سے سودا منگوالیا تھا۔ کتنے کا آیا''۔

''پندرہ سو کا آیا تھا، اس میں سے صرف تین روپے پڑے ہیں''۔ صائمہ نے بتایا۔

''یہ لو پانچ ہزار روپے الماری میں چھپا کر رکھ دو۔ پورا مہینہ ان ہی پیسوں میں گزرنا چاہیئے''۔ نائلہ نے بیٹی کو تاکید کی۔

''ٹھیک ہے امی'' صائمہ نے جواب دیا اور پیسے الماری میں اخبار کے نیچے چھپا کہ رکھ دیئے تا کہ وقاص کی نظر نہ پڑ سکے۔

نائلہ نے نیلے رنگ کا ڈبل جارجٹ کا سوٹ پہنا اور ہلکا سا میک اپ کیا۔ اس کے علاوہ اس سے میچ کر کے جیولری پہن لی اسی تیاری میں شام کے ساڑھے چھ بج گئے۔ وہ باہر سڑک پر پہنچی وہاں سے رکشے کے ذریعے شام سات بجے تک دفتر آ گئی۔ دفتر میں کمال تیار ہو کر اس کا انتظار کر رہا تھا، پندرہ منٹ تک وہ دونوں دفتر میں اپنے کلائنٹ سے باتیں کرتے رہے، ذیشان کو دیر سے جانا تھا لہٰذا وہ دونوں ساڑھے سات بجے دفتر سے

میرٹ ہوٹل کے لئے روانہ ہوئے۔

''تمہارے تیار ہو کر گھر سے نکلنے پر وقاص نے کوئی تبصرہ کیا یا نہیں'' کمال نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں میں نے ان سے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی، صرف صائمہ سے کہہ کر نکل آئی''۔ نائلہ نے وضاحت کی۔

''ایسا نہ ہو کہ جب تم واپس گھر پہنچو تو پھر وہ کوئی بکھیڑا کھڑا کر دے''۔ کمال نے تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اللہ مالک ہے دیکھا جائے گا''۔ نائلہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، وہ دونوں مسلسل اسکوٹر پر باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔

''ارے ہاں بھابھیز والی ملی تھی، تمہارا پوچھ رہی تھی'' کمال نے بیوٹی پارلر والی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

''ہاں کافی دنوں سے وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوا، سوچ رہی ہوں کل ہم دونوں وہاں چلیں گے، میں اپنے بال کئی دنوں سے سیٹ کرانا چاہ رہی تھی مگر وقت نہیں مل رہا تھا''۔ اس نے خوشگوار موڈ میں کہا۔

بائیک پچاس کی اسپیڈ سے جا رہی تھی۔ اب وہ دونوں شاہین کمپلیکس کے قریب تھے۔

''یہ سوٹ تم پر اچھا لگ رہا ہے'' کمال نے تعریف کی۔

''شاید اس لئے کہ یہ سوٹ تم نے خرید کر دیا ہے''۔ نائلہ نے مذاقاً کہا۔

دفعتاً ایک سوزوکی تیزی سے دائیں طرف سے آئی اور پوری قوت سے اسکوٹر سے ٹکرا گئی۔ نائلہ اچھل کر شاہین کمپلیکس کے فٹ پر گری، اس کا سر فٹ پاتھ سے ٹکرا گیا اور وہ بیہوش ہوگئی ہاں البتہ کمال کو خراش تک نہیں آئی۔ وہ اور اسکوٹر دونوں محفوظ رہے۔ آس پاس لوگ جمع ہو گئے، ایمبولینس کے ذریعے نائلہ کو سول اسپتال لایا گیا جہاں وہ آئی سی یو میں منتقل کر دی گئی، دفتر کے زیادہ تر لوگ اسپتال پہنچ گئے۔ ذیشان نے خود جا کر نائلہ کے شوہر اور بچوں کو حادثے کی اطلاع دی۔

''میں نائلہ سے کہتا تھا کہ وہ کمال کے ساتھ اسکوٹر پر نہ جایا کرے مگر وہ میری بات سنتی کب ہے''۔ وقاص نے

غصے کے عالم میں کہا۔

''جو بات ہونی تھی وہ ہو چکی، اب اس کی صحت کے لئے دعا کریں''۔ ذیشان نے سنجیدگی سے کہا۔

''انکل! امی کو زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں'' صائمہ نے ذیشان کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جسم پر تو زیادہ چوٹیں نہیں ہیں البتہ سر کی چوٹ گہری ہے۔ ڈاکٹر آپریشن کا کہہ رہے تھے''۔ ذیشان نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ صائمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ چھوٹی بیٹی فائزہ بھی آبدیدہ ہو گئی۔ بڑا بیٹا ارسلان اور کامران بھی پریشان تھے بہر حال وہ ان دونوں کی سگی خالہ تھی اور ان سب کو یکساں پیار کرتی تھی کافی عرصے تک نائلہ نے ان کو سپورٹ کیا تھا۔

''باجی! آج امی بہت خوش تھیں، نیلے سوٹ میں اچھی لگ ہی تھیں پتا نہیں کس کی نظر کھا گئی''۔ فائزہ نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا۔

''ایک ہی کی نظر کھا گئی وہ اور کون ہو سکتا ہے'' وقاص نے جلے کٹے انداز میں جواب دیا۔

''مسٹر وقاص! پلیز اب تو نائلہ کا پیچھا چھوڑ دیں، اس کے لئے دعا کریں الزام تراشی سے گریز کریں۔ یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے''۔ ذیشان نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

اسپتال پہنچ کر سب نے باری باری آئی سی یو میں نائلہ کو دیکھا وہ کومہ میں تھی۔ کافی خون بھی بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹرز فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ آیا آپریشن کیا جائے یا نہیں۔

''ڈاکٹر صاحب! کچھ امید ہے'' ذیشان نے اس سے پوچھا۔

''آئی کانٹ سے اینی تھنگ اباوٹ ہر'' (فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا) اس نے جواب دیا اور کمرے سے نکل گیا۔ وقاص اور بچے اسے دور تک جاتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ارسلان اسپتال میں ہی رکا رہا جبکہ وقاص بچوں سمیت واپس گھر آ گیا۔ ذہنی طور پر وہ واقعی پریشان ہو گیا کہ اب گھر کی ذمہ داریاں کیسے پوری ہوں گی اور کون کرے گا پتا نہیں نائلہ بچے گی یا نہیں اگر نہیں تو پھر کیا ہوگا یہی خیال اسے رات بھر ستاتا رہا جبکہ بچے اپنی ماں کے لئے دعائیں مانگتے رہے۔ کمال نے منتیں مانگ لیں۔ ذیشان اور اس کی بیوی زیبا اس کی درازی عمر کے لئے نماز پڑھ کر اللہ کے حضور گڑگڑانے لگے۔ رات خدا خدا کر کے گزر گئی۔ صبح وقاص بچوں سمیت اسپتال پہنچ

گیا مگر کمال ان سے پہلے ہی اسپتال میں موجود تھا۔ کمال کو دیکھتے ہی وقاص نے نفرت سے منہ موڑ لیا۔

کمال نے ہسپتال میں دو گھنٹے گزارے پھر دفتر آ گیا۔ دفتر میں ذیشان بھی موجود تھا۔

''کمال! مجھے معلوم ہے وہ تمہاری بہت اچھی دوست ہے، گھبرانے کی ضرورت نہیں، اللہ بڑا کارساز ہے جو بہتر ہے وہی کرے گا''۔ ذیشان نے اسے تسلی دی۔

اس تسلی سے کمال کیسے بہلتا۔ نائلہ کی صورتحال روز روشن کی طرح عیاں تھی۔ اس کے بچنے کے چانسز بالکل نہیں تھے۔ اس کے سر کی چوٹ بہت خطرناک تھی، یہ چوٹ اندرونی طور پر زیادہ تھی۔ اس کا دل بے قابو ہو رہا تھا۔ ایک عجیب سا دھڑکا تھا، وہ کسی بھی خبر کے لئے خود کو تیار نہیں کر پا رہا تھا پھر اسے یہ بھی کھٹکتی تھی کہ وہ اس کے اسکوٹر پر حادثے کا شکار ہوئی تھی۔ وقاص اور اس کے بچے اس سے پہلے ہی بدظن تھے۔ اب مزید ہو چکے تھے۔

سر! اس ادارے کی یہ دوسری خاتون ہے جو موت و زیست میں مبتلا ہے، اس سے پہلے کنول اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی''۔ کمال نے ذیشان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''یار! تم غلط کیوں سوچ رہے ہو۔ اچھی بات نہیں سوچ سکتے''۔ ذیشان نے اسے ڈانٹ دیا۔

نائلہ کے حادثے کی خبر اخبار میں چھپی تو ٹیلی فون کا تانتا بندھ گیا، اس کے اور نائلہ کے تمام کلائنٹ نائلہ کی صحت یابی کے لئے دعا گو تھے۔ کمال نے دو ماہ قبل موبائل فون خرید لیا تھا۔ اس کے موبائل پر اس کے اور نائلہ کے کلائنٹ پل پل کی خبر معلوم کرتے رہے۔ وہ جواب دے دے کر پریشان ہو گیا بلآخر اس نے موبائل آف کر دیا۔ شام ہوتے ہی وہ خاموشی سے اُٹھ کر اسپتال کی طرف روانہ ہوا وہاں ارسلان اور کامران دونوں موجود تھے، انہوں نے کمال کو دیکھا تو اس کے قریب آئے۔

''انکل! ڈاکٹر ہمیں کچھ بتاتے نہیں ہیں، آپ صحافی ہیں وہ آپ کو صحیح بات بتائیں گے۔'' ارسلان نے کمال سے التجا کرتے ہوئے کہا۔ وہ سیدھا آئی سی یو میں داخل ہوا وہاں ڈاکٹر مشتاق ایک دوسری مریضہ کا معائنہ کر رہا تھا۔

''ہیلو ڈاکٹر صاحب! آپ کیسے ہیں''؟ کمال نے خوش اسلوبی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں مگر آپ کی مریضہ کی حالت تشویشناک ہے''۔ ڈاکٹر مشتاق نے برجستہ کہا۔ کمال کو یوں لگا جیسے کسی

نے اس کے سینے میں خنجر اتار دیا ہے۔

''ڈاکٹر صاحب! کوئی تو صورت ہوگی کہ وہ بچ جائے'' کمال نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی بھی صورت نہیں کیونکہ اس کا برین ہیمرج ہوگیا ہے، معجزے ہوتے ہیں مگر اس قسم کے بہت کم ہوتے ہیں''۔ ڈاکٹر نے اس کی رہی سہی امید بھی ختم کر دی، وہ اداس سا باہر آ گیا، اس کی سنجیدگی اور اداسی دیکھ کر ارسلان بھی ناامید ہوگیا۔ کمال، ارسلان اور کامران کے ساتھ باہر بیٹھا ان کو تسلیاں دیتا رہا اور مختلف اونچ نیچ سمجھاتا رہا۔ آدھے گھنٹے بعد وقاص دونوں بچیوں سمیت اسپتال پہنچا۔ کمال کو دیکھ کر اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ ارسلان اور کامران کا کمال سے باتیں کرنا اسے بالکل اچھا نہیں لگا۔ وقاص کو دیکھتے ہی کمال وہاں سے واپس چلا آیا وہ اپنے دفتر آ کر بیٹھ گیا اور مسلسل سگریٹ کے کش پہ کش لگاتا رہا۔

رات بارہ بجے وہ پھر اسپتال پہنچا وہاں صرف ارسلان موجود تھا، وہ بھی باہر بیٹھا اونگھ رہا تھا، کمال دوبارہ آئی۔ سی۔ یو۔ پہنچا، وہ تھوڑی دیر تک نائلہ کے سرہانے کھڑا رہا۔

اچانک نائلہ کے ناک سے خون بہہ کر اس کے تکیے میں جذب ہونے لگا۔ اس نے اٹینڈنٹ کو آواز دی، وہ دوڑا چلا آیا پھر ڈاکٹر کو طلب کیا گیا، ڈاکٹر جب پہنچا تو نائلہ ہمیشہ کی نیند سو چکی تھی۔ وہ تمام تر ذمہ داریوں سے آزاد ہوگئی اب اسے مکان کے کرائے کی اور بچوں کی فیسوں کی فکر نہیں رہی تھی ہر طرح کی تکالیف برداشت کرتے کرتے وہ تھک کر میٹھی نیند سوگئی، نہ فکر فردا نہ فکر امروز۔ یہ قدرت کی طرف سے وقاص کو سزا ملی تھی کہ باقی ماندہ زندگی وہ خود اپنی ذمہ داریوں کو نبھائے جو عیش اسے نائلہ نے کرائے تھے، وہ اسے یاد کر کے زندگی بھر روتا رہے۔

ضمیر کا قیدی

''فیصل! اٹھ جاؤ کیا آج دفتر نہیں جانا ہے؟'' فریدہ بیگم نے بیٹے کو جگاتے ہوئے کہا۔

''ہوں، اٹھ رہا ہوں۔ تھوڑی دیر تو سو لینے دو'' اس نے نیم غنودگی کے عالم میں جواب دیا۔

فیصل کے ابو یوسف کا دو سال قبل ایکسیڈنٹ میں انتقال ہوا تھا۔ وہ انکم ٹیکس میں کلرک تھے ان کی تنخواہ چھ ہزار روپے تھی۔ ان کے انتقال کے بعد فیصل نے بی۔ کام۔ کرلیا تھا۔ یوسف کی حادثاتی موت کے بعد ان کے دفتر والوں نے فیصل کو اپنے ہاں ملازمت دے دی تھی اس طرح ان کا خاندان ایک بڑی خواری سے بچ گیا۔ باپ کی موت کے بعد فیصل اور اس کی امی فریدہ بیگم تنہا رہ گئے تھے۔ کورنگی کے ایک علاقے میں ان کا مکان اسی گز کا ایک کوارٹر تھا جس میں دو کمرے، کھلا صحن اور باورچی خانہ تھا۔ اس کے علاوہ اوپر چھت تھی جس پر فالتو سامان پڑا رہتا تھا۔

فیصل کو اپنا معیار زندگی بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ ہر وقت بڑے اونچے اونچے خواب دیکھا کرتا تھا کہ اس کا بڑا سا بنگلہ ہو خوبصورت کار ہو۔ بہترین ساز و سامان سے آراستہ اس کا اپنا ذاتی دفتر ہو جس میں وہ ٹھاٹ سے بیٹھا کرے۔ اپنی چھ ہزار کی تنخواہ کو وہ کسی گنتی میں شمار نہ کرتا یہی وجہ تھی کہ وہ چڑ چڑا سا ہو گیا تھا۔ آج کل اس کے سر پر باہر جانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا جبکہ اس کی امی فریدہ بیگم اس کی شادی کرنے کے چکر میں تھی فیصل نے سختی سے شادی کی مخالفت کی تھی۔ وہ سب سے پہلے مالی معاملات سدھارنا چاہتا تھا۔

امی کے مسلسل اصرار کرنے پر تنگ آ کر اس نے شادی کی حامی بھر لی۔ فریدہ بیگم نے اپنی ایک ملنے والی دوست وحیدہ کی بیٹی فیروزہ سے اس کی شادی کردی۔ فیصل نے یہ شادی تو کرلی مگر وہ خوش نہیں تھا۔ وہ ہر وقت باہر جانے کی باتیں کیا کرتا اس طرح پورا سال گزر گیا۔

''فیصل! آج دفتر کی چھٹی کرلو، فیروزہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اسے اسپتال لے جانا ہے''۔ فریدہ بیگم نے حکم صادر کیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد فیصل ٹیکسی لینے چلا گیا پھر وہ تینوں ٹیکسی کے ذریعے قریبی اسپتال پہنچے۔ لیڈی ڈاکٹر نے فیروزہ کو اسپتال میں ایڈمٹ کرلیا اس کے بعد کچھ ضروری دوائیاں اور دیگر سامان منگوانے کیلئے اسے

پرچہ لکھ کر دیا۔ وہ سامان لیکر اسپتال پہنچا دوپہر ہو چکی تھی۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھا بور ہوتا رہا۔

''فیصل! مبارک ہو تم بیٹے کے باپ بن چکے ہو''۔ اس کی امی نے لیبر روم سے باہر نکل کر بیٹے کو مبارکباد دی، وہ خوش ہوا کہ چلو بیٹی پیدا نہیں ہوئی ورنہ اس کی ذمہ داریاں مزید بڑھ جاتیں۔ دادی نے پوتے کا نام ارشد رکھا۔ اب گھر میں بچے سمیت کل چار افراد ہو گئے۔ مالی حالات بگڑنے لگے تو پھر فیصل نے باہر جانے کا راگ الاپنا شروع کیا بہت مجبور ہو کر فریدہ بیگم نے اپنے اور بہو کے زیورات بیچ دیئے اور اپنے ایک جاننے والے کے ذریعے فیصل کو دبئی بھجوا دیا وہ خوشی خوشی دبئی روانہ ہوا۔

اِتفاق سے اسے ایک گروپ آف کمپنیز میں اچھی ملازمت مل گئی، وہ وہاں بحیثیت انچارج کام کرنے لگا۔

'' فریدہ! دبئی سے فیصل کا ٹیلیفون آیا ہے''۔ اس کی پڑوسن شگفتہ خاتون نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ وہ دوڑی ہوئی ان کے گھر پہنچی۔

''ہیلو! اس نے جذباتی انداز میں کہا۔

''امی! کیسی ہیں؟ فیروزہ اور ارشد خیریت سے ہیں نا!'' اس نے سوال کیا۔

''ہاں! ہم سب خیریت سے ہیں، تمہیں دبئی گئے ہوئے پندرہ دن ہو گئے اور تم آج فون کر رہے ہو تمہیں اندازہ نہیں کہ ہم سب تمہاری وجہ سے کتنے پریشان تھے''۔ فریدہ بیگم نے شکایت کی۔

''امی! یہاں مصروفیت بہت زیادہ ہے میں بطور انچارج کام کر رہا ہوں لہٰذا میری چھٹی بھی دیر سے ہوتی ہے'' پندرہ دن سے وقت ہی نہیں مل سکا میں آپ کو فون کرتا''۔ اس نے صفائی پیش کی۔

''ہیلو! آپ کیسے ہیں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی!'' فیروزہ نے ساس کے ہاتھ سے فون لے کر پوچھا۔

''نہیں! مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوئی اور میں بالکل ٹھیک ہوں، تم ننھے ارشد کا خیال رکھنا میں پندرہ دن بعد تم لوگوں کو پیسے بھجوا دوں گا۔ فکر مت کرنا''۔ اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''کیا کہہ رہا تھا''۔ پڑوسن نے فریدہ بیگم سے پوچھا۔

''وہ بالکل ٹھیک ہے اور نوکری بھی اچھی ملی ہے''۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''اللہ کا شکر ہے مبارک ہو'' پڑوسن نے جواباً کہا۔

فیصل اپنی کمپنی میں دل لگا کر کام کرتا رہا کیونکہ وہ بچپن ہی سے محنتی تھا، اس کے کام کو دیکھتے ہوئے اس کے باس نے اسے ترقی دینا شروع کر دی، اس کے علاوہ اس کی تنخواہ میں بھی اضافہ کرتا رہا۔ یوں وقت گذرنے لگا۔

فیصل نے دبئی جانے کے ایک سال بعد اتنا روپیہ اپنی امی کو بھیجا کہ اس نے اپنے اور بہو فیروزہ کے وہ تمام زیورات جو اس نے فیصل کی خاطر بیچ دیئے تھے اس سے زیادہ بنوا لئے، گھر کی حالت بھی بہتر کر لی ان کا مکان جو کچا بنا ہوا تھا، اسے پکا بنوا کر رنگ و روغن کروا لیا۔ دوسرے سال کچھ روپے بھی پس انداز کر لئے تھے۔ تیسرے سال تک دو لاکھ روپے جمع ہوئے تو فریدہ بیگم نے بہو کے نام پر مرکزی بچت اسکیم میں فکس کرا دیئے جس سے انہیں مہینے کے دو ہزار ملنے لگے۔ چوتھے سال فریدہ بیگم نے فیصل کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، اس نے وعدہ کیا کہ وہ ایک دو ماہ بعد کراچی آئے گا پھر اس نے تیس ہزار روپے بھیجے، فیصل نے اپنا فون نمبر فریدہ بیگم کو کبھی نہیں دیا ہاں البتہ مہینے میں ایک بار روپے بھجوانے ہوتے تو فون کے ذریعے اطلاع کر دیتا۔

''امی! فیصل کو بلوائیں، انہیں دبئی گئے چار سال ہو چکے ہیں، میری شادی کے ایک سال بعد وہ گئے تھے اب تو ارشد بھی سیانا ہو گیا ہے، باپ کے متعلق پوچھتا رہتا ہے کہاں تک اسے بہلاوے دیتی رہوں''۔ فیروزہ نے اپنی ساس سے غمگین انداز میں کہا۔

''فکر نہ کرو بیٹی! اب کے سال وہ ضرور آئے گا مجھ سے وعدہ کیا ہے۔'' فریدہ بیگم نے بہو کو تسلی دی۔

رات بھر لائٹ نہیں تھی لہٰذا فریدہ اور فیروزہ گرمی کے باعث چھت پر سوتی رہیں پھر صبح سات بجے لائٹ آ گئی۔ ارشد کو ناشتہ دینے کے بعد فیروزہ اسے اسکول لے جانے کیلئے تیار کرنے لگی۔ ارشد کے۔ جی۔ میں پڑھ رہا تھا۔ اسکول گھر کے نزدیک ہی تھا۔ وہ ارشد کو اسکول چھوڑ آئی، اس کے گھر آنے کے بعد فریدہ بیگم مارکیٹ سے گوشت اور سبزی خرید کر واپس آ گئی، اس وقت صبح کے دس بجے تھے۔ دروازہ پر بیل ہوئی تو فیروزہ نے دروازہ کھولا۔ ٹی۔ سی۔ ایس۔ والے نے ایک پیکٹ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ اس نے پیکٹ الٹ پلٹ کر دیکھا پھر دروازہ بند کرنے کے بعد وہ پیکٹ لئے فریدہ بیگم کے پاس آئی۔

''یہ پیکٹ کہاں سے آیا اور اس میں کیا ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ دبئی سے آیا ہے'' فیروزہ نے مختصر سا جواب دیا اور پیکٹ کھولنے لگی۔ پیکٹ کے اندر پچاس ہزار کا چیک،

ایک ڈیتھ سر ٹیفکیٹ اور ایک خط بھی تھا جو کہ فیصل کے دفتر والوں کی طرف سے تھا۔ فیروزہ بھی گریجویٹ تھی، وہ خط اور اس کے متن کو پڑھ سکتی تھی، خط میں لکھا تھا کہ فیصل روڈ ایکسیڈنٹ میں ہلاک ہوا اور جسے وہیں دفنا دیا گیا کیونکہ دبئ میں اس کا کوئی عزیز رشتہ دار نہیں تھا اس کے علاوہ ان کے پاس کراچی میں مقیم ان کے گھر والوں کا فون نمبر بھی نہیں تھا اس لئے وقت پر اطلاع نہیں دی جا سکی۔

یہ خبر فریدہ بیگم اور فیروزہ کیلئے کسی قیامت سے کم نہیں تھی، فیصل کا بیٹا ارشد اس وقت چار سال کے لگ بھگ تھا۔ فریدہ بیگم جوان بہو اور پوتے کا سوچ کر صدمے سے دوچار تھیں، اس صدمہ کو برداشت کرنا ان دونوں کے لئے بہت مشکل تھا۔ اس اطلاع کے کئی دنوں تک وہ دنوں بے حال رہیں پھر اللہ صبر دے ہی دیتا ہے۔ فیروزہ کی عدت ختم ہوگئی اب وہ بہت چپ چپ رہنے لگی تھی۔

''فیروزہ!'' ''تم اگر میکے جانا چاہتی ہو تو چلی جاؤ، ارشد کو بھی لے جاؤ۔ میں کبھی کبھار آ کر اسے دیکھ جایا کروں گی'' فریدہ بیگم نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔

''میں آپ کو تنہا کیسے چھوڑ دوں؟ اب تو میرا مرنا جینا آپ ہی کے ساتھ ہے۔ ارشد بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا، میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔'' فیروزہ نے روتے ہوئے کہا۔ فریدہ بیگم نے اسے گلے لگا لیا پھر دونوں ہچکیوں سے رونے لگیں۔ اس طرح دل کا غبار نکل گیا۔ باہمی رضا مندی سے فریدہ بیگم اور فیروزہ نے ارشد کو اچھے انگریزی میڈیم اسکول میں داخل کرادیا تاکہ وہ بہتر تعلیم حاصل کر سکے۔ بچے کچے پیسوں میں گزارہ کرنے کے علاوہ فیروزہ نے ایک قریبی اسکول میں چار ہزار کی ملازمت شروع کر دی۔ قومی بچت کے فکس روپے بھی مل رہے تھے لہٰذا انہوں نے فیصل کی موت کا صدمہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ برداشت کر لیا تھا۔

فیصل کے باس شیخ امتیاز کی اکلوتی بیٹی امبرین بہت خوبصورت اور پڑھی لکھی تھی۔ فیصل کی محنت اور لگن کو دیکھ کر شیخ امتیاز نے اسے بے انتہا ترقی دے دی۔ چونکہ فیصل نوجوان تھا اور شادی شدہ نہیں لگتا تھا موقع دیکھ کر اس نے فیصل کو اپنی بیٹی سے شادی کی آفر دی۔

''میاں! تمہارے کام کرنے کا طریقہ کار مجھے پسند ہے، تم نے ہماری کمپنی کو بہت فائدے پہنچائے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اب مستقل طور پر ہماری کمپنی کے ساتھ شامل ہو جاؤ یعنی میری بیٹی امبرین سے شادی کر لو تاکہ

مجھے سکون مل سکے اور میں مطمئن ہو کر اپنے دیگر معاملات نمٹا تا رہوں۔'' شیخ امتیاز نے فیصل کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

جی! مجھے سوچنے کا موقع دیں'' فیصل نے ہڑبڑاتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا یہ بتاؤ، کراچی میں تمہارے گھر والوں میں کون کون موجود ہیں''؟ انہوں نے پوچھا

''کوئی بھی نہیں'' فیصل نے جھوٹ بولا۔

''چلو ٹھیک ہے تم سوچ کر بتاؤ'' شیخ امتیاز نے خوشی کا اظہار کیا۔

بہت سوچ و بچار کے بعد فیصل نے اس شادی کی حامی بھر لی مگر انہیں نہیں بتایا کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے کا باپ ہے کیونکہ وہ بچپن ہی سے ترقی کی بلندیوں کو چھونا چاہتا تھا۔ اس کی معراج فیروزہ نہیں بلکہ امبرین تھی۔ امبرین کے ذریعے وہ شیخ امتیاز کی تمام دولت کا اکلوتا مالک بن سکتا تھا، وہ یہ نادر موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے فوراً ہی امبرین سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد اس نے ایک جعلی ڈیتھ سرٹیفکیٹ پچاس ہزار کے چیک سمیت اپنی امی کو بھیجوا دیا تھا تاکہ وہ اسے مردہ سمجھ کر بھول جائے یہی ہوا اس کی امی نے صبر کر لیا تھا وہ پوتے کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں لگ گئی تھی۔

فیصل ہر سال پابندی سے اپنی امی کو پچاس ہزار روپے ضرور بھیجوایا کرتا تاکہ ماں، بیوی اور بیٹا مالی اعتبار سے پریشان نہ ہوں، یہ روپے وہ دفتر کے چیک کے ذریعے بھجواتا۔ فریدہ بیگم یہ سمجھتی رہی کہ فیصل کے دفتر والے اس کے خاندان کی مدد کر رہے ہیں جبکہ در پردہ حقیقت کچھ اور ہی تھی۔

دن گزرتے رہے ارشد نے میٹرک کر لیا۔ فریدہ بیگم بوڑھی ہو چکی تھی کچھ عرصے بعد فیروزہ نے ارشد کو انٹر کرالیا پھر اسے ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں داخلہ دلوایا چونکہ ارشد بھی اپنے باپ کی طرح ذہین اور محنتی تھا۔ اس نے پہلے بی سی ایس کیا اس کے بعد ایم بی اے بھی کر لیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اسے ایک اچھی کمپنی میں ملازمت مل گئی جہاں تنخواہ بھی بہت ٹھیک ٹھاک تھی۔ ایک ہی سال کے عرصے میں ارشد اپنی کمپنی میں ایک اہم عہدے پر فائز ہو گیا۔ دفتر کے تمام لوگ اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

''مسٹر ارشد! آج ہمارے باس کی صاحبزادی مس کرن دفتر پہنچ گئی ہیں، وہ پرسوں امریکہ سے آئی تھیں۔ سنا

ہے کہ اب وہ کراچی میں کمپنی کی نگرانی کریں گی۔'' اختر نے اسے اطلاع فراہم کرتے ہوئے کہا، اختر ارشد کا ماتحت تھا۔

''چلو اچھا ہوا، اب کام کرنے کا مزہ آئے گا کم از کم تمام لوگ وقت پر دفتر پہنچ جایا کریں گے، ایک خاتون کے آنے سے یہ فائدہ تو ہوا''۔ ارشد نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کیا پھر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔

''سر! میڈم آپ سے ملنا چاہتی ہیں'' پیون نے ارشد سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جاتا ہوں۔ تم ڈاک میری ٹیبل پر رکھ دو'' اس نے کہا۔

ارشد نے کرن کے کمرے کے قریب جا کر اپنے بالوں کو سنوارا پھر ٹائی درست کی اور دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور اندر داخل ہوا۔

''آیئے مسٹر ارشد! مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا کیونکہ دفتر کے تمام لوگ آپ کے فین ہیں''۔ کرن نے بے ساختگی سے کہا۔ ارشد ایک لمحے کے لئے بالکل ٹھٹھک سا گیا کیونکہ وہ بہت خوبصورت، کم عمر اور اسمارٹ لڑکی تھی اسے دیکھ کر ارشد کے دل میں ایک عجیب سا احساس پیدا ہوا، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکا۔

''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ دفتر کے تمام لوگ مجھے چاہتے ہیں اور پیار کرتے ہیں ورنہ آج کل کے دور میں اتنی چاہت کہاں ملتی ہے؟'' ارشد نے انکساری سے کہا۔

''کام کیسا چل رہا ہے کوئی پرابلم تو نہیں''۔ کرن نے بات آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''کام تو ٹھیک چل رہا ہے۔ فی الحال کوئی پرابلم بھی نہیں اگر تھوڑی بہت پرابلم ہوئی تو آپ ٹھیک کر دیجئے گا کیونکہ اب تو آپ آ ہی گئی ہیں''۔ ارشد نے بولڈ ہو کر کہا اس کے بعد وہ اجازت لے کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

اس کا ذہن کرن کے متعلق سوچنے لگا۔ اس سے ملنے کے بعد اسے ایسا لگا جیسے وہ اس کی اپنی ہے۔ کرن اسے اجنبی بالکل نہیں لگی۔

ارشد کے کمرے سے جانے کے بعد کرن گہری سوچ میں پڑ گئی۔ اس کی شکل وصورت، عادت واطوار کسی حد تک اس کے پاپا سے ملتی تھی خاص طور اس کی آواز بالکل اس کے پاپا کے مشابہہ تھی۔ آنکھیں بند کر کے ارشد کی آواز سنو تو بالکل پاپا کی طرح لگتی تھی۔ اس حد تک دونوں کی مماثلت نے کرن کو مخمصے میں ڈال دیا۔ لاشعوری طور پر

کرن کو ارشد سے کچھ انست سی ہو گئی۔

ارشد نے ملازمت اختیار کرنے کے بعد اپنا کورنگی والا مکان بیچ کر گلشن میں دو بیڈ کا ایک لگژری فلیٹ خرید لیا تھا۔ وہ اپنی دادی اور امی کے ساتھ وہیں رہ رہا تھا۔ ارشد صبح دفتر آیا تو حیران رہ گیا کیونکہ دفتر کے تمام لوگ وقت پر آئے تھے جبکہ وہ ہمیشہ پہلے پہنچ جایا کرتا تھا، وہ دل ہی دل میں مسکراتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا پھر کمپیوٹر آن کر کے ای میل چیک کرنے لگا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔

''کم ان'' اس نے مختصراً کہا۔ کرن آ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی، وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔

''آپ نے کیوں زحمت کی، مجھے بلوا لیا ہوتا'' اس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''آپ تشریف رکھیئے دراصل میں آپ کا کمرہ دیکھنا چاہتی تھی، اس لئے چلی آئی''۔ اس نے وضاحت کی۔

''ایک بات پوچھوں آپ مائنڈ تو نہیں کریں گے۔ یہ سوال بالکل ہی پرسنل ہے۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''پوچھیے، آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟'' ارشد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کے ابو کہاں ہیں اور آپ کی فیملی میں کتنے لوگ ہیں؟'' کرن نے تجسس سے پوچھا۔

''میرے ابو کا انتقال ہو چکا ہے، اس وقت میرے ساتھ میری دادی اور امی رہتی ہیں ہم کل تین افراد ہیں''۔ اس نے تفصیل بتائی۔ ارشد کے کہنے پر پتا نہیں کیوں کرن مطمئن نہیں ہوئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ وہاں سے چلی گئی۔ ارشد سوچتا رہا کہ آخر کرن کو اس سے اور اس کے خاندان سے کیا دلچسپی ہے۔ وہ کیوں اس کے حالات جاننا چاہتی ہے۔

دن گزرتے رہے ان تین ماہ کے دوران کرن دو دفعہ دبئی ہو کر آ چکی تھی، اس کے علاوہ وہ تین دن کے لئے اسلام آباد بھی گئی تھی۔ کرن اور ارشد اچھے دوست ہو گئے تھے مگر یہ دوستی عزت اور احترام کے دائرے میں تھی۔ کرن ارشد سے بالکل ایک بہن کے انداز میں ملتی جبکہ ارشد بھی اس کے لئے غلط نہیں سوچتا تھا، وہ اکثر اپنی دادی فرید بیگم سے کرن کی باتیں کیا کرتا یعنی غائبانہ طور پر فیروزہ اور فریدہ بیگم دونوں کرن کو جانتی تھیں۔

''کیا کرن تمھیں پسند ہے''؟ فیروزہ نے پیار سے ارشد سے پوچھا۔

''امی! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں وہ مجھے بالکل بھائی کی طرح چاہتی ہے اور میں بھی اسے بہن سمجھتا ہوں۔ آئندہ ایسی باتیں مت کرنا'' اس نے خفگی سے کہا۔ فیروزہ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

عید کے بعد دفتر والوں نے عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا۔ تمام انتظامات ارشد نے کیے چونکہ ان کا دفتر کافی بڑا اور کشادہ تھا، اوپری منزل پر ساز و سامان سے آراستہ ایک بہت بڑا کانفرنس روم تھا وہیں پر عید ملن کی تقریب منعقد کی گئی تھی۔ میریٹ ہوٹل سے آرڈر پر لنچ بکس منگوائے گئے تھے جو کھانے کے طور پر رکھے گئے تھے۔ کرن بھی خاص طور پر اپنے دفتر کے عملے کے ساتھ موجود تھی۔ اس نے بڑی خوبصورت سی شلوار قمیض پہن رکھی تھی، آج وہ بہت حسین لگ رہی تھی۔ ارشد نے نیوی بلو کلر کا سوٹ پہنا ہوا تھا وہ بھی کافی اسمارٹ لگ رہا تھا۔

دوپہر دو بجے کھانا چن دیا گیا۔ کرن اور ارشد آمنے سامنے بیٹھے تھے اچانک کرن چونک گئی کیونکہ ارشد بائیں ہاتھ سے کھانا کھا رہا تھا جبکہ اس کے پاپا بھی بائیں ہاتھ سے کھانا کھاتے تھے پھر اس کے حیرت کی انتہا نہ رہی جب ارشد کھانے کے دوران تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کا ایک ایک گھونٹ پیتا رہا یہی حرکت اس کے پاپا بھی کیا کرتے تھے۔ کرن کھانے کے بجائے وہ ارشد کی ایک ایک حرکت کو نوٹ کرتی رہی دیگر لوگ اور خود ارشد بھی کرن کی غیر معمولی توجہ کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

''آپ کے ابو کا انتقال کہاں ہوا تھا؟'' کرن نے اچانک سوال کر ڈالا۔

''دبئی میں ایکسیڈنٹ ہوا تھا'' ارشد نے مختصر جواب دیا۔

''آپ کے ابو کا نام کیا تھا؟'' کرن نے دلچسپی سے پوچھا۔

''فیصل یوسف''۔ کرن کے ہاتھ سے پانی کا گلاس چھوٹ کر قالین پر جا گرا۔ دفتر کا عملہ اس سچوایشن پر حیران و پریشان تھا۔ ارشد بھی پریشان سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر کرن کو اس کے مرحوم والد میں ایسی کیا خاص دلچسپی ہے وہ کیوں بار بار ان ہی کے متعلق پوچھتی رہتی ہے۔

ارشد کے جواب کے بعد کرن اپ سیٹ سی ہو گئی۔ اس نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ارشد نے اس کا کھانا پیون کے ذریعے اس کے کمرے میں بھجوا دیا پھر وہ خود بھی کھانے کے بعد اس کے کمرے میں آ گیا۔

''مس کرن! خیریت تو ہے آپ کچھ پریشان سی لگ رہی ہیں'' ارشد نے جاننے کی کوشش کی۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھار میرے آدھے سر میں درد ہو جاتا ہے جو دو تین دن تک مسلسل جاری رہتا ہے، اس سے مجھے بہت گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' کرن نے وضاحت کی۔ عید ملن کی تقریب چار بجے تک جاری رہی پھر تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ اس تقریب کے دو دن تک کرن دفتر نہیں آئی۔ اس نے فون پر ہی ارشد کو کچھ ہدایات دی تھیں، تیسرے دن وہ دفتر آئی پھر ارشد کو اپنے کمرے میں بلوایا۔

''ارشد صاحب! میں کچھ دنوں کے لئے دبئی جا رہی ہوں، میری غیر موجودگی میں آپ میری جگہ کام کریں گے، میں وہاں سے آپ کے ساتھ رابطہ رکھوں گی'' کرن نے اسے ہدایات دیں اس کے بعد اپنے سیکریٹری فرقان اور اکاؤنٹنٹ اکبر کو بلوا کر یہی بات دہرادی اور انہیں ارشد کے احکامات ماننے کے لئے کہا پھر تھوڑی دیر بعد وہ واپس چلی گئی۔

دفتر کے تمام لوگ اس بات پر حیران تھے کہ آخر کرن ارشد میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہے؟ انہیں اسکینڈل بنانے کے لئے کوئی واضح ثبوت بھی نہیں مل رہا تھا جبکہ ارشد اور کرن کے رویوں میں ایسی کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی کہ جسے ایشو بنایا جا سکے ہاں البتہ انہیں اتنا ضرور معلوم تھا کہ کرن ارشد پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگی ہے اور بس۔۔

کرن کو دبئی گئے تقریباً دو ہفتے گزر چکے تھے، اس دوران اس نے تین یا چار بار ارشد سے رابطہ کر کے دفتر کی صورت حال معلوم کر لی تھی مگر اپنے واپس آنے کے متعلق کوئی حتمی بات نہیں کی تھی۔

''سر! میڈیم آپ کو یاد کر رہی ہیں۔'' پیون نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''میڈم کب آئیں؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر پہلے ہی آئیں ہیں'' پیون نے مختصر سا جواب دیا اور اس کی میز سے چائے کے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھنے لگا۔ ارشد نے کچھ ضروری کاغذات اکٹھے کئے جو کرن کو دینے تھے، تمام کاغذات کو ایک فائل میں رکھ کر وہ کرن کے کمرے کی طرف روانہ ہوا۔ دروازے پر ہلکی سی دستک دینے کے بعد وہ کمرے میں داخل ہوا، جونہی اس کی نظر کرسی پر پڑی اس پر بجائے کرن کے کوئی بھاری بھرکم شخصیت موجود تھی۔ کرن اپنی کرسی کے

بالمقابل میز سے لگی بیٹھی تھی۔

''آیئے! میں آپ کو اپنے ڈیڈ سے ملاؤں، یہ ہیں فیصل یوسف! جو اس کمپنی کے چیئر مین ہیں، اور ڈیڈ! یہ ہیں مسٹر ارشد جن کی وجہ سے کمپنی کو خاص اہمیت حاصل ہوگئی ہے۔ اتفاق سے ان کے والد کا نام بھی فیصل یوسف ہے جو دبئی میں ایک حادثے میں انتقال کر چکے ہیں''۔ کرن نے معنی خیز انداز میں اپنے ڈیڈ کی طرف دیکھتے ہوئے ارشد کا تعارف کرایا۔

اس تعارف نے دونوں حضرات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا کیونکہ ارشد نے گھر کے البم میں اپنے ابو کی تصویروں کو بارہا دیکھا تھا وہ کیسے اپنے ابو کو نہ پہچانتا۔۔اور فیصل یوسف اس نے تو آج برسوں بعد اپنے بیٹے کو جوان دیکھا تھا پھر بھلا وہ اپنے اکلوتے بیٹے کا نام کیسے بھولتا۔ ارشد کے پاؤں منوں وزنی ہو گئے تھے۔ اس کا ذہن بالکل ماؤف تھا۔ اس نے اپنی امی کے متعلق سوچا جس کی جوانی اس کے باپ کے ساتھ ہی دفن ہو چکی تھی۔۔ اور دادی اپنے اکلوتے بیٹے کی نشانی کو سینے سے لگائے بیتی تلخ یادوں کو بھلانے کی کوشش میں عمر کے آخری حصے میں داخل ہو چکی تھی۔

فیصل یوسف، وہ شخص جس نے مال وزر کی خاطر رشتوں کا خون کر دیا تھا۔ وہ کیسے ان رشتوں کا سامنا کرتا۔ ترقی اور بلندی پر پہنچنے کی ہوس نے اسے بیٹے کی نظروں میں مجرم ثابت کر دیا تھا۔ اپنی صفائی میں کہنے کو اس کے پاس کوئی بھی معقول جواز اور جواب نہیں تھا۔ ارشد نے نفرت سے باپ کی طرف دیکھا پھر کرن سے مخاطب ہوا۔

''سوری مس کرن! میں بعد میں آپ سے ملوں گا'' وہ تیزی سے باہر نکل گیا، کرن نے اپنے ڈیڈ کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا جو بہت گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔

''ڈیڈ! کیا روپیہ پیسہ اور دولت رشتوں سے بڑھ کر ہوتے ہیں، خونی رشتوں کو پامال ہوتے میں نے پہلی بار دیکھا ہے، آپ نے نہ صرف اپنی ماں، بیوی اور بیٹے کو ہی دھوکا نہیں دیا بلکہ میری مما اور مجھے بھی اندھیرے میں رکھ کر ہمارے اعتماد کی بھی دھجیاں بکھیر دی ہیں۔ بیک وقت آپ نے بہت سے رشتوں کا خون کیا ہے جو ناقابل معافی ہے۔ آپ نے اپنے ضمیر کے ساتھ ساتھ اپنے رشتوں کا بھی سودا کیا، کم از کم میں تو آپ کو معاف نہیں کر سکتی''۔ کرن نے آنسوؤں سے روتے ہوئے اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

فیصل یوسف کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی وہ خالی ہاتھ تھا۔ رشتے، ناطے سب ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے تھے۔ اتنے برسوں بعد اس کا فلسفہ غلط ثابت ہوا یعنی دنیا میں دولت سکون دیتی ہے جبکہ سکون صرف اور صرف گھر، خاندان، رشتوں اور ان کے رویوں سے ملتا ہے، اس کی ایک غلطی نے اس کی اپنی شخصیت کو ایک بھیانک کردار میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کی ساری محنت پلک جھپکتے ملبے کا ڈھیر ہو چکی تھی جس پر وہ صرف ماتم ہی کر سکتا تھا۔

ایک معمہ ہے

طارق نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی، صبح کے ساڑھے آٹھ بجے تھے، وہ آج بہت لیٹ ہوگیا تھا۔ رمضان کے دنوں میں دفتر صبح آٹھ بجے لگتا ہے۔ سحری کے بعد نماز اور قرآن شریف کی تلاوت کے بعد اس کی آنکھ لگ گئی تھی لہٰذا اٹھنے میں دیر ہوگئی چونکہ اس کی فیملی مظفر آباد یعنی کشمیر میں مقیم تھی اس لئے وہ اسلام آباد میں اپنے دوست اقبال کے ساتھ G9 کے ایک فلیٹ میں تنہا ہی رہتا تھا ہاں البتہ پندرہ بیس دنوں بعد وہ صرف دو روز کے لئے مظفر آباد جایا کرتا تھا جہاں اس کے والدین اس کی چھوٹی بہن شمیم اور بھائی سلمان کے علاوہ اس کی بیوی سلمٰی رہائش پذیر تھی، تقریباً دو سال قبل طارق کی شادی ہو چکی تھی۔ سلمٰی اس کی چچازاد تھی مگر اس کے ہاں ابھی کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ طارق کے والد قاری عابد اور اس کی والدہ پروین بیگم نے اپنی مشترکہ جائیداد سے تین سو گز پر بڑا خوبصورت مکان بنوایا تھا جس میں ضرورت کا سارا ساز و سامان بھی موجود تھا، مالی اعتبار سے ان کا خاندان اب مضبوط ہو چکا تھا۔

طارق اسلام آباد کے ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز تھا۔ مظفر آباد میں ان کا مکان مدینہ مارکیٹ کے علاقے میں اونچائی کی طرف بنا ہوا تھا جہاں سے لاری اڈہ بھی قریب تھا۔ سلمٰی کے والدین اپر چھتر کے علاقے میں بنے ایک خوبصورت بنگلے میں رہتے تھے۔

طارق نے دوبارہ گھڑی دیکھی، صبح کے پونے نو بج رہے تھے۔ اس نے کار کی اسپیڈ بڑھائی وہ جلد سے جلد دفتر پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جب وہ دفتر کے قریب پہنچا تو خلاف معمول پارکنگ میں آج کافی تعداد میں گاڑیاں موجود تھیں۔ کار پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ دو منٹ کے لئے اپنے دوست وسیم کے پاس رکا رہا جو اس کے دفتر میں بطور آئی ٹی انچارج ملازم تھا۔ اچانک اسے ایک دھماکے کی آواز سنائی دی پھر فوراً ہی بعد زمین ہلنے لگی، اس کا بیلنس بگڑنے لگا، اسے یوں لگا جیسے اس کا سر چکرا رہا ہو دیگر لوگوں کا بھی یہی حال تھا۔ زیادہ تر لوگ آس پاس کے دفاتر کے اندر سے باہر کی طرف دوڑ رہے تھے۔

”زلزلہ آرہا ہے، بھاگو روڈ کی طرف، کھلے میدان کی طرف چلو۔“ ہر طرف سے یہی آوازیں سنائی دے رہی

تھیں۔سب ہی پریشانی کے عالم میں دوڑ رہے تھے۔طارق بھی دفتر کے سامنے بنے ایک چھوٹے سے پارک میں آ کر خوفزدہ سا بیٹھ گیا۔اس کی نظر گھڑی پر پڑی اس وقت صبح کے نو بج کر پچپن منٹ ہوئے تھے۔وہ زیرلب کلمہ طیبہ کا ورد کرتا رہا دیگر لوگوں کا بھی یہی حال تھا کوئی درود شریف کا ورد کرتا تو کوئی کلمے کا،غرض یہ کہ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔زمین کی لرزش تھمی نہیں تھی بلکہ بڑھتی ہی جارہی تھی۔زمین پر بیٹھنا اور چلنا دشوار ہورہا تھا۔

''یار! یہ کیسا زلزلہ ہے؟ مسلسل جھٹکے پہ جھٹکے آرہے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے بموں کی بارش ہورہی ہو۔اللہ خیر کرے، مجھے تو اوجھڑی کیمپ کا واقعہ یاد آ گیا۔'' ایک ادھیڑ عمر شخص نے دوسرے شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں! مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے۔اللہ رحم کرے۔'' جواب میں کہا گیا۔

ہر پندرہ بیس منٹ بعد جھٹکوں کی وہی پوزیشن تھی۔خوف کے باعث کوئی بھی شخص اندر جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔رہائشی علاقوں میں رہنے والی خواتین سب سے زیادہ پریشان اور خوفزدہ تھیں کیونکہ ان کے گھر کے مرد اپنے اپنے کام کاج کے لئے نکل چکے تھے جب کہ زیادہ تر بچے اس دن ہفتے کی چھٹی کے باعث گھروں میں سو رہے تھے لہٰذا ماں اور بچے گھروں سے باہر بے سروسامانی کے عالم میں کھڑے تھے۔

طارق ایک گھنٹے تک پارک میں دیگر لوگوں کے ساتھ بیٹھا رہا پھر پارکنگ سے اپنی کار نکال لایا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔وہ سڑک سے گزرتے ہوئے چاروں طرف نگاہ ڈالتا رہا کہ کہیں کوئی بڑا نقصان تو نہیں ہوا مگر اسے ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آئی جو اس کے شک کو تقویت دیتی۔کار سے گزرتے ہوئے اس نے FM103 آن رکھا جس پر خبریں آرہی تھیں کہ صبح آٹھ بجکر باون منٹ پر لاہور، اسلام آباد، پنڈی، پشاور، مانسہرہ اور کشمیر میں زلزلہ آیا جس کی شدت بہت زیادہ تھی فی الحال کسی جانی و مالی نقصان کی اطلاع ابھی نہیں ملی۔خبروں میں کشمیر کا نام سن کر طارق کو فوراً اپنے خاندان والوں کی فکر ہوگئی۔اس نے موبائل نکال کر اپنے بھائی سلمان کا نمبر ڈائیل کیا وہاں صرف ریکارڈنگ کی آواز تھی کہ فی الحال رابطہ نہیں ہوسکتا،اس کے بعد اس نے اپنے گھر کا نمبر ڈائیل کیا گھر کے نمبر پر بھی کوئی رابطہ نہ ہوسکا۔تنگ آ کر اس نے اپنے چچا یعنی سسر احمد مغل کے گھر فون کیا وہاں بیل بجتی رہی مگر کوئی ریسیو کرنے والا موجود نہیں تھا۔طارق اسی ادھیڑبن میں الجھا کار ڈرائیو کرتا رہا کہ دفعتاً اس

کی نظر لوگوں کے ہجوم پر پڑی۔ اس نے کار میں سے سر نکال کر اپنے داہنے کی طرف دیکھا۔

''یہ کیا؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔ مارگلہ ٹاور کا ایک پورا فیز زمین بوس تھا، لوگ اس پر چڑھے اپنے پیاروں، دوستوں اور جاننے والوں کو نکالنے کی جستجو میں لگے ہوئے تھے، وہاں پولیس کے چند نوجوانوں کے علاوہ تین چار ایمبولینس بھی موجود تھیں، مارگلہ ٹاور کا دوسرا فیز ایک طرف سے جھک گیا تھا، درجنوں لوگ اس میں سے نکل نکل کر باہر کی طرف آرہے تھے۔ ایک عجیب افراتفری کا عالم تھا۔

طارق کو یہ منظر دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔ اس نے دل میں سوچا کہ مارگلہ ٹاور کے تمام فلیٹ لگژری بنے ہوئے تھے جبکہ اس ایک فلیٹ کی مالیت ایک کروڑ پچیس لاکھ تھی جب اس مضبوط مارگلہ کا یہ حال ہوگیا تو میرا فلیٹ بالکل ہی ملیامیٹ ہوگیا ہوگا، اس سوچ کے آتے ہی وہ پریشان ہوگیا۔ وہ مارگلہ کے پاس زیادہ دیر نہیں رکا اور اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے کار کی اسپیڈ مزید بڑھائی جیسے ہی وہ اپنے محلے میں داخل ہوا سب ٹھیک تھا، تمام فلیٹ بھی سلامت تھے اور لوگ بھی۔۔ ہاں البتہ لوگ فلیٹوں کے اندر جانے کی بجائے باہر کھڑے تھے۔ اس نے اپنی کار فلیٹ سے کافی فاصلے پر روکی تاکہ کسی بھی ہنگامی صورت میں کار کو نقصان نہ پہنچے جوں ہی وہ کار سے اترا، زلزلے کے جھٹکوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ گھبرا کر دوبارہ کار میں داخل ہونے لگا تو لوگوں نے اسے آواز دے کر روکا کہ وہ باہر ان کے ساتھ بیٹھ جائے کار میں نہ بیٹھے، اس نے گاڑی لاک کی اور دیگر لوگوں کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔

ایک گھنٹہ گزر جانے کے باوجود جھٹکوں میں کمی نہیں ہوئی تھی مجبوراً وہ اٹھا اور فلیٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس کا فلیٹ پہلی منزل پر تھا جبکہ یہ پورا اپارٹمنٹ دومنزلہ فلیٹوں پر مشتمل تھا۔ فلیٹ میں آنے کے بعد وہ اپنے کمرے میں گیا اور کپڑے بدلے۔ پھر ٹی وی آن کر بیٹھ گیا۔ ٹی وی پر تازہ ترین بلیٹن آرہا تھا۔ اس وقت صبح کے گیارہ بجے تھے، خبروں میں بھی سوائے زلزلے کی اطلاع کے کوئی خاص بات نہ تھی، ہاں البتہ کچھ لوگوں کے انٹرویو اور تاثرات دکھائے جارہے تھے۔ ان سب لوگوں نے بھی یہی کہا کہ زوردار دھماکے کی آواز آئی بقول ان کے کچھ نے یہ کہا کہ شاید کوئی ٹائر بلاسٹ ہوا تھا۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ شاید کہیں بم کا دھماکہ ہوا ہو۔ جانی و مالی نقصان کے متعلق کسی کو بھی ایک دوسرے کی خبر نہیں تھی۔ طارق نے اپنے گھر مظفر آباد میں دوبارہ فون سے رابطہ کرنے

کی کوشش کی مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ باری باری اس نے اپنے تمام رشتے داروں کو فون کیئے مگر کہیں بھی رابطہ نہ ہوسکا، تنگ آ کر وہ بستر پر دراز ہوگیا اور اخبار کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس کا ملازم رشید جو کہ ان ہی کے فلیٹ میں رہتا تھا، خط لے آیا جو مظفر آباد سے آج صبح کی ڈاک سے پہنچا تھا۔ طارق نے جلدی سے لفافہ کھولا، یہ خط اس کی بیوی سلمٰی کا تھا جس نے اسے جلدی گھر آنے کے لئے لکھا تھا۔ دروازے پر دستک کی آواز آئی، رشید نے دروازہ کھولا تو اقبال گھبرایا ہوا آیا۔ وہ طارق کے فلیٹ میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔

''یار! مارگلہ ٹاور گر چکا ہے اور تمام لوگ اس کے ملبے میں دبے ہوئے ہیں۔'' اس نے اطلاع فراہم کی۔

''ہاں! میں راستے میں دیکھتا ہوا آیا ہوں مگر ابھی تک ٹی وی پر یہ خبر نہیں آئی۔'' طارق نے تصدیق کی۔ اقبال کے گھر والے لاہور ٹاؤن شپ میں رہتے تھے۔ وہ بھی اسلام آباد میں ٹیلی فون کمپنی میں ملازم تھا۔

''تم نے اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کی؟'' طارق نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں! وہ سب خیریت سے ہیں۔ تمہارے گھر والوں کی خیریت معلوم ہوئی'' اس نے اگلا سوال طارق سے کیا۔

''صبح سے انہیں اور بہت سے رشتہ داروں کو فون کر رہا ہوں مگر پتا نہیں کیوں فون نہیں لگ رہا ہے، مجھے پریشانی ہورہی ہے۔'' طارق نے مایوسی ظاہر کرتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''ارے بھئی! پریشانی کی کوئی بات نہیں، ہوسکتا ہے زلزلے کی وجہ سے تاروں میں کوئی الجھاؤ پیدا ہوگیا ہو تھوڑی دیر بعد ٹرائی کرو انشاء اللہ رابطہ ہو جائے گا۔'' اقبال نے اس کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کی۔

پتا نہیں کیوں طارق پھر بھی مطمئن نہیں ہوا کئی اندیشوں نے اسے گھیر لیا، دوپہر بارہ بجے کی خبروں میں مارگلہ ٹاورز سے متعلق پہلی خبر دکھائی گئی پھر مسلسل ٹی وی کا فوکس مارگلہ ٹاور ہی تھا۔ ملک کے دیگر علاقوں کی اطلاع ابھی نہیں تھی تقریباً اس خبر کے ایک گھنٹے بعد راولپنڈی اور لاہور کی دو تین عمارتیں دکھائی گئیں جو زلزلے کی نذر ہو چکی تھیں وہاں کی امدادی کاروائیاں دکھائی جارہی تھیں، وی آئی پی شخصیات بھی بہ نفس نفیس وہاں موجود تھیں جبکہ زلزلوں کے جھٹکے مسلسل محسوس ہورہے تھے، لوگوں کو اللہ اکبر کی صداؤں میں ملبے سے باہر نکالا جارہا تھا، ایمبولینس اور پولیس کی گاڑیوں کے شور نے فضاء کو اور بھی سوگوار بنا دیا تھا۔

طارق مسلسل فون سے رابطہ کرنے کی کوشش میں لگا رہا مگر کسی صورت وہ کامیاب نہ ہوسکا، افطاری کا وقت ہو چلا تھا۔ اقبال اور اس کا مشترکہ ملازم رشید افطاری تیار کرنے میں مصروف تھے۔ افطاری کے بعد اقبال اور وہ قریبی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔ خلافِ توقع مسجد میں نمازیوں کی تعداد کافی سے زیادہ تھی۔ جھٹکے ہر تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکے اور تیز محسوس ہو رہے تھے۔ خواتین اور بچے گھروں میں باعثِ ضرورت جاتے ورنہ باہر میدان میں خواتین بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتیں مجموعی اعتبار سے تمام لوگ خوفزدہ تھے چونکہ طارق کو اپنے گھر والوں کی اطلاع نہیں مل رہی تھی اور نہ ہی یہ اطلاع تھی کہ آیا زلزلہ مظفر آباد میں بھی آیا تھا یا نہیں، اس لئے وہ مسلسل ذہنی دباؤ کا شکار تھا یہی وجہ تھی کہ اس کا دوست دیگر لوگوں کے ساتھ باہر میدان میں تھا جبکہ وہ اپنے کمرے میں ٹی وی آن کر کے پل پل کی خبر سے آگاہی چاہ رہا تھا۔ تراویح سے فارغ ہو کر اقبال اور اس نے کھانا کھایا پھر ٹہلنے کے لئے باہر نکلے تو یکدم تیز ہواؤں کے ساتھ بارش ہونے لگی دیگر خواتین و حضرات بھی بارش سے بچنے کے لئے فلیٹوں میں واپس آنے لگے۔ مارگلہ ٹاور کی امدادی کارروائیوں میں بارش کی وجہ سے تعطل پیدا ہو گیا مگر لوگوں نے ہمت نہیں ہاری ان کی جدوجہد جاری تھی تقریباً اسلام آباد کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بھی اس امدادی کارروائیوں میں حصہ لیا تاکہ نقصان کم سے کم ہو، نوجوانوں کی ایک کثیر تعداد ہسپتالوں میں خون دینے والوں میں شامل ہو گئی تھی کیونکہ اس سانحے کے بعد ہسپتالوں اور پولیس میں ایمرجنسی نافذ کر دی گئی تھی۔

خوف کے باعث کچھ خاندانوں نے رات اپنی کاروں میں سڑکوں پر ہی بسر کی۔ طارق نے سحری کی اور فجر کی نماز پڑھ کر بستر پر لیٹ گیا تھوڑی دیر کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی گھبرا کر اٹھا تو صبح کے آٹھ بجے تھے۔ اتوار کا دن تھا دفتر جانا نہیں تھا جیسے ہی اس نے بستر سے پیر نیچے رکھے جھٹکوں نے اس کو خوفزدہ کر دیا۔ اس پر مزید گھبراہٹ طاری ہو گئی، کمرے میں اقبال اور ملازم بھی موجود نہیں تھا۔ اس نے بالکونی سے نیچے جھانکا تو اس کے زیادہ تر پڑوسی نیچے گراؤنڈ میں پریشانی کے عالم میں بیٹھے تھے۔ وہ واپس پلٹا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ تازہ ترین خبریں آرہی تھیں۔ مارگلہ ٹاورز میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کی تعداد بتانے کے بعد سرحد اور آزاد کشمیر کی خبریں بھی بتائی جا رہی تھیں یعنی مظفر آباد، باغ، بالاکوٹ، ایبٹ آباد اور مانسہرہ میں زلزلے سے

جانی اور مالی نقصانات کی بہت مختصر سی خبر تھی بقول ٹی وی کے وہاں کا مواصلاتی نظام بالکل منقطع تھا لہذا تفصیلات معلوم کرنے میں وقت پیش آرہی تھی۔ اس خبر کے بعد طارق کی حالت یکدم غیر ہوگئی۔ اس نے دوبارہ فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر بے سود۔۔ پریشانی کے عالم میں اس نے بالکونی سے اپنے دوست اقبال اور رشید کو آوازیں دیں، وہ دونوں دوڑتے ہوئے اوپر آگئے۔ طارق نے انہیں تفصیل بتائی تو وہ دونوں بھی پریشان ہوگئے۔

اب ٹی وی سے باقاعدہ تازہ ترین خبروں کا سلسلہ شروع ہوگیا لیکن تفصیلات معلوم نہیں ہوسکی تھیں ہاں اتنا ضرور پتا چل گیا تھا کہ مظفر آباد، باغ، ایبٹ آباد، بالاکوٹ اور مانسہرہ زلزلے کی زد میں تھے۔

''یار! میں اسی وقت مظفر آباد جانا چاہتا ہوں۔'' طارق نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''کیسے جاؤ گے؟ چاروں طرف راستے بند ہیں، زلزلے کے جھٹکے مسلسل آرہے ہیں اس کے علاوہ لینڈ سلائیڈنگ کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا ہے۔ کس طرح جاسکو گے؟'' اقبال نے وضاحت کی۔

''اقبال! جانا تو ہوگا ظاہر ہے میرے گھر والوں کو میری مدد کی ضرورت پڑے گی پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گے؟ مجھے بہت تشویش ہورہی ہے۔'' طارق نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے اپنا جواب مکمل کیا۔

ٹی وی مسلسل چل رہا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں کی تازہ صورتِ حال سامنے آرہی تھی۔ لوگوں سے امداد کی اپیل ہورہی تھی مگر حالات کی خوفناک سنگینی ابھی سامنے نہیں آئی تھی۔ ہلاکتیں ایک ہزار کے اندر ہی بتائی جارہی تھیں۔ ملک کے عوام اور ٹی وی کا عملہ بدستور مواصلاتی رابطہ منقطع ہونے کے باعث سانحے کی سنگینی سے ناواقف تھا۔ شام کے چار بج گئے مگر طارق ابھی تک مظفر آباد جانے کا فیصلہ نہ کرسکا کیونکہ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ زلزلے کی تباہ کاریاں سامنے آنے لگیں تھیں بقول ٹی وی اور غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کے سرحد اور کشمیر جانے والے تمام راستے بلاک تھے وہاں کی بجلی اور گیس کی تمام تنصیبات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچ چکا تھا صرف ہیلی کاپٹرز ہی وہ ذریعہ تھے جس کے ذریعہ امداد کی فراہمی ہوسکتی تھی پھر اتنے ہیلی کاپٹرز حکومت کے پاس موجود نہیں تھے جو ریلیف کے کام میں مدد دے سکتے کیونکہ سانحہ بہت بڑا پیش آچکا تھا، مرنے، ملبے میں دبنے اور زخمیوں کی تعداد تصور سے سینکڑوں گناہ زیادہ تھی۔ ملبہ ہٹانے کے آلات موجود ہی نہیں تھے، لوگ اپنے

پیاروں کو ملبے میں دبا دیکھ کر ویسے ہی ہوش گنوا بیٹھے تھے۔ کشمیر روانگی کے سلسلے میں طارق کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ کیسے جائے؟ کہاں سے جائے؟ اصل سوال یہی تھا۔ محلے والوں اور دوستوں نے یہی مشورہ دیا کہ ابھی ایک دن ٹھہر جاؤ، وہ ایک دن کیسے ٹھہرتا، اسے ایک ایک پل بھاری لگ رہا تھا۔ اس کی زندگی کا محور، مرکز اور حاصل اس کا گھر، اس کے ماں باپ، بیوی اور بھائی بہن تھے۔ ان کے بغیر اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا۔

جیسے تیسے اتوار کی رات سحری اور نماز کے ساتھ گزر گئی۔ پیر کی صبح مظفر آباد، باغ اور بالاکوٹ کی تباہی کی عبرت ناک۔ خبروں نے طارق کے اوسان خطا کر دیئے، وہ نیم پاگل سا ہو گیا۔ اسلام آباد کے سرکاری اور نجی اداروں میں ملازمین کی حاضری نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ اسلام آباد سے ہٹ کر صوبہ سرحد اور کشمیر کے علاقوں میں جو تباہیاں ہوئیں تھی اس سے پورے ملک میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔ بین الاقوامی نیوز ایجنسیاں اور امدادی ادارے حرکت میں آ گئے تھے، نیٹو کے فوجی اور امدادی کارکن قریب ہونے کی بناء پر پہلے پہنچ گئے تھے۔ قیامت کیسی ہوتی ہے؟ اس کی ایک ہلکی سی جھلک دنیا بھر نے ٹی وی اور انٹرنیٹ پر دیکھ لی تھی۔ ترقی پذیر اور چاند پر کمند ڈالنے والے ممالک جو سپر پاور کہلانے پر فخر محسوس کرتے ہیں، سب سے بڑے سپر پاور کے آگے خود کو کتنا بے بس محسوس کر رہے تھے، اس کا اندازہ ان ممالک کے نیوز بلیٹن سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کتنے خوفزدہ تھے۔ اس تباہی نے انہیں باور کرا دیا تھا کہ اللہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ انسان اس کے رحم اور کرم کے محتاج ہیں۔ برسوں میں تعمیر ہونے والی سڑکیں اور عمارتیں لمحوں میں ملبے کا ڈھیر ہو چکی تھیں۔ مالک کائنات نے دنیا کے سرکش اور باغی انسانوں کو اپنے وجود کی ایک چھوٹی سی جھلک دکھائی تھی کہ ”دیکھو! غیض وغضب، اقتدار اور اختیار جو میں رکھتا ہوں، وہ تمہارے پاس کہاں؟۔۔“ قدرت کے آگے انسان کتنا بے بس اور مجبور ہے اس کا اندازہ اس اندوہناک زلزلے نے ثابت کر دیا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے زمین کی بساط لپیٹ دی گئی ہو۔

منگل کے دن تک مظفر آباد، باغ، بالاکوٹ کی خبروں نے طارق کی امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ ٹی وی نے جس انداز میں ان شہروں کی منظر کشی کی اس کے علاوہ مختلف علاقوں کی تباہی کے جو مناظر دکھائے وہ کسی قیامت سے کم نہ تھے۔ پہاڑوں کے دامن میں اور پہاڑوں کے اوپر بنی ہوئی بستیاں صفحہ ہستی سے مٹ چکی تھیں۔ لینڈ سلائیڈنگ کے باعث سڑکیں اپنا وجود کھو چکی تھیں بعض مقامات پر پہاڑ ریزہ ریزہ ہو چکے تھے۔ ان

عبرتناک مناظر کو دیکھ کر ہر آنکھ خوفزدہ اور اشکبار تھی۔ رمضان کا مبارک اور خوشیوں بھرا مہینہ غم واندوہ میں ڈوبا ہوا تھا پتا نہیں یہ کیسی آزمائش تھی اور کیوں تھی، کس کے لئے تھی ؟ اسی طرح کے مختلف سوالات لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے، گویا ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ اس قیامت صغریٰ کے سامنے ہمدردی، غمگساری اور دلجوئی جیسے لفظوں اور بولوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ سانحہ اتنا بڑا تھا کہ سارے دلاسے اور تسلیاں چھوٹی اور جھوٹی سی لگ رہی تھیں۔ یہ سب کچھ زخموں پر مرہم کی بجائے نمک کا کام دے رہا تھا۔

منگل کی شام چار بجے کے قریب طارق نے مظفرآباد جانے کا فیصلہ کرلیا، وہ اپنی گاڑی میں ضروری چیزیں، افطاری اور سحری کا سامان اس کے علاوہ پانی وافر مقدار میں رکھ کر روانہ ہوا حالانکہ اس کے دوستوں اور پڑوسیوں نے بہت سمجھایا مگر خونی رشتوں کی تڑپ کہاں رکنے دیتی۔ اسلام آباد سے پیٹرول کی ٹنکی فل کرانے کے بعد اس نے اپنا سفر شروع کیا۔ مری سے مظفرآباد کا راستہ خطرناک اور دشوار گزار ہو چکا تھا کیونکہ پہاڑی راستوں پر لینڈ سلائڈنگ جاری تھی اس کے علاوہ گھروں اور چٹانوں کا ملبہ سڑکوں پر آنے سے راستے بند ہو چکے تھے، اتنی دور پیدل جانا ممکن نہیں تھا۔ ہیلی کاپٹرز سے امداد فراہم کرنا حکومت کے بس میں ہی نہیں تھا تو وہ کیسے اس کی تمنا کرتا لہٰذا وہ اسلام آباد سے ٹیکسلا، حسن ابدال، ہری پوری پھر حویلیاں سے ہوتا ہوا ایبٹ آباد پہنچا۔ تمام راستے ایمبولینسوں کی قطاریں اس کے علاوہ نجی گاڑیوں میں مختلف سماجی تنظیموں کے کارکن جاتے دکھائی دیتے رہے۔ ایبٹ آباد سے تباہی کے آثار زیادہ نمایاں ہونے شروع ہوئے کئی جگہ ہوٹل اور عمارتوں کی چھتیں زمین بوس ہو چکی تھیں۔ سڑکوں پر اتنا رش تھا کہ اسے مانسہرہ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ گئے۔ راستے میں رک کر اس نے افطاری کی پھر سڑک کے کنارے نماز ادا کی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ مانسہرہ کے لئے روانہ ہوا۔ سڑک پر امدادی کارکنوں کے علاوہ میڈیا سے تعلق رکھنے والے افراد کی گاڑیاں، غیر ملکی امدادی کارکنوں کی بھاری تعداد کے ساتھ ساتھ اسلام آباد سے آنے والے نوجوانوں کی کافی بڑی تعداد ریلیف کے کام میں مدد دینے کے لئے پہنچی ہوئی تھی۔ مانسہرہ میں داخل ہونے کے بعد جگہ جگہ شامیانے دکھائی دیئے جن میں راشن، پانی، کمبل، کپڑے اور دوائیوں کے ڈبے پڑے ہوئے تھے۔ ان کیمپوں میں جماعت اسلامی، جماعت الدعوۃ، حزب المجاہدین اور آرمی کے جوان بڑی جانفشانی سے مختلف پیکٹ بنانے میں مصروف تھے چونکہ مانسہرہ سے

آ گے مظفر آباد، بالا کوٹ، گڑھی حبیب اللہ، گڑھی ڈوپٹہ غرضیکہ اس طرف جانے والے سارے راستے بند ہو چکے تھے۔ کوئی گاڑی، کوئی کار سوائے پیدل اور ہیلی کاپٹر کے جانا ممکن ہی نہیں تھا۔ زلزلے کے جھٹکے مسلسل آ رہے تھے۔

جہاں تک حکومت کا تعلق تھا حکومت کی مشینری کام تو کر رہی تھی مگر ہیلی کاپٹرز کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی کیونکہ زلزلے نے ہزاروں افراد کو متاثر کیا تھا بیک وقت ان سب کو امداد اور ریلیف فراہم کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ فضائی رابطوں کے علاوہ متاثرہ علاقوں میں پہنچنا بہت مشکل تھا۔ طارق نے اپنی کار دور ایک جگہ پارک کی پھر حسرت سے ان راستوں کی طرف دیکھا جو ہر طرف سے بند تھے۔ آرمی کے جوان اور مجاہدین لوگوں کو آگے بڑھنے سے روک رہے تھے مگر کچھ سر پھرے نوجوان آگے جانے کی ضد کر رہے تھے۔ طارق نے دیکھا کہ درجنوں نوجوان جن کی بڑی اور گھنی داڑھیاں تھیں، چہرہ نورانی، محبت اور اخوت کے جذبے سے سرشار، اپنی پیٹھ پر بھاری بھر سامان لادے پیدل ہی متاثرین کو امداد فراہم کرنے نکل پڑے۔ ان کے ساتھ ساتھ آرمی کے جوان بھی تھے۔

آرمی کے ساتھ ساتھ جانے والے نوجوانوں کی جیکٹوں اور ٹوپیوں پر حزب المجاہدین اور جماعت الدعوۃ لکھا تھا۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کی تعداد بھی کافی تھی کیونکہ یہ تمام پہاڑوں پر رہنے اور کام کرنے والے لوگ تھے۔ ان کے علاوہ پہاڑوں پر کوئی عام آدمی نہیں چڑھ سکتا تھا۔

''متاثرہ علاقوں میں ابھی تک امداد نہیں پہنچی ہے کیا؟'' طارق نے ایک امدادی کارکن سے پوچھا۔

''زلزلے کے پہلے ہی دن سے مجاہدین امدادی سامان لے کر متاثرہ علاقوں میں پہنچ گئے تھے اور مسلسل ہی جا رہے ہیں''۔ کارکن نے بے نیازی سے جواب دیا اور آگے بڑھ گیا۔

طارق نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر دیگر کارکنوں کے جذبات بھی دیکھے، وہ متاثرہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جذبہ ایمانی سے سرشار مختلف تنظیموں اور جہادی تنظیموں کے کارکنان اپنی زندگیوں کی پرواہ کئے بغیر دوسروں کی زندگیاں بچانے کی فکر میں کوشاں تھے۔ ایک لمحہ کے لئے اسے خیال آیا کہ ٹی وی اور دیگر میڈیا نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ متاثرین کی دادرسی کے لئے سب سے پہلے پہنچنے والے یہی سرفروشان اسلام

تھے۔اس نے دل میں سوچا کہ مغرب لاکھ اسلام اور جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر بدنام کرنے کی کوشش کرے مگر اس جذبہ ایمانی کو وہ خرید نہیں سکتے اور نہ ہی اپنا سکتے ہیں یہی دونوں چیزیں مسلمانوں کو تمام اقوام کے مقابلے پر ممتاز کرتی ہیں۔ پوری دنیا کے مسلمان صرف نعرہ تکبیر پر ہی متحد ہو جاتے ہیں یہی نعرہ ان کی طاقت اور عظمت ہے جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔

رات کافی ہو چکی تھی۔طارق نے جماعت کے کیمپ میں رات بسر کی۔سحری سے فارغ ہونے کے بعد نماز پڑھی۔ایک گھنٹہ متاثرہ علاقوں کی صورت حال معلوم کرنے کے بعد وہ دیگر امدادی کارکنوں کے ساتھ پیدل ہی مظفر آباد کی طرف روانہ ہوا۔ مانسہرہ سرکٹ ہاؤس میں آرمی نے اپنا سیل قائم کیا تھا جہاں سے مختلف قسم کی معلومات اور ریلیف کی نگرانی کا کام شروع کیا گیا تھا میجر ناصر اس کے انچارج تھے۔طارق کو چونکہ پہاڑوں پر چلنے کی عادت تو نہ تھی مگر اس وقت اپنے پیاروں سے ملنے اور ان کی خیریت معلوم کرنے کا جذبہ غالب تھا لہٰذا جسمانی تکالیف کا احساس نہ ہونے کے برابر تھا۔اس کے ساتھ دیگر لوگ بھی تھے جن کی وجہ سے اس کا حوصلہ بڑھتا رہا تقریباً تین میل کا سفر طے کرنے کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہو گیا۔زلزلے کے جھٹکے مسلسل آرہے تھے۔وہ لوگ بہت سنبھل کر چل رہے تھے کیونکہ لینڈ سلائیڈنگ کا خطرہ کسی وقت بھی پیش آسکتا تھا۔خوبصورت سڑک پر جگہ جگہ پتھر پڑے ہوئے تھے، پیدل اونچائی کی طرف سفر کرنا بہت مشکل مرحلہ تھا پھر روزے میں اتنی دور جانا اور بھی پریشان کن تھا۔طارق سمیت کل تیرہ افراد پیدل سفر کر رہے تھے۔

طارق کے کندھے پر ایک سفری بیگ تھا جس میں ایک کمبل، کچھ پھل، بسکٹ، دودھ کے ڈبے اور پانی کی بوتلیں تھیں جبکہ دیگر کارکنوں کے کندھوں پر زیادہ بھاری سامان تھا جو ریلیف کے لئے تھا۔ان کے لئے اور بھی مشکل تھی تقریباً دس میل پیدل چلنے کے بعد انہیں آرمی کا ایک ٹرک دکھائی دیا جس پر ریلیف کے سامان کے علاوہ کچھ خیمے بھی لدے تھے۔وہ ٹرک رکا ہوا تھا۔جب طارق اور اس کے ساتھی ٹرک کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ آگے سڑک بند ہے۔ پہاڑوں کے بڑے بڑے پتھر سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔ٹرک پر کل چھ فوجی جوان موجود تھے۔طارق اور اس کے ساتھیوں نے مشترکہ طور پر سارے پتھر ہٹانا شروع کر دیئے تقریباً ایک گھنٹے کی محنت کے بعد تمام پتھر سڑک کے کنارے کر دیئے گئے پھر آرمی والوں نے طارق اور اس کے ساتھیوں کو

ٹرک پر سوار کرایا اس کے بعد آہستہ آہستہ مہارت کے ساتھ سفر کرنا شروع کیا کیونکہ خطرہ ہر وقت موجود تھا۔ خدا خدا کر کے ان کا ٹرک ایک مقام پر رک گیا۔ افطاری کا وقت قریب تھا۔ سڑک کے اطراف میں دکانیں اور مکانات زمین بوس نظر آئیں، بچ جانے والے اپنے پیاروں کو پکار رہے تھے۔ سامان اور زخمیوں کو تلاش کیا جا رہا تھا۔ طارق اور اس کے ساتھ جانے والوں نے بچ جانے والوں کو کھجوریں اور پانی کی بوتلیں دیں وہاں کئی مسجدیں بھی شہید ہو چکی تھیں۔ لوگوں کے کراہنے اور بین نے فضا کو سوگوار کر دیا تھا علاقے میں بجلی بھی نہیں تھی اور گیس کا کنکشن بھی منقطع تھا چونکہ اس علاقے میں زخمیوں کی تعداد اچھی خاصی تھی لہٰذا طے یہی ہوا کہ رات یہیں بسر کی جائے۔ طارق کے لئے ایک لحہ گزارنا بھی مشکل لگ رہا تھا مجبوراً اس نے رات وہیں بسر کی۔ سحری اور نماز کے بعد سفر دوبارہ شروع ہوا آرمی کا ٹرک ان کے ساتھ ہی تھا، انہیں بھی مظفر آباد ہی جانا تھا کیونکہ وہاں بیرکوں میں کافی سے زیادہ آرمی کے جوان شہید ہوئے تھے۔ بالاکوٹ جاتے ہوئے تمام راستے کے دونوں طرف تباہی اور بربادی کے آثار تھے بعض علاقوں میں عمارتوں اور پہاڑوں کے ملبے نے موہن جوڈرو اور ہڑپہ کی یاد تازہ کر دی۔ بالاکوٹ نوے فی صد تباہ تھا کوئی گھر، کوئی دکان، کوئی مکان سلامت نہیں تھا۔ فضاء میں انسانی اعضا اور لاشوں کی بو رچی بسی تھی۔ سانس لینا دشوار ہو رہا تھا چند اکا دکا بچ جانے والے پانی اور خوراک کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ کھلے آسمان تلے بھوک اور پیاس سے نڈھال، گھر والوں کے بچھڑ جانے اور ملبے تلے دبے زخمیوں کی مدد کے لئے بے چین ہو رہے تھے۔ علاقے میں اتنے بچے ہی نہیں تھے کہ ایک دوسرے کی مدد کرتے، وہ تمام لوگ حکومتی امداد کے منتظر تھے۔

بالاکوٹ کے ایک اسکول میں 400 بچے ہلاک ہوئے جو ہنوز دبے ہوئے تھے، شاہین اسکول، یہ پرائیویٹ اسکول تھا۔ بالاکوٹ کے اوپری علاقے گڑھی ڈوپٹہ، کاشیان، سبزیاں، بٹ سنگوں یہاں کی زیادہ تر آبادی ملبے تلے دب گئی تھی ہاں البتہ شاہ اسمٰعیل شہید کا مزار صحیح سلامت تھا۔ مین مارکیٹ پوری کی پوری زمیں بوس تھی۔ دریائے کنہار پر بنا گرلاٹ برج جو کاغان اور ناران کو ملاتا ہے وہ بھی زلزلے کے باعث اپنے ٹریک سے تقریباً ایک سے ڈیڑھ فٹ ہٹا ہوا تھا۔ طارق نے دریا میں جھانکا، کئی مکانات اور دکانیں پانی میں گر گئی تھیں۔ بالاکوٹ شہر خموشاں کی تصویر بنا ہوا تھا، سڑکوں پر امدادی کارکنوں کے علاوہ اکا دکا مقامی نظر آئے جو امداد

کے طالب تھے زیادہ تر لوگ پیدل ہی تھے۔ بالاکوٹ کی تباہی اور بربادی نے طارق کی رہی سہی امیدیں ختم کر دی تھیں۔ ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو گھر والوں کی کسی بھی اچھی یا بری خبر کے لئے تیار کر رہا تھا، دوسروں کے دکھ اور غم اتنے بے شمار تھے کہ وہ اپنے تمام غم بھول گیا۔

بالاکوٹ میں گھر کے گھر اس سانحے کی بھینٹ چڑھ چکے تھے، ان کے پیچھے رونے والا بھی کوئی نہ تھا۔ پورے شہر کی حالت زار دیکھنے کے بعد طارق کی حالت غیر ہوگئی، اس کا بی پی لو ہو گیا، اسے چکر آنے لگے۔ بمشکل وہ دوبارہ ٹرک میں سوار ہوا۔ اب ان کی اگلی منزل مظفر آباد تھی۔ وادی نیلم اور جہلم کے راستے بند تھے پتا چلا کہ ایک دن قبل ہی آرمی نے ڈائنا میٹ سے پہاڑی راستوں کو کلیئر کر دیا تھا۔ آرمی کا ٹرک بہت آہستہ آہستہ اپنی منزل کی طرف رواں تھا کیونکہ ایک طرف دریائے جہلم بہہ رہا تھا جس کی گہرائی سینکڑوں فٹ تھی، دوسری طرف اونچے پہاڑی سلسلے تھے جہاں سے بڑے بڑے پتھر سرک کر روڈ پر آ رہے تھے۔ سڑک پر جگہ جگہ بڑے چھوٹے شگاف پڑے ہوئے تھے جو زلزلے کی شدت کی وجہ سے تھے۔ سڑک بالکل پتلی سی رہ گئی تھی۔ ٹرک کے پہیے ایک دو انچ بھی پہاڑی سے ہٹ جاتے تو ٹرک سینکڑوں فٹ گہری کھائی میں جا گرتا کیونکہ سڑک کے کنارے کوئی جنگلہ یا حفاظتی دیوار نہیں تھی۔ دونوں طرف سے موت ہی موت تھی چونکہ دو روز قبل ہی بارش ہو چکی تھی لہٰذا دریائے جہلم میں پانی کی روانی کافی تیز تھی۔ یہ منظر دیکھ کر طارق نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ زیر لب کلمہ طیبہ کا ورد کرتا رہا، وہ نہ صرف اپنی زندگی کی سلامتی کی دعائیں مانگتا رہا بلکہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لئے بھی مسلسل دعائیں کرتا رہا۔ اچانک ٹرک ایک جھٹکے سے رک گیا۔ سڑک میں سوار تمام لوگوں کی نظریں سامنے سڑک پر مرکوز ہوگئیں۔

''یہ کیا ہے؟''۔ طارق کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ سڑک کے درمیان کافی بڑا شگاف تھا جس کے اوپر سے ٹرک گزارنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا۔

''اب کیا کریں؟'' ٹرک ڈرائیور آرمی کے جوان نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔ تمام لوگ ٹرک سے اتر گئے۔ امدادی کارکنوں اور فوجیوں نے پہاڑوں کے نیچے پڑے ہوئے بڑے چھوٹے پتھر اٹھا اٹھا کر شگاف میں ڈالنا شروع کر دئے تا کہ وہ شگاف بھر جائے تقریباً ایک گھنٹے کی شدید محنت کے بعد وہ شگاف پر ہو گیا چند ایک

نوجوانوں نے ٹرک میں پڑا ہوا ایک خیمہ اٹھایا اور شگاف پر بچھا دیا تا کہ ٹرک آسانی سے شگاف پر سے گزر جائے۔ یہ ترکیب کامیاب ہوئی یعنی ٹرک آسانی سے اس پر سے گزر گیا تو سب نے سکھ کا سانس لیا تقریباً تین گھنٹے بعد وہ مظفر آباد کے قریب پہنچ گئے۔ فضاء میں گڑ گڑاہٹ کی آواز سنائی دی تو طارق نے اوپر دیکھا، اسے نیٹو کے دو ہیلی کاپٹرز فضاء میں بلند ہوتے نظر آئے۔ مظفر آباد شہر سے دور کسی پہاڑ کی اونچی چوٹی پر بنے بیس سے ان ہیلی کاپڑ نے پرواز کی تھی جیسے ہی ٹرک شہر میں داخل ہوا، منظر ہی بدل گیا تھا کوہالہ سرنگ روڈ پر پورا پہاڑ آگیا تھا، نئی بنی ہوئی سڑک غائب تھی، عباس میڈیکل سائنسز اور اسٹیٹ بینک کی عمارت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا البتہ آرمی کے بیرکس، سنگم ہوٹل، نیلم ہوٹل، مدینہ مارکیٹ، سینٹرل جیل کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ پولیس چوکی زمین میں ہی دفن ہوگئی تھی، سرکاری عمارتیں اور وزیر اعظم ہاؤس تباہی کا منہ بولتا ثبوت تھے۔ مدینہ مارکیٹ جولاری اڈے کے قریب تھی، طارق کا خاندان اس مارکیٹ سے اونچائی پر بنے مکان میں آباد تھا۔ طارق تیزی سے اتر گیا اور اپنے مکان کے طرف چل دیا وہاں کچھ بھی نہیں تھا، پہاڑی تو دہ مکان کو لیتا ہوا مدینہ مارکیٹ کے اندر دھنس گیا تھا، اسے دور کھڑے اس کے چچا یعنی اس کے سر نظر آئے۔ وہ دوڑ کر ان کے پاس پہنچ گیا۔

”چاچا جی! یہ کیا ہو گیا گھر والے کیسے ہیں کچھ خبر بھی ہے؟“ اس نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات کر ڈالے۔

”نہیں پتر! کچھ بھی نہیں بچا۔ تمہارے تمام گھر والے میری بیٹی سلمیٰ سمیت سب ہی اللہ کو پیارے ہو گئے ابھی دو دن پہلے ان کی لاشیں ملبے سے نکال کر دفنا دیں گئی ہیں“ اس کے چچا نے بمشکل روتے ہوئے جواب دیا۔ اتنی بڑی خبر نے طارق کے اوسان خطا کر دیئے، وہ صدمے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا۔ اس کے چاچا نے اسے قریبی ہسپتال پہنچایا۔ اس کے بعد وہ اسے اپنے گھر اپر چھتر لے گئے۔ اس علاقے میں مکانوں اور بنگلوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اب بھی وہ رہنے کے قابل تھے۔

دو دن تک طارق کو اپنا ہوش نہیں رہا۔ اس کا سب کچھ لٹ چکا تھا۔ ماں، باپ، بھائی، بہن اور بیوی، ان میں سے کوئی بھی نہیں بچا تھا جو اس کا دکھ بانٹ سکتا۔ چاچا اور چاچی بظاہر یہ رشتے میں تو قریبی تھے مگر اس کا اپنا کوئی نہ تھا۔ خاندان والوں کے ساتھ ساتھ گھر اور گھر کی تمام چیزیں تباہ و برباد ہو چکی تھیں۔ اس کے والدین اور خود

اس کی جمع شدہ پونجی سب مٹی میں مل چکی تھی۔اب اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں رہا تھا۔کس کے لئے جئے اور کیوں جئے؟ یہ سوالات اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے،اسے دنیا سے نفرت سی ہونے لگی۔وہ سوچنے لگا کہ لوگ اس دنیا سے کتنی محبت کرتے ہیں اور بلاوجہ کرتے ہیں جبکہ پل بھر کا کوئی بھروسہ نہیں آنا فانا سب کچھ چھن جاتا ہے،اسے یاد آنے لگا کہ اس کے ابو نے برسوں محنت کی اور مکان بنایا،تھوڑا تھوڑا کرتے کرتے بھی سات سالوں میں مکان مکمل ہوا تھا یوں برسوں کی جدوجہد لمحوں میں ملیامیٹ ہوگئی۔اس نے سوچا اب ایسی فانی دنیا کے لئے کون محنت کرے اور اس سے کیوں دل لگائے۔بقول شاعر''سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں''۔

چار پانچ دن کے بعد جب طارق کی حالت سنبھلی تو وہ اپر چھتر سے نکل کر اپنے مکان کے ملبے کی طرف گیا ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔تمام لوگ اپنے اپنے مکانوں کے ملبوں سے اپنے پیاروں کی لاشیں حاصل کرنے اور زخمیوں کو نکالنے میں سرگردان تھے۔کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ ملبہ ہٹانے میں مدد دیتی۔پوری پوری عمارتوں کا ملبہ ہٹانا آسان نہیں تھا پھر بھی لوگ ایک دوسرے کی مدد کرنے سے قاصر تھے کیونکہ یہ سانحہ کسی ایک ساتھ پیش نہیں آیا تھا بلکہ پورا شہر ہی کھنڈر بنا ہوا تھا۔سب کو اپنی اپنی پڑی تھی،سر چھپانے کی جگہ نہیں تھی۔ٹی وی سے بار بار خیموں اور دوائیوں کے لئے اپیلیں کی جارہی تھیں۔بچے،بوڑھے،خواتین اور زخمی کھلے آسمان تلے بے یارو مددگار پڑے تھے۔مختلف تنظیموں سے تعلق رکھنے والے کارکنان پورے شہر میں بھاگ دوڑ کر رہے تھے جہاں جیسے بھی بن پڑا وہ اپنی خدمات انجام دے رہے تھے۔کراچی سے لے کر خیبر تک مختلف ذرائع سے امداد آرہی تھیں۔

سانحے کے آٹھ روز بعد بھی مرنے والوں اور زخمیوں کی تعداد کا اندازہ نہیں ہورہا تھا۔پہاڑوں کے اوپر بنی بستیوں اور گاؤں کے لوگوں کی حالت اور بھی ابتر تھی کیونکہ پہاڑوں سے لاشیں اتارنا اور زخمیوں کو لے آنا جوئے شیر لانے سے زیادہ مشکل تھا۔ستم ظریفی یہ ہوئی کہ پہاڑوں پر برف پڑنے لگی جس کے سبب ٹھنڈی اور یخ بستہ ہواؤں نے متاثرین کا جینا اور بھی دوبھر کردیا۔ان کے پاس گرم کپڑے،کمبل اور خیمے نہیں تھے جو انہیں سردی سے محفوظ رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے۔مختلف علاقوں میں آٹھ دن بعد بھی امداد نہ پہنچ سکی جس کے

سبب ہلاک ہونے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ زخمیوں کے زخموں میں انفیکشن ہونے کی وجہ سے اعضاء سڑنے لگے۔

طارق پیدل چلتا ہوا دریائے جہلم کے کنارے پہنچا وہاں کئی خیمہ بستیاں نظر آئیں۔ یہ خیمہ بستیاں جماعت اسلامی کی تھیں، جماعت کے اوپر بنے خیموں میں آپریشن چل رہا تھا بیک وقت کئی آپریشن کیے جا رہے تھے۔ جماعت کے کئی ڈاکٹر پیدل چل کر مظفر آباد پہنچے تھے کیونکہ راستے بند تھے۔ ان کا فری میڈیکل کیمپ تھا جہاں ہر قسم کے مریضوں کا علاج کیا جا رہا تھا۔ اس کے علاوہ سیور فوڈ راولپنڈی والے بھی وہاں موجود تھے، کھانے کی دیگیں پک رہی تھیں۔ یہ کھانا جماعت اسلامی والوں اور سیور فوڈ والوں کے اشتراک سے روزانہ دس ہزار لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا یہی کھانا اوپر پہاڑوں پر سوزوکیوں سے بھی بھیجا جا رہا تھا۔ کھانا پکانے اور تقسیم کرنے کا ذمہ مجاہدین نے اٹھا رکھا تھا۔ وہ پرچیاں بنا بنا کر لوگوں کو کھانا تقسیم کرنے میں مدد دے رہے تھے۔ طارق نے دیکھا کہ ورلڈ فوڈ پروگرام کے تحت لوگوں میں امدادی سامان بھی تقسیم کیا گیا۔ طارق نے میڈیکل کیمپ میں قدم رکھا تو وہاں او پی ڈی چل رہی تھی۔ مردوں کیلئے مرد اور خواتین کے لئے خاتون ڈاکٹرز مریضوں کی خدمت سرانجام دینے میں مصروف تھیں۔ یہ بہت بڑا کیمپ تھا جس میں درجنوں بستروں پر مریض موجود تھے۔ جماعت کے زیادہ تر ڈاکٹر نہ صرف کراچی، مانسہرہ اور پنڈی سے آئے ہوئے تھے بلکہ بحرین، کینڈا اور امریکہ سے بھی جذبہ انسانی کے تحت یہاں موجود تھے۔ ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے طارق بہت متاثر ہوا۔ اس نے دل میں سوچا زندگی وہ نہیں جو اس نے گزاری تھی بلکہ زندگی یہ ہے جو یہ تنظیمیں اور کارکنان گزار رہے ہیں نہ انہیں اچھے مکانات اور رہائش کی فکر ہے اور نہ ہی دیگر دنیا دکھاوے سے کوئی غرض ہے جو ملا کھا لیا جہاں جگہ ملی سو گئے۔
”نہ فکر فردا نہ فکر امروز“۔

میڈیکل کیمپ سے نکل کر وہ دربار سہیلی سرکار آیا، تو دیکھا کہ وہاں ایم کیو ایم والے بھی موجود ہیں۔ ان میں سے راشد نامی ایک لڑکا طارق کا جاننے والا نکل آیا۔ اس نے طارق سے خیر خیریت پوچھی جب اسے پتہ چلا کہ طارق کا پورا خاندان اس سانحے کی نذر ہو گیا ہے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ راشد نے طارق کو کافی دلاسے دیئے۔ طارق نے دیکھا کہ ایم کیو ایم نے دربار سہیلی سرکار کے حجروں کو امدادی اور میڈیکل کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا

اس کیمپ سے امدادی سامان پہاڑوں پر رہنے والوں میں تقسیم کیا جارہا تھا کیونکہ وہ نیچے آ کر نہیں لے سکتے تھے۔ فی الحال سرجن اور آپریشن تھیٹر نہ ہونے کی وجہ سے آپریشن تو نہیں کیے جارہے تھے ہاں البتہ زخمیوں کو طبی امداد دی جارہی تھی کیونکہ او پی ڈی میں ڈاکٹر موجود تھے۔ اس میڈیکل کیمپ کی نگرانی ایم کیو ایم کے ایم این اے دیو داس کررہے تھے پتا چلا کہ یہاں انہوں نے ۱۰ اکتوبر سے ہی کام شروع کر دیا تھا۔ ان کے مزید کارکن لوگوں کی طبی اور مالی امداد کے لئے کراچی سے مظفر آباد کے لئے روانہ ہو چکے ہیں۔ ایم کیو ایم سندھ کی ایک بڑی منظم اور اہم جماعت ہے مگر اس کا دائرہ کار سندھ کی حد تک ہونے کی وجہ سے ان کو اب تک بڑے پیمانے پر کام کرنے کا موقع نہ مل سکا چونکہ دیگر جماعتیں قیام پاکستان سے ہی اپنے فرائض انجام دیتی رہی ہیں، اس لئے ان کے دفاتر اور لوگ تمام صوبوں میں موجود ہیں جنہوں نے فوراً ہی وسیع پیمانے پر اپنے کام کا آغاز کر دیا تھا ہاں البتہ کراچی سے سب سے زیادہ امداد ایم کیو ایم اکٹھا کرتی رہی، سینکڑوں نوجوانوں نے اپنے نام لکھوانا شروع کر دیئے تھے کہ وہ کشمیر اور دیگر علاقوں میں اپنے فرائض انجام دینا چاہتے ہیں۔

اس سے اگلے دن طارق پھر دریائے جہلم کے کنارے خیمہ بستیوں کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں کئی دیگر تنظیموں کے کیمپ بھی نظر آئے یعنی سیلانی ویلفیئر، عبدالرشید ٹرسٹ، عالمگیر ویلفیئر کے علاوہ دیگر کئی تنظیموں کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ تمام کیمپوں پر خیموں۔ کمبلوں کے علاوہ راشن کا سامان بھی تقسیم کیا جارہا تھا۔ سیور فوڈ والے پیکٹوں میں کھانا تقسیم کررہے تھے۔ طارق نے ان سے ایک پیکٹ لے لیا، یہ چنا پلاؤ تھا۔ اس نے کھانا کھایا، یہ کھانا اچھا صاف ستھرا پکا ہوا تھا، پتا چلا کہ ان کے عملے کے تمام لوگوں کے علاوہ میڈیکل کیمپ میں موجود تمام ڈاکٹرز بھی یہی کھانا استعمال کرتے ہیں۔ یہ کھانا دوپہر ایک بجے سے رات آٹھ بجے تک تقسیم کیا جاتا ہے۔

طارق کھانے سے فارغ ہونے کے بعد خیمہ بستیوں کی طرف چل دیا یہاں خیموں میں مقیم خواتین کچھ باہر بیٹھی ہوئی تھیں کچھ پریشانی کے عالم میں ہر آنے جانے والوں کو دیکھ رہی تھیں۔ یہ تمام خواتین دکھی تھیں، کسی کا شوہر، کسی کے بچے، کسی کے ماں باپ اس سانحے میں ختم ہو چکے تھے۔ ایک تیرہ سال کی بہت خوبصورت سی بچی اپنے چچا کے ساتھ رہ رہی تھی کیونکہ اس کے خاندان کے تمام لوگ ہلاک ہو چکے تھے۔ چچا کے ساتھ ان کا ایک

جواں سال بیٹا بھی تھا جبکہ چچی زلزلے میں جان گنوا بیٹھی تھی۔ طارق نے اس طرح کے کئی خاندان دیکھے جس میں جوان لڑکیاں بے یارو مددگار ہو گئی تھیں۔ اس نے سوچا کہ جہاں اس زلزلے سے ہزاروں افراد ہلاک ہوئے وہیں زخمیوں کی تعداد بھی ہلاک ہونے والوں سے دوگنی سے تگنی تھی۔ جوان لڑکیوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ خیمہ بستیوں میں اکیلی لڑکیوں کیلئے کس طرح کا انتظام ہوسکتا ہے؟ معاشرتی برائیاں بھی جنم لے سکتی ہیں، بہت سارے سوالات طارق کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ بے گھر ہونیوالے زیادہ تر لوگوں کی تعداد کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی یوں اچانک شہر اور گھر اجڑنے کے باعث وہ سب ہی ذہنی اور نفسیاتی دباؤ کا شکار تھے۔ ایک صدمے کی صورت تھی خصوصاً خواتین خود کو غیر محفوظ سمجھنے لگی تھیں۔۔ قطار لگا کر کھانے پینے اور دیگر امدادی اشیاء لیتے ہوئے زیادہ تر خواتین و حضرات کو جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ان کی زندگی اتنی کڑی آزمائش سے بھی گزرے گی۔ آج وہ مرنے والوں کو خوش نصیب گردان رہے تھے کہ وہ عزت سے مر گئے اور...... زندہ رہنے والوں کی عزت نفس کتنی مجروح ہو رہی ہے اس کا اندازہ انہیں اب ہو رہا تھا۔ بے بسی، مجبوری اور لاچاری نے لوگوں کے آنسوؤں کو خشک کر دیا تھا۔ کسی دکھ اور تکلیف میں اگر کوئی روتا ہے تو دوسرا اسے چپ کرانے کی کوشش کرتا ہے مگر یہاں تو پورے کا پورا شہر اور اس کے باسی دکھ، تکلیف اور اذیت میں مبتلا تھے۔ کون کسے تسلی دیتا؟ کون کسے چپ کراتا۔۔ یہاں تو خود ہی رو کر خود آنسوؤں کو پینا پڑ رہا تھا۔ لاشوں کو قبرستان لے جا کر دفنانے والا بھی مشکل ہی سے مل رہا تھا۔ بعض مقامات پر لوگوں نے اپنے بچھڑ جانے والوں کو خود ہی نے قبر کھود کر دفنایا تھا۔ بالاکوٹ کے مقام پر کچھ خواتین جو اس سانحے میں بچ گئی تھیں انہوں نے قبر کھود کر اپنے عزیزوں کو دفن کر دیا تھا۔ یہ کیسی قیامت تھی؟ طارق کے نظریات و خیالات بدلنے لگے حالانکہ وہ تیس سالہ خوش شکل۔ پڑھا لکھا اور ہنس مکھ نوجوان تھا۔ اپنی روشن خیالی اور ترقی پسندی کی بناء پر وہ اپنے حلقے میں مقبول تھا، اس کے دفتر کے لوگ بھی اس کی بہت عزت کرتے تھے۔

اس سانحے نے طارق کی خوش مزاجی کو چھین لیا تھا وہ زیادہ تر خاموش رہتا۔ چاچا اور چاچی کے سوالات کے مختصر جواب دیتا۔ بات چیت بھی کم ہی کرتا بس زیادہ تر وقت وہ روزہ، نماز اور تلاوت میں گزارتا۔ فراغت کے اوقات میں وہ مظفر آباد کے اطراف میں گھومتا پھرتا شہر کا جائزہ لیتا رہتا یا پھر مختلف لوگوں سے زلزلے اور اس

کے بعد کے حالات معلوم کرنا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بنی حافظ اور چکار کے درمیان دو پہاڑ ٹکرا گئے تھے، ان پہاڑوں کے درمیان دو بڑے گاؤں کی دو ہزار کی آبادی زندہ دفن ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ مظفر آباد میں جس وقت زلزلہ آیا اس وقت ایک مسافر بس کوہالا سرنگ روڈ سے گزر رہی تھی کہ یکدم سے پہاڑ اس بس پر آ گیا اس طرح تمام مسافر بس سمیت اس پہاڑ کے نیچے دب گئے جنہیں ابھی تک نہیں نکالا جا سکا اس لئے کہ پہاڑ ہٹانا لوگوں کے بس کی بات نہ تھی۔

طارق کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر نیلم ہوٹل تھا، یہ ہوٹل چار منزلہ تھا۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد طارق نیلم ہوٹل کی طرف چل دیا۔ اس چار منزلہ ہوٹل کی تین منزلیں زمین کے اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اس کے معلوم کرنے پر پتا چلا کہ اب تک 44 جوڑوں کی لاشیں نکالی جا چکی ہیں باقی ابھی تک اندر موجود ہیں کیونکہ انسانی اعضاء کے سڑنے کی بو فضاء میں موجود تھی۔ اس ہوٹل کا زیادہ تر حصہ دریائے جہلم میں گرا تھا اور زیادہ تر لاشیں اسی دریا سے نکالی گئی تھیں جسے میڈیا نے لکھا تھا کہ دریائے جہلم کا پانی سرخ ہو گیا تھا۔ طارق نے غور کرنا شروع کیا کہ زلزلہ ہفتے کی صبح آیا تھا جبکہ تمام لوگ روزے سے تھے تو پھر یہ 44 جوڑے اس ہوٹل میں کیا کر رہے تھے۔ اسے یہ بھی پتہ چلا کہ جب لاشیں دریا سے نکالی گئی اس وقت اس میں سے زیادہ تر لاشیں لباس سے عاری تھیں۔ یہ جاننے کے بعد اس نے توبہ استغفار پڑھنا شروع کیا۔

''یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے'' اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا اور وہاں سے ہٹ کر اپر چھتر کی طرف جانے لگا تو راستے میں اسے چند آرمی کے جوان جاتے دکھائی دیئے جو آپس میں اسی نیلم ہوٹل سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے گزر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے انتہائی نفرت سے ہوٹل کے ملبے کی طرف دیکھا۔ طارق نے ان کی طرف غور سے دیکھا وہ آرمی کے سپاہی تھے جن کی بڑی اور گھنی داڑھیوں نے ان کے چہرے کو پرنور بنا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ ان کے ماتھے پر سجدے کے نشانات نمایاں تھے۔ پہلی بار طارق نے ان آرمی کے نوجوانوں کو بڑی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا۔ اس نے سوچا کہ ایسے ہی مرد مومن لوگوں کی وجہ سے یہ ملک اب تک چل رہا ہے۔

''طارق کہاں جا رہے ہو؟'' شفیق نے بلند آواز سے پوچھا۔

''کہاں جاؤں گا۔ نہ گھر رہا نہ گھر والے رہے۔ چاچا کے گھر جا رہا ہوں''۔ اس نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا شفیق اس کے اسکول کے زمانے کا دوست تھا۔

''یار! یہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ کیا کریں قدرت کے آگے کسی کی چلتی نہیں ہے۔ میری بھی ماں اور ایک بچی اس زلزلے نے چھین لی'' شفیق نے رنجیدہ ہوتے ہوئے اپنے متعلق بتایا۔ شفیق مظفرآباد سے 25 میل دور مالسی میں رہتا تھا، یہ اتفاق تھا کہ زلزلے کے وقت وہ مالسی میں نہیں تھا۔ اب بھی مالسی جانے والے تمام راستے بند تھے، وہ اپنے بچے کھچے خاندان کے ساتھ میلوں پیدل سفر کر کے مظفرآباد لوئر چھتر کے علاقے میں اپنے ایک عزیز کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ شفیق کے ساتھ تھوڑا وقت گزارنے کے بعد طارق واپس اپنے چچا کے گھر روانہ ہو گیا۔ افطاری کرنے کے بعد طارق دوبارہ اپنے مکان کے ملبے کی طرف آیا وہاں لوگوں نے بتایا کہ اسے اپنے مکان کے ملبے کے قریب ہی رہنا چاہیئے تا کہ مظفرآباد سے باہر کے لوگ آ کر اس کے مکان کو مس یوز نہ کریں، بچا کھچا سامان جو ملبے تلے دبا ہوا تھا اسے چوری نہ کر سکیں۔ طارق نے ایم کیو ایم کے کیمپ سے ایک خیمہ لیا اور اسے اپنے مکان کے ملبے کے ساتھ نصب کیا پھر دیگر ضروری سامان چاچا کے پاس سے لا کر خیمہ میں رکھ دیا۔ وہ روزانہ سحری چاچا کے ہاں سے کر کے آتا پھر خیمے میں لیٹا رہتا۔ نماز قریبی نئی قائم کردہ عارضی مسجد میں ادا کرتا اور تلاوت میں مصروف ہو جاتا۔ دن کے اوقات میں شہر کی صورتحال جاننے کیلئے مختلف کیمپوں میں چکر لگاتا رہتا۔

اب وہ کافی ایکٹیو ہو گیا تھا اکثر وہ مجاہدین اور آرمی کے جوانوں کے ساتھ مظفرآباد کے اوپری علاقوں میں راشن اور خیمے تقسیم کرنے کیلئے نکل جاتا۔ ایک دوبار وہ ایم کیو ایم کی گشتی میڈیکل ٹیم کے ساتھ گڑھی ڈوپٹہ بھی گیا تھا وہاں کی حالت بھی بہت ابتر تھی۔ اس علاقے میں کئی گاؤں ایسے تھے جہاں اتنے دن گزر جانے کے باوجود کسی بھی قسم کی کوئی امداد نہیں پہنچی تھی۔ ہزاروں لوگ ایسے تھے جنہوں نے مکانات کھنڈر ہونے کے باوجود اپنی جگہ محض اس لئے نہیں چھوڑی تھی کہ حکومت ان کے امدادی چیک کہیں کسی اور کو نہ دے دیں۔ اسی خوف اور خدشے نے لوگوں کو کہیں اور جانے نہیں دیا جو جہاں تھے وہ وہیں رہے۔ اس وجہ سے ان کے زخم ناسور بننے لگے تھے۔ ملک اور بیرون ملک سے روپے اور ڈالر آ رہے تھے، حکومت ان روپوں کو ٹرانسپیرنٹ طریقے سے

لوگوں میں تقسیم کرنا چاہ رہی تھی۔ مجاہدین اور آرمی دونوں مشترکہ طور پر چیکوں کو تقسیم کر رہے تھے مگر متاثرین اتنے زیادہ تھے کہ سب ہی کو بیک وقت اتنی بڑی رقم تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں تھا لہٰذا لوگوں میں بددلی اور غلط فہمی بڑھنے لگی تھی۔ دبے دبے لفظوں میں حکومت کی نیت پر شک کیا جا رہا تھا حالانکہ زلزلے کے بعد مانسہرہ سے لے کر مظفر آباد تک پولیس کا محکمہ ناپید تھا۔ ان تمام علاقوں کا کنٹرول آرمی کے ہاتھوں میں تھا اور وہ جانفشانی سے اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ کہیں راستے صاف کرتے نظر آتے کہیں لوگوں میں چیک تقسیم کرتے دکھائی دیتے تو کہیں پر زخمیوں کو لانے لے جانے کا کام سرانجام دیتے رہے جہاں تک بین الاقوامی تنظیموں کا تعلق تھا، ان کے خیمے مظفر آباد، بالاکوٹ اور مانسہرہ میں موجود تھے جس میں یونیسیف، یو۔ این۔ سی۔ آر۔ ایچ۔ آر ڈی ایس، ٹی ڈی ایچ وغیرہ پیش پیش تھے۔ اس کے علاوہ مانسہرہ ٹاؤن شپ میں نواز شریف بستی میں تھی غرضیکہ مانسہرہ، بالاکوٹ، باغ، گڑھی حبیب اللہ، گڑھی ڈوپٹہ اور مظفر آباد تک خیمے ہی خیمے تھے غیر ملکی بھی ان ہی خیموں میں مقیم تھے۔

ایک دن طارق آرمی کی جیپ میں بالاکوٹ کے مقام ست بنی پہنچا۔ یہ مقام زمین سے ساڑھے چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے جب وہ پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہاں بجلی نہیں تھی۔ روشنی کا انتظام جنریٹر سے کیا گیا تھا۔ اس علاقے کو میجر شوکت چوہدری ڈیل کر رہے تھے ہاں البتہ یہاں نقصان زیادہ نہیں ہوا تھا۔

''یار! یہ آرمی والے کتنے جیدار ہوتے ہیں اتنے دشوار گزار راستے سے کتنی جلدی اوپر تک پہنچ جاتے ہیں، میری تو سانس ہی رک گئی تھی''۔ طارق نے جماعت الدعوۃ کے کارکن سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''بھئی! ان کا کام ہی خطروں سے کھیل کر اپنے وطن کا دفاع کرنا ہے، انہیں ان تمام دشواریوں کی تربیت دی جاتی ہے جب ہی تو مشکل وقت میں ان ہی کو طلب کیا جاتا ہے''۔ کارکن نے اپنا جملہ پورا کیا۔

''ایک بات پوچھوں'' طارق نے اس کارکن سے سرگوشی کے انداز میں سوال کیا

''ہاں! پوچھو''۔ اس نے اسی انداز میں جواب دیا۔

''میں سارا دن نیٹو کے دو ہیلی کاپٹروں کو پہاڑوں کی سب سے اونچی چوٹی پر سے پرواز کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ ان ہی دو ہیلی کاپٹروں کو میں نے مانسہرہ' بالاکوٹ سے مظفر آباد تک تھوڑے تھوڑے وقفہ سے محو پرواز

دیکھا ہے۔ انہیں امدادی سامان پھینکتے یا گراتے کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی دیگر لوگوں نے دیکھا ہے آخر یہ کیوں اتنے چکر لگاتے رہتے ہیں؟ ان کا مقصد کیا ہے؟ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ہم سب کی نگرانی کر رہے ہوں جبکہ ہمارے فوجی ان کی نگرانی کرتے دکھائی دیتے ہیں تاکہ ان کی حفاظت ہوسکے اگر نیٹو کی افواج کو اپنی جانوں کا اتنا ہی ڈر ہے تو یہ اسلام آباد میں ہی رہیں، یہاں کیوں چکر لگاتے رہتے ہیں؟'' طارق نے اپنے خدشے کا اظہار کرتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''مجھے نہیں معلوم'' کارکن نے کندھے اچکاتے ہوئے جواب دیا۔

''طارق نے محسوس کیا کہ اسے بہت کچھ معلوم ہے مگر وہ بتانا نہیں چاہتا کیونکہ اس کے آنکھوں کی چمک اور چہرے کے تاثرات اس کے جواب کی نفی کر رہے تھے۔ طارق خاموش ہو گیا۔

دن گزرتے رہے اسی دوران لائن آف کنٹرول پانچ مقامات سے کھول دی گئی بظاہر جواز یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر کے لوگ اپنے آزاد کشمیر کے رشتہ داروں کی مدد کر سکیں۔ وہ کیا مدد کرتے یہاں کچھ بچا ہی نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ تو اللہ کو پیارے ہو گئے تھے اور جو زخمی تھے وہ مردوں سے بدتر تھے۔ اب بھی زیادہ تر تعداد ملبوں میں دبی ہوئی تھی وہاں کے کشمیری اپنے ساتھ کیا بیلچے اور کدالیں لے آئے تھے کیونکہ اس وقت انہیں ایسی ہی چیزوں کی ضرورت تھی، تاکہ ملبہ صاف کر کے لاشیں اور زخمیوں کو نکال سکیں۔ لائن آف کنٹرول کھلوانے جانے کی بات میں کوئی وزن نہیں تھا۔ کیا پتہ آنے والے واقعی کشمیری تھے یا بھیس بدل کر ہماری تباہی اور بربادی کو دیکھنا مقصود تھا کہ کتنے برسوں تک کشمیری اس سانحے سے نکل کر ان کے مد مقابل آسکتے ہیں کیونکہ یہود اور ہنود پر کبھی بھی بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

طارق کو مظفر آباد آئے ہوئے تقریباً بیس دن ہو چکے تھے۔ اسلام آباد سے دو تین بار اس کے دوست اقبال کا فون آچکا تھا۔ اس کے علاوہ دفتر سے اس کے کئی دوستوں اور ساتھ کام کرنیوالوں کے بھی فون آچکے تھے۔ وہ لوگ یہ جاننا چاہتے تھے کہ طارق کب تک واپس دفتر آئے گا۔ طارق نے ابھی تک انہیں تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا کہ آیا وہ کب تک اسلام آباد آنے کا ارادہ کر رہا ہے۔

دوپہر کے دو بجے کا وقت تھا اچانک بہت زور کی گڑگڑاہٹ اور دھماکوں کی آوازیں آنا شروع ہوئیں۔ طارق

اپنے خیمے میں لیٹ کر اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ دھماکوں کی آوازوں سے وہ گھبرا کے باہر نکلا، اس نے دیکھا کہ دیگر لوگ بھی پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ چند لمحوں بعد زمین لرزنا شروع ہوگئی۔ مدینہ مارکیٹ کے اطرف میں چھوٹی موٹی دکانیں اور مکانوں کی جو دیواریں ٹوٹتے پھوٹتے انداز میں کھڑی تھیں وہ تیزی سے زمین بوس ہونے لگی تھیں، طارق نے دور پہاڑوں کی طرف دیکھا وہاں دھواں سا اٹھ رہا تھا یعنی لینڈ سلائنڈنگ ہو رہی تھی۔ پہاڑوں پر بنے بچے کھچے مکانات بھی تیزی سے نیچے سرک رہے تھے۔ فضا میں دھواں ہی دھواں تھا۔ اب طارق کو ڈر محسوس نہیں ہو رہا تھا کیونکہ وہ بیس دن سے مظفر آباد سمیت مختلف علاقوں کو دیکھ چکا تھا۔ لوگوں کی تکلیف، مشکلات ان کی لاچاری، بے چارگی ان تمام کے بعد اس کا دل مضبوط ہو گیا تھا خاص طور پر اس کے اپنے تمام لوگ لمحوں میں اس سے جدا ہو گئے تھے۔ اب وہ کس کی فکر کرتا کس کے لئے پریشان ہوتا۔

زمین کی لرزش تقریباً پانچ منٹ تک کبھی ہلکی اور کبھی تیز ہونے کے بعد ختم ہوگئی۔ تمام لوگ اپنے باقی ماندہ ساز و سامان کی فکر میں واپس اپنے ٹھکانوں پر آ رہے تھے۔

"چاچا جی! زلزلوں سے پہلے یہ دھماکے کیسے تھے؟ میں نے کبھی نہیں سنا کہ زلزلوں سے پہلے کوئی دھماکوں کی آوازیں بھی آتی ہیں اکثر ٹی وی پر کئی فلمیں دیکھی ہیں پھر سونامی کا واقعہ۔۔۔ دنیا کی تاریخ کا بدترین سانحہ تھا یکدم زمین لرزی اور سب کچھ آناً فاناً ختم ہو گیا تھا۔ آفٹر شاک بھی آٹھ دن تک آتے رہے تھے مگر ہمارے یہاں آنے والے زلزلے کے بعد اتنی مدت گزرنے کے باوجود آفٹر شاکس ختم ہونے پر ہی نہیں آتے جبکہ آفٹر شاکس ہلکے پھلکے ہوتے ہیں جبکہ ہمارے آفٹر شاکس 6.1 اور 5 ایکٹرا اسکیل کے باقاعدہ زلزلے ہوتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس سلسلے میں آپ کچھ بتا سکتے ہیں"۔ طارق نے تجسس بھرے انداز میں اپنے چاچا سے تفصیل جاننے کی کوشش کی۔

"پتر! جس وقت زلزلہ آیا میں اس وقت چھت پر کھڑا گاڑی کے کشن آلگنی سے اتار رہا تھا اچانک میری نظر سامنے پہاڑوں کی جانب اٹھ گئی، میں نے دیکھا کہ آسمان کا رنگ سرخ ہو گیا ہے پھر دھواں سا چھا گیا پھر تیز تیز ہوا چلنے لگی میں سمجھا کہ شاید کہیں کوئی تخریب کاری ہوئی ہے، میں تمہاری چچی کو بتانے کے لئے تیزی سے

زینے سے اترنے لگا کہ یکدم زینے سمیت پورا مکان ہلنے لگا، میں چیخا کہ زلزلہ آرہا ہے۔ تمہاری چچی تیزی سے زینے کی طرف آئی مگر اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پورے محلے میں کسی بھی مکان کو نقصان نہیں پہنچا ہاں! البتہ پورا شہر اجڑ چکا تھا، بھائی صاحب کی پوری فیملی ہمیں چھوڑ گئی تھی''۔ یہ واقعہ بتاتے بتاتے اس کے چاچا کی آنکھیں بھر آئیں۔ طارق بھی سنجیدہ ہوگیا۔

عشاء کی نماز پڑھنے کے بعد طارق نے چاچا کے گھر کھانا کھایا پھر اپنے خیمے کی جانب روانہ ہوگیا۔ اس کے خیمے کے برابر ایک 80 سالہ بوڑھا ایک چھوٹے سے خیمے میں مقیم تھا۔ اس کا تمام خاندان اس سانحے میں ختم ہو چکا تھا۔

''داداجی! کیا حال ہے؟ طبیعت ٹھیک ہے'' طارق نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے خیریت دریافت کی۔

''ہاں پتر! اب تک تو زندہ ہوں۔ اس عمر میں تو مجھے جانا چاہیے تھا مگر میرے بچے مجھ سے پہلے چلے گئے''۔ بوڑھے کے آنسو اس کی داڑھی پر بہنے لگے۔ طارق نے انہیں تسلی دی تھوڑی دیر تک آنسو بہانے کے بعد بوڑھے کے دل کا غبار نکل گیا۔ اس کے بعد وہ آج آنے والے زلزلے پر تبصرہ کرنے لگے۔

''داداجی یہ بتایئے کہ آپ کی زندگی میں یہاں کتنے زلزلے آچکے ہیں؟ اس جیسا بھی زلزلہ کبھی آیا تھا''۔ طارق نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''نہیں پتر! میری زندگی میں اور میرے باپ دادا کی زندگی میں اتنا خطرناک زلزلہ کبھی نہیں آیا ہاں کبھی کبھار ہلکے پھلکے جھٹکے محسوس ہوئے تھے جس کو ہم نے کبھی اہمیت نہیں دی'' بوڑھے بابا نے اپنی بات مکمل کی۔

''اچھا یہ بتایئے کبھی ان جھٹکوں سے پہلے کسی دھماکے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں'' طارق نے اپنی معلومات کے لئے پوچھا۔

''نہیں کبھی نہیں، زلزلے سے پہلے کبھی کسی کو پتہ نہیں چلتا کہ زلزلہ آنے والا ہے اگر دھماکوں سے زلزلے کی آمد کا اندازہ ہوتا تو ہزاروں لوگ ہلاک نہ ہوتے۔ ہم نے اپنے بڑوں سے بھی کبھی ایسی بات نہیں سنی۔ میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلا زلزلہ دیکھا اور محسوس کیا کہ زلزلے سے پہلے آسمان سرخی مائل اور دھواں دھار پھر تیز ٹھنڈی ہوائیں، اس کے بعد زمین کی لرزش۔۔۔ یہ کیا معاملہ ہے سمجھ سے باہر ہے''۔ بوڑھے بابا نے تشویش

بھرے انداز میں جواب دیا۔ اس جواب کے بعد طارق بھی پریشان سا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں مختلف سوالات گردش کرتے رہے جن کے جوابات معلوم کرنا ضروری تھا۔ طارق روزانہ سحری اور افطاری چاچا کے گھر ہی پر کیا کرتا تھا۔ رمضان کے آخری عشرے چل رہے تھے۔ عید قریب تھی۔ یہ پہلی عید تھی جو انتہائی سوگوار اور اداس تھی۔ حکومت اور ملک کے عوام نے عید سادگی سے منانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ ملک کے زیادہ تر لوگوں نے عید پر خریداری کرنے کی بجائے وہ رقم زلزلہ متاثرین کے امدادی فنڈ میں جمع کرادی تھی۔ مختلف ملکی اور غیر ملکی چینلز پر زلزلہ متاثرین کے حالات اور واقعات کو دیکھ دیکھ کر ہر فرد اداس اور غمزدہ تھا۔ عید کی خوشی کسی کو بھی نہیں تھی۔

چوبیس رمضان کو طارق نے گڑھی ڈوپٹہ جانے کا فیصلہ کیا، اسے وہاں اپنے ماموں کی خیریت کے لئے جانا تھا۔ خیمے کی نگرانی کا ذمہ دادا جی کو سونپ کر وہ صبح ہی روانہ ہوا۔ گڑھی ڈوپٹہ پہنچ کر اسے مانسہرہ جانے والی ایمبولینس ملی۔ وہ ڈرائیور کو آمادہ کر کے اس میں سوار ہو گیا۔ بہت مشکلوں سے گزرتے ہوئے وہ مانسہرہ پہنچا۔ جماعت اسلامی کا کیمپ ابھی تک وہاں موجود تھا بلکہ اس میں راشن، کپڑوں اور خیموں کا انبار لگا ہوا تھا وہاں پہنچ کر طارق نے اپنی کار تلاش کی جو وہ وہاں چھوڑ کر آیا تھا، کار تو اسے ملی مگر دھول مٹی میں اٹی ہوئی۔۔ کافی محنت کے بعد کار اس قابل ہوئی کہ اس پر سفر کیا جاسکے۔ اس نے مانسہرہ سے پیٹرول ڈلوایا اور خود ڈرائیو کر کے واپس گڑھی ڈوپٹہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں لوگوں کو بہت پریشان حال پایا کیونکہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد مانسہرہ میں موجود تھی، انہیں مظفر آباد اور بالاکوٹ لے جانے کیلئے ٹرک ڈرائیور اور سوزوکی والے منہ مانگے دام طلب کر رہے تھے۔ طارق نے سوچا کہ یہ کیسے بے ضمیر لوگ ہیں جو اس مصیبت کی گھڑی میں بھی پریشان حال اور مجبور لوگوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اب بھی انہیں اللہ کا خوف نہیں۔

واپس آتے ہوئے طارق نے اپنی کار میں تین افراد کو بٹھایا جو بالاکوٹ اپنے رشتہ داروں کی معلومات حاصل کرنے کیلئے جا رہے تھے۔ بالاکوٹ پہنچنے سے پہلے ہی افطاری ہو گئی۔ طارق نے گاڑی میں رکھے کھجور اور پانی سے خود نے بھی افطاری کی اور ان لوگوں کو بھی افطاری کرائی جو اس کے ساتھ سفر کر رہے تھے کیونکہ سردیوں میں پنڈی اور کشمیر کے علاقوں میں افطاری سوا پانچ بجے ہی ہو جاتی ہے۔ شام چھ بجے وہ بالاکوٹ پہنچے۔ طارق نے

ان تین افراد کو بالاکوٹ میں ڈراپ کیا۔ وہ اسے دعائیں دیتے ہوئے اتر گئے۔ بالاکوٹ کی فضاؤں میں ابھی تک انسانی اعضاء کے سڑنے کی بو موجود تھی کیونکہ ملبہ ہٹا نہیں تھا اور ملبہ ہٹانے کا انتظام ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ پورا شہر ہی ملبے کا ڈھیر تھا۔ یہ ملبہ بہت بڑی مشینوں کے ذریعے ہی ہٹ سکتا تھا اور اس کے لئے ٹرکوں کی ضرورت تھی جبکہ ٹرکوں والے لوگوں کو لانے کے پیسے لے کر بھی نخرے کر رہے تھے۔ بے چارے لٹے پٹے لوگ اتنی بھاری رقم اور بلڈوزر کہاں سے لاتے، صبر کے علاوہ کوئی اور چارہ نہ تھا۔ سٹیزن فاؤنڈیشن کراچی نے کئی کنٹینرز بالاکوٹ بھجوائے تھے۔ الخدمت نے ان کنٹینرز کو اندر سے ڈیکوریٹ کر کے آپریشن تھیٹر، واش روم اور کمروں میں تبدیل کر دیا تھا بیرون ملک سے آنے والے سوشل ورکرز اور ڈاکٹرز کو بھی انہوں نے ان کنٹینرز میں ٹھہرایا تھا۔ ان میں گرم اور ٹھنڈے پانی کا بھی انتظام تھا جس کی وجہ سے زخمیوں کے علاج معالجے میں مدد مل رہی تھی چونکہ رات ہو گئی تھی۔ طارق بالاکوٹ میں بنی خیمہ بستی میں قیام کرنے کا فیصلہ کیا یہاں کی خیمہ بستیاں بہت بڑی اور کشادہ بنی ہوئی تھیں جس میں بیک وقت کئی مریض اور امدادی کارکن قیام کر سکتے تھے۔ عشاء کی نماز کے بعد طارق نے ایک خیمے میں کھانا کھایا اور وہیں رات بسر کی۔ اس نے سحری کرنے کے بعد آرام کیا پھر کار سے گڑھی ڈوپٹہ کے لئے روانہ ہوا۔ جس وقت وہ گڑھی ڈوپٹہ پہنچا اس وقت صبح کے نو بجے تھے۔ کافی حد تک دکانیں کھلنے لگی تھیں کیونکہ زندہ رہنے کے لئے کاروبار زندگی بہت ضروری تھا۔ اس نے افطاری کے لئے کچھ کھانے پینے کا سامان یعنی بسکٹ، چپس، پانی کی بوتلیں اور دودھ کے پیکٹ خریدے پھر ان سب سامان کو کار میں رکھا اور گڑھی ڈوپٹہ کے مین بازار سے کار کو گزار کر وہ اندر گاؤں کی طرف مڑا تاکہ وہاں کے حالات دیکھے وہاں جانے پر پتا چلا کہ اوپر کی طرف بنے کئی گاؤں کے راستے اب تک بند ہیں یعنی پیدل سفر کرنا ہی ممکن تھا کسی قسم کی کوئی سواری وہاں نہیں جا سکتی تھی۔ طارق کے ماموں سکندر کافی اوپر کی طرف ایک گاؤں میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھے۔ وہ اپنے ماموں کی خیریت کی غرض سے ہی گڑھی ڈوپٹہ آیا تھا۔ کچی سڑک پر جا بجا پتھروں اور ملبوں کا ڈھیر تھا۔ اس نے کار ایک مکان کے ملبے کے قریب روکی اور خود پیدل اوپر کی طرف بچتا بچاتا چل پڑا۔ پون گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ ماموں کے گھر کے قریب پہنچا دیکھا تو مکان کی چھت ایک طرف سے جھکی ہوئی تھی، تین طرف سے دیواریں بھی گری ہوئی تھیں، ایک صحیح سلامت دیوار

کے پاس ان کا خاندان دو چار پائیوں پر نظر آیا۔ ماموں کے دو بچے تھے ایک بیٹی اور ایک بیٹا۔ دونوں اسکول میں پڑھتے تھے۔ طارق کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ماموں، ممانی اور ان کے بچے خیریت سے تھے، گھر کا تھوڑا بہت سامان بھی کسی حد تک محفوظ تھا ہاں البتہ عارضی طور پر انہوں نے چولھا گھر سے باہر میدان میں بنا رکھا تھا۔ قریب ہی پانی کا ایک چھوٹا سا چشمہ بہہ رہا تھا جو ان کی ضرورت پوری کر رہا تھا۔

''طارق کیسے ہو؟'' ماموں نے بڑھ کر اسے گلے لگایا۔ ممانی بھی دوڑی آئی۔

''باجی اور بھائی صاحب کیسے ہیں؟'' انہوں نے طارق کے والدین کی خیریت جاننے کی کوشش کی۔

طارق بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رویا اور پوری تفصیل بیان کی۔ ماموں، ممانی کے ساتھ ساتھ ان کے دونوں بچے بھی رونے لگے۔ پندرہ بیس منٹ بعد انہیں کچھ قرار آیا تو پھر ماموں گلوگیر آواز میں کہنے لگے کہ ان کے پاس پیسے بالکل ختم ہو گئے ہیں۔ ان کی دو بکریاں بھی مر گئیں اس کے علاوہ ان کے پرچون کی دکان بھی ملبے کا ڈھیر ہو گئی۔ راستے بند ہونے کی وجہ سے باہر جانا بھی مشکل ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کیا کریں۔

یہ سب جاننے کے بعد طارق کو بہت صدمہ پہنچا۔ اس کے ایک ہی ماموں تھے جو اسے بہت چاہتے تھے۔ اس وقت وہ ذہنی اذیت کا شکار تھے۔ طارق نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا ویلٹ نکالا اور اس میں سے تین ہزار روپے نکال کر ماموں کو دیئے جو انہوں نے بمشکل رکھ لئے

''مامی! جب زلزلہ آیا تو آپ کہاں تھیں'' طارق نے تفصیل جاننے کی کوشش کی۔۔

''اس وقت میں کپڑے دھونے کے لئے باہر آئی تھی۔ گڑیا اور ہاشم اسکول نہیں گئے تھے لہٰذا وہ تمہارے ماموں کے ساتھ چشمے سے پانی بھر کر لا رہے تھے تاکہ میں جلدی سے کپڑے دھولوں، اتنے میں مجھے محسوس ہوا جیسے تیز تیز ہوائیں چلنے لگی ہوں، بچے بھی چونک کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے پھر آسمان سرخ سا ہو گیا تھوڑی دیر بعد دھواں سا نکلنے لگا پھر یکدم گڑگڑاہٹ کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب مکان کے اندر جانے کے بجائے باہر ہی ایک دوسرے کو سنبھالے کھڑے رہے۔ چند لمحوں بعد زمین پیروں سے سرکتی محسوس ہوئی، ہم سب کا توازن بگڑنے لگا۔ بچے چیخنے لگے کہ اماں کیا زلزلہ آ رہا ہے، ابھی ہم اندازہ لگا ہی رہے تھے کہ اچانک ہمارا مکان ایک دھماکے سے زمین پر آ رہا ہماری دونوں بکریاں ملبے میں دب گئیں۔ ہم باہر رہنے کی وجہ سے بچ گئے۔'' ممانی

منظر کشی کرتے ہوئے کانپ رہی تھیں۔ طارق کو بھی جھرجھری سی آ گئی۔

دو گھنٹے گزارنے کے بعد طارق وہاں سے روانہ ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ نیچے اتر آیا۔ کار اسٹارٹ کی اور مظفر آباد کے لئے روانہ ہوا۔ مختلف جگہ رکتے ہوئے وہ تین بجے مظفر آباد پہنچ گیا۔ سب سے پہلے وہ اپنے چاچا کے گھر پہنچا، انہیں ماموں کے متعلق تمام تفصیل بتائی پھر وہ ایسا سویا کہ افطاری کے وقت چچی کی آواز پر ہی بیدار ہوا۔ آج اس نے عصر کی نماز بھی نہیں پڑھی، افطاری اور نماز سے فارغ ہو کر وہ اپنے خیمے میں پہنچا۔ کار اس نے چاچا کے گھر ہی چھوڑ دی تھی۔ خیمے کے پاس دادا جی کے ساتھ کوئی اجنبی شخص بیٹھا گفتگو کر رہا تھا جیسے ہی طارق نے اسے دیکھا اجنبی نے اسے سلام کیا۔ دادا جی نے بتایا کہ رشید ان کا بھانجا ہے اور آج ہی باغ سے یہاں پہنچا ہے۔

''باغ کے لوگوں کا کیا حال ہے؟'' طارق نے رشید سے سوال کیا۔

''وہ تو اجڑ گیا ہے۔ بہت کم لوگ زندہ بچ سکے مگر وہ بھی زیادہ تر زخمی ہیں''۔ رشید نے بتایا۔

''پتر! تم گڑھی ڈوپٹہ اپنے رشتہ داروں کا پتا کرنے گئے تھے کیا وہ لوگ خیریت سے ہیں؟'' دادا جی نے طارق کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوا پوچھا۔

''ہاں جی! ماموں کا خاندان خیریت سے ہے مگر ان کا مالی نقصان بہت ہوا ہے۔ اس وقت وہ بہت پریشان ہیں''۔ طارق نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

''اس وقت تو تمام زلزلہ زدہ علاقوں کے لوگ بہت پریشان ہی نہیں مشکلات کا بھی شکار ہیں'' رشید نے سنجیدگی سے کہا۔

''دادا جی! ماموں اور ممانی نے زلزلے سے متعلق وہی باتیں بتائیں جو آپ نے کہی تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کس نوعیت کا زلزلہ تھا''۔ طارق نے تشویشناک انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔

''یار! الائی پہاڑ کے قریبی گاؤں سے ایک بندہ مجھے باغ سے آتے ہوئے ملا تھا۔ اس نے بتایا کہ الائی پہاڑ سے سبز مائل دھواں مسلسل نکل رہا ہے اور وقفے وقفے سے دھماکوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں وہاں کے زخمیوں کی زبانی پتہ چلا کہ الائی پہاڑ کے قریب زمین ایک طرف سے چار پانچ فٹ اندر دھنس ہے اور دوسری

طرف پانچ فٹ سے زیادہ اٹھی ہوئی ہے یہاں کافی گہرا اور کشادہ گڑھا پڑا ہوا ہے۔'' رشید نے طارق کی حیرت میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔الائی پہاڑ سے متعلق معلومات حاصل ہونے کے بعد طارق کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''پتر! کہاں کھو گئے؟'' دادا جی نے اسے جھنجوڑتے ہوئے سوال کیا۔

''میں یہ سوچ رہا ہوں کہ پہاڑ سے دھواں تو آتش فشاں موجود ہونے کی صورت میں نکلتا ہے مگر میں نے کبھی اس علاقے میں آتش فشاں موجود ہونے کے متعلق کسی سے بھی نہیں سنا اگر ایسی بات ہوتی تو حکومت ماہر ارضیات سے ضرور رجوع کرتی یا پھر باہر سے غیر ملکیوں کی بہت بڑی تعداد، اس وقت ہمارے ملک میں زلزلے کی وجہ سے موجود ہے وہ ضرور اس طرف مائل ہوتی نہ معلوم پھر کیا وجہ ہے کہ اس اہم واقعہ کو نظر انداز کیا جا رہا ہے''۔طارق نے حیرانگی ظاہر کرتے ہوئے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''ہوسکتا ہے حکومت کو اتنی تفصیل معلوم نہ ہو کیونکہ زلزلے سے بہت بڑا علاقہ متاثر ہوا ہے پھر ہر طرف جانا، زخمیوں کو لانا، دیگر معلومات اکھٹی کرنا بہت مشکل ہے۔راستے بھی تو جگہ جگہ سے بند ہیں بندہ جائے تو کہاں جائے''؟ رشید نے کسی حد تک اس کے خدشے کو دور کرنے کی کوشش کی مگر طارق اس کے جواب سے متفق نہ ہوسکا۔

عید سے پانچ روز قبل طارق اسلام آباد اپنی تنخواہ وغیرہ کے سلسلے میں روانہ ہوا۔وہ سب سے پہلے اپنے فلیٹ آ گیا وہاں اس نے اپنے دوست اقبال اور ملازم سے ملاقات کی پھر انہیں مظفر آباد، بالاکوٹ اور گڑھی ڈوپٹہ سے متعلق تمام تفصیلات بتائیں اس کے علاوہ زلزلے سے ہونے والی تباہی اور مشکلات کا بھی ذکر کیا۔

''یار! اس زلزلے نے بہت بڑے علاقے کو اپنے لپیٹ میں لے لیا ہے'' اقبال نے افسردگی سے کہا۔

''ہوں''۔طارق نے مختصراً کہا۔

''مجھے تمہارے خاندان کا آج تک دکھ ہے کئی روز سے میں سو نہیں سکا، یہ ایسا سانحہ ہے جو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ہمارے دلاسے تمہارے زخموں کو بھر سکتے ہیں''۔اقبال نے دکھ بھرے انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔طارق بھی یکدم سنجیدہ ہوگیا۔

''اس وقت پوری دنیا کی توجہ پاکستان کے زلزلے کی طرف ہے۔ بین الاقوامی تنظیمیں اور میڈیا بھی یہاں موجود ہے باہر سے امداد بھی آ رہی ہے مگر کئی علاقوں میں ابھی تک بھی امداد نہیں پہنچی ہے اور لوگ امداد کے منتظر ہیں''۔ طارق نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

''یار! دیکھو ہم اپنے حال احوال سے پریشان ہیں مگر غیر ملکیوں کو جہادیوں کی پڑی ہوئی ہے''۔ اقبال نے مشتعل انداز میں کہا۔

''کیا ہوا؟'' طارق نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہمارے ہاں ریاض نام کا ڈرائیور ہے جو ایم ڈی کے ساتھ ہوتا ہے، وہ ایک ہفتے پہلے دفتر آیا تھا۔ وہ بھی مظفر آباد کا رہنے والا ہے، اس کے خاندان کی کئی لوگ اس زلزلے میں ہلاک ہوئے ہیں۔ وہ بتا رہا تھا کہ زلزلے کے تیسرے روز کئی غیر ملکی رپورٹرز کی ٹیم مظفر آباد پہنچی تھی اس میں سے ایک خاتون رپورٹر نے ان کے علاقے کی ٹیچر سے پوچھا تھا کہ کیا اس زلزلے میں مجاہدین بھی ہلاک ہوئے ہیں'' اقبال نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے تفصیل بیان کی۔

''ایک دلچسپ بات اور بھی ہے جو ہمارے اپارٹمنٹ کے چوکیدار نے بتائی ہے اتفاق سے وہ بھی مانسہرہ کا رہنے والا ہے اس نے کہا کہ اس کا ماموں مانسہرہ سرکٹ ہاؤس کے قریب ایک خیمہ بستی میں امدادی کام میں مصروف تھا کہ ایک غیر ملکی چینل کی رپورٹر نے اس سے پوچھا تھا کہ کیا اس زلزلے میں اسامہ بن لادن بھی ہلاک ہوا ہے اقبال نے مزید تفصیلات بیان کیں۔

''یار طارق! ایک بات تو بتاؤ، یہ غیر ملکی نامہ نگار اور امدادی ٹیمیں ہمیں ریلیف دینے آئی ہیں یا اسامہ بن لادن اور مجاہدین کو تلاش کرنے آئی ہیں، اسامہ بن لادن سے ہمارا کیا لینا دینا''۔ اقبال نے غصے کے عالم میں کہا۔

''ایسے ہی پوچھ لیا ہوگا، تمہیں اتنا جذباتی ہونے کیا ضرورت ہے''۔ طارق نے اس کو نارمل کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کڑی سے کڑی جوڑنے میں غرق ہو گیا، کئی سوالات اس کے ذہن کو جھنجھوڑنے لگے۔

تقریباً بائیس دنوں بعد طارق دفتر آیا تھا۔ اس کے تمام دوست اس کے آس پاس جمع ہو گئے، سب ہی نے مشترکہ طور پر اس سے تعزیت کی اور تفصیلات معلوم کرنے لگے۔ ان سب سے گپ شپ کرنے کے بعد طارق

نے تنخواہ کا چیک لیا اور وہیں بینک سے کیش کرانے کے بعد واپس فلیٹ آ گیا۔اس نے دو دن اسلام آباد میں ہی ٹھہرنے کا پروگرام بنایا۔اگلے دن وہ دفتر پہنچ گیا چونکہ آج دفتر کا آخری دن تھا۔اس کے بعد عید کی چھٹیاں تھیں۔وہ تھوڑی دیر تک دفتری کام میں مصروف رہا پھر اپنے دوستوں سے زلزلے سے متعلق باتیں کرتا رہا۔ ان سے مزید معلومات اکٹھی کرنے کی کوشش میں دو گھنٹے یوں ہی گزار دیئے پھر کمپیوٹر اسٹارٹ کر کے انٹرنیٹ سے مختلف جگہ سے زلزلے سے متعلق مضامین تلاش کرتا رہا۔کافی تگ ودو کے بعد اتفاق سے اسے زلزلے کے حوالے سے ایک اہم آرٹیکل مل گیا جسے Ray Bilger نے engineered human earthquakes کے نام سے لکھا تھا۔یہ آرٹیکل چار صفحات پر مشتمل تھا۔طارق نے ان چار صفحات کی مزید فوٹو اسٹیٹ کرا کر کے اپنے بیگ میں رکھ لیں۔وہ اس مضمون کو اطمینان اور سکون سے پڑھنا چاہتا تھا۔ دوپہر کی نماز کے بعد وہ اپنے دفتر کے لوگوں کو خدا حافظ کہہ کر اپنے فلیٹ واپس آیا۔اقبال بھی آ گیا تھا وہ اگلی صبح لاہور کے لئے روانہ ہونے والا تھا۔طارق نے بھی اگلی صبح مظفر آباد جانے کا ارادہ کر لیا۔شام چار بجے کے قریب اس نے اقبال کو وہ مضمون پڑھوایا جو اس نے انٹرنیٹ سے حاصل کیا تھا۔دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور اس مضمون کو بہت دھیان سے پڑھا۔

یار!تمہارا اس آرٹیکل کے بارے میں کیا خیال ہے،زلزلے کے حوالے سے میرے وسوسے کو کچھ تقویت مل رہی ہے"۔طارق نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر پتا نہیں کیوں مجھے اس بات پر یقین نہیں ہے،یار ہمارے گناہ بھی کچھ کم نہیں ہیں۔سود ہم کھاتے ہیں،کرپشن اور اخلاقی گراوٹ ہمارے اندر سما گئی ہے۔مذہب سے صرف نماز روزے کی حد تک تعلق رہ گیا ہے۔ایمانداری،اخوت،بھائی چارہ اور شرافت اب صرف کتابی باتیں رہ گئی ہیں پھر اللہ تعالیٰ قہر نازل کرے تو کیوں نہ کرے"۔اقبال نے وضاحت کی

"وہ تمہاری ساری باتیں بالکل صحیح ہیں دیکھو نا گناہوں کی سزا صرف مسلمانوں کو ہی کیوں مل رہی ہے؟امریکہ، اسرائیل اور ان ملکوں کو کیوں نہیں مل رہی ہیں جو کافر ہیں۔امریکہ نے پوری دنیا کو غیر محفوظ بنا دیا ہے۔بہانے بہانے سے مسلمان ملکوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بنا رہا ہے۔افغانستان اور عراق میں جس طریقے سے دہشت

گردی کے خاتمے کے نام پر وہ مسلمانوں کی نسل کشی کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسا عذاب اس پر اور اسرائیل پر کیوں نازل نہیں کر رہا ہے؟ طارق نے معصومیت سے پوچھا۔

''طارق! دیکھو۔ ماں باپ اپنے بچوں کو کتنا چاہتے اور پیار کرتے ہیں لیکن اگر وہ کوئی غلطی کرتے ہیں تو انہیں ڈانٹا بھی جاتا ہے اگر ڈانٹ سے نہ مانیں تو ان کی پٹائی بھی کی جاتی ہے مقصد انہیں سدھارنا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان ہی بندوں اور خاص طور پر اپنے پیارے نبیؐ کی امت سے بہت پیار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ مختلف آزمائشیں انہیں تنبیہہ کرنے اور سدھارنے کے لئے ہی ہیں جہاں تک صیہونی قوتوں کا تعلق ہے وہ سرکش اور بے لگام ہیں، اس وقت اللہ نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے جب بھی وہ اس کی پکڑ میں آ گئے تو انہیں کہیں بھی امان نہیں ملے گی۔ وہ وقت جلد آنے والا ہے، فرعون اور نمرود نہ رہے تو ان کی کیا اوقات ہے''۔ اقبال نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''اقبال دیکھو، اس آرٹیکل میں جنوری 1978ء کو شائع ہونے والے میگزین اسپیکولا کے ایک مضمون کا حوالہ دیا ہے اور اس پر بحث کی گئی ہے کہ برقی سگنلوں کے ذریعے کسی بھی علاقے میں زلزلے کی مانند زیر زمین تباہی پھیلائی جاسکتی ہے۔ آگے چل کر 30 جنوری 1981ء کے واشنگٹن پوسٹ کے شمارے میں شائع ہونے والی رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ 1979ء میں 56 ایسے زلزلے دنیا میں آئے جو برقی مقناطیسی سگنلوں کے ذریعے روس اور امریکہ نے ایک دوسرے کے خلاف زلزلوں کے طور پر استعمال کیے۔ اس کے متعلق تم کیا کہتے ہو؟ اس کے علاوہ امریکہ خطرناک قسم کے جراثیم بھی ہتھیار کے طور پر جس کے لئے چاہتا ہے استعمال کرلیتا ہے جیسے کہ الجزائر کے سربراہ بومدین کے جسم میں انجکشن کے ذریعے جراثیم داخل کر دیا تھا''۔ طارق نے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے ہوئے کہا۔

''یار! بھول جاؤ ان سب باتوں کو، تمہاری ان باتوں پر کوئی اعتبار نہیں کرے گا کیوں اپنی جان گنوانے کے چکر میں ہو۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں جھونک سکتا، خود بھی پریشان ہو رہے ہو اور ہمیں بھی پریشان کر رہے ہو۔ افطاری کا وقت ہو رہا ہے جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر آ جاؤ''۔ اقبال نے اکتاہٹ سے کہا۔

طارق خاموشی سے اٹھا، اپنا حاصل کردہ آرٹیکل اپنے بیگ میں رکھا اور واش روم سے فارغ ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر

آ گیا۔اسے رہ رہ کر اقبال پر غصہ آ رہا تھا وہ جان بوجھ کر اس کی باتوں کو نظر انداز کر رہا تھا۔

دوسرے دن اقبال لاہور اپنے گھر والوں کے ساتھ عید منانے روانہ ہو گیا جبکہ طارق نے تھوڑی بہت ضرورت کی چیزیں اسلام آباد کی ستارہ مارکیٹ سے خریدیں اور مظفر آباد کے لئے روانہ ہوا، جاتے ہوئے اس نے اپنی کار چیک کرائی تھی تا کہ راستے میں کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو۔مظفر آباد جاتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھیں نم ہوئیں۔ماں، باپ، بھائی، بہن، اور سلمٰی کی یادوں نے اسے تڑپا دیا۔وہ بہت اکیلا ہو گیا تھا۔بچپن سے اس نے تمام گھر والوں کے ساتھ عید منائی تھی مگر آج اس کے جذبات سرد ہو چکے تھے۔زندہ رہنے کی خواہش نے بھی دم توڑ دیا تھا۔مانسہرہ کراس کرنے کے بعد پہاڑی سلسلوں سے گزرتے ہوئے اس کا دل بھر آیا، گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے وہ بہت رویا اس کی ہچکی بندھ گئی، جوں جوں وہ مظفر آباد کی طرف بڑھنے لگا پہاڑی سلسلوں کی بلندی بھی بڑھتی چلی گئی۔وہ سوچنے لگا کہ ان پہاڑوں کے درمیان رہنے والے لوگ کتنے مجبور اور بے بس ہیں، وہ اپنی زمین اور اپنے آباواجداد کی نشانیوں کو چھوڑنا نہیں چاہتے مگر یہ بیدرد اور ظالم پہاڑ ان کو مٹانے کے درپے ہیں۔مسلسل لینڈ سلائنڈنگ کے باعث بچے کھچے بے یارومددگار لوگ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں کیونکہ ان کی کشتیاں تو جل چکی ہیں۔طارق پہلے ان پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا تھا تو اسے ایک انجانی خوشی سی محسوس ہوتی تھی، وہ ان نظاروں میں کھو جاتا تھا مگر آج ان ہی نظاروں سے اس کا دم گھٹ رہا تھا۔بالاکوٹ کے قریب اس کی گاڑی کا انجن گرم ہو چکا تھا۔اس نے پانی سے انجن کو ٹھنڈا کیا۔ایک گھنٹے بعد اس نے اپنا سفر دوبارہ شروع کر دیا۔افطاری سے پانچ منٹ پہلے وہ اپنے چاچا کے گھر پہنچ گیا۔منہ ہاتھ دھو کے افطاری کی پھر نماز پڑھ کر سو گیا۔
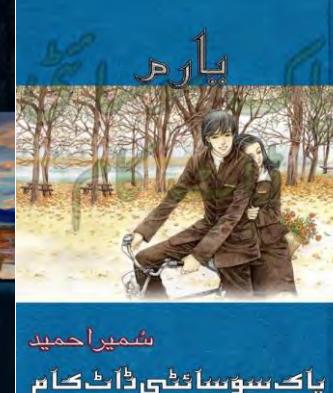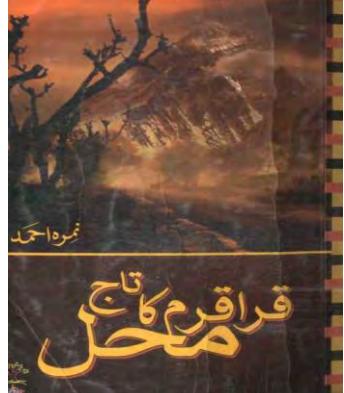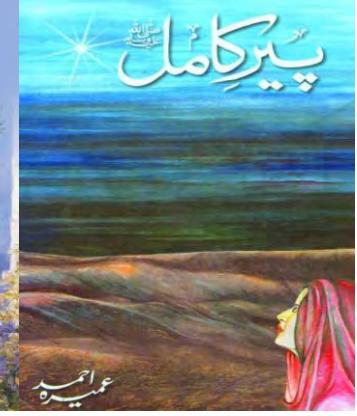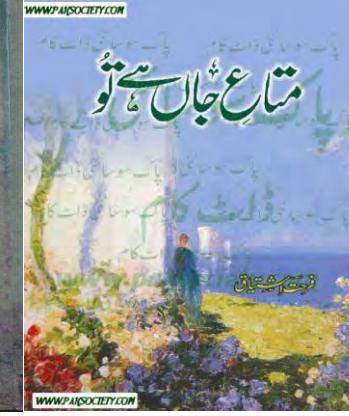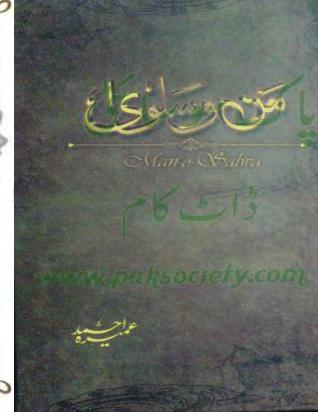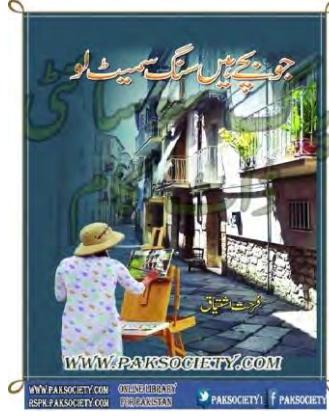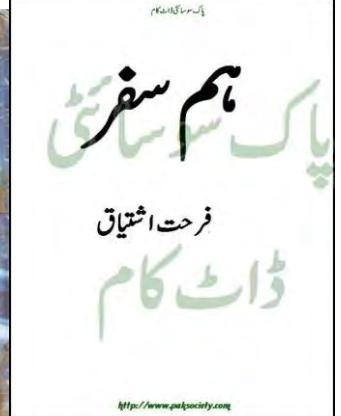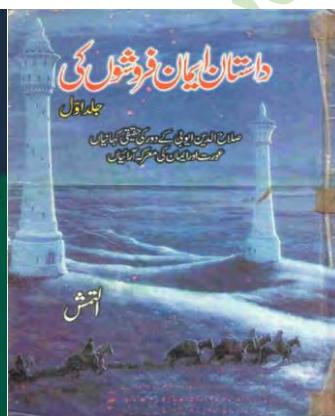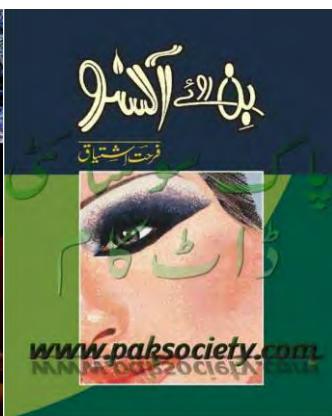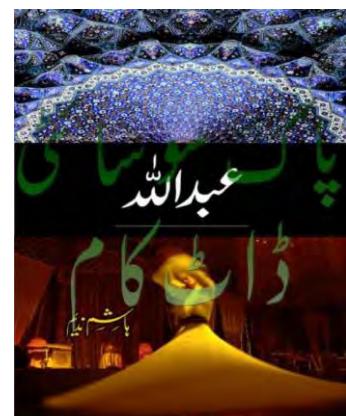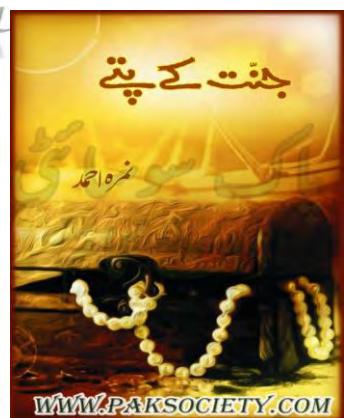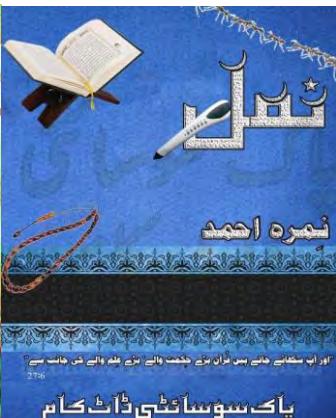
اگلے دن صبح وہ اپنے خیمے میں پہنچا دادا جی نے خیریت معلوم کی۔اس نے دیکھا کہ مدینہ مارکیٹ کے اطراف ملبے پر کئی عارضی دکانیں بنی ہوئی تھیں چونکہ عید قریب تھی دیگر شہروں سے بہت سارے صاحب حیثیت لوگ، اس کے علاوہ مختلف این جی اوز زلزلہ متاثرین کی مدد اور امداد کے لئے پہنچے ہوئے تھے۔شکستہ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔امداد لینے اور دینے والے دونوں کافی تعداد میں موجود تھے۔مظفر آباد آتے ہوئے طارق نے فیض آباد سے پھاوڑا اور ایک بیلچہ بھی خرید لیا تھا۔اس نے خیمے سے باہر نکل کر اپنے گھر کا تھوڑا تھوڑا ملبہ ہٹانا شروع

کیا۔ دادا جی خیمے سے باہر کرسی پر بیٹھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔ اس نے مٹی کا ڈھیر ایک طرف جمع کرنا شروع کیا تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے اندر داخل ہونے والا دروازہ کلیئر کیا پھر اندر کی طرف جھانکا تو کچھ بھی نہیں بچا تھا، ساری چیزیں ٹوٹی پھوٹی نظر آ رہی تھیں دفعتاً اسے ایک طرف پڑا ہوا موبائل نظر آیا۔ یہ سلمان کا تھا یعنی اس کے چھوٹے بھائی کا۔ اس نے سنبھل کر اس موبائل کو اٹھایا، وہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ طارق نے موبائل آن کیا وہ کام کر رہا تھا۔ سلمان نے آخری نمبر طارق کا ہی ڈائیل کیا تھا جو بدقسمتی سے ڈائیل نا ہو سکا کیونکہ وقت صبح آٹھ بج کر پچاس منٹ تھا۔ یعنی 8 اکتوبر کا دن۔ جبکہ اس کے موبائل پر 15 اکتوبر کے بعد سے اس کے کئی دوستوں کی مس کالز بھی موجود تھیں۔ طارق نے اس موبائل کو صاف کر کے جیب میں ڈال لیا، یہ اس کے بھائی کی آخری نشانی تھی۔ موبائل ملنے کے بعد طارق کی حالت یکدم غیر ہو گئی۔ اس نے پھاوڑا اور بیلچہ خیمے کے اندر رکھا اور خود دادا جی کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے اسے تسلی دی وہ بچوں کی طرح رو دیا۔

ظہر کی نماز کے بعد طارق اور دادا جی آرام کرنے کی غرض سے خیمے میں جانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کئی آرمی والے امدادی کارکنوں سمیت اس کے پاس آئے، اس کا شناختی کارڈ طلب کیا پھر پچیس ہزار کا چیک اس کے حوالے کیا۔ دادا جی کو بھی انہوں نے چیک دیا۔ یہ چیک لیتے ہوئے طارق کو بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ چیک نہ تو اس کے گھر کا اور نہ اس کے گھر والوں کا نعم البدل تھا۔

وہ دل ہی دل میں بڑبڑانے لگا کہ وہ اس چیک کا کیا کرے گا۔ اس کے خاندان میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہوتا تو اس میں جینے کی امنگ ہوتی اور اس چیک کا کوئی مقصد ہوتا۔ وہ خاموشی سے خیمے میں جا کر لیٹ گیا۔ گھر والوں کی یاد نے اسے بے چین کر دیا وہ سو نہ سکا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس نے خیمے کو رسی سے بند کیا۔ دادا جی سے خیال رکھنے کا کہہ کر وہ چاچا کے گھر گیا۔ چاچا کو چیک اور سلمان کے موبائل کے متعلق بتایا، انہیں بھی بہت دکھ ہوا۔ سوائے صبر کرنے کی تلقین کرنے کے ان کے پاس کوئی اور چارہ بھی تو نہ تھا۔

آج عید کا دن تھا مگر مظفر آباد اور زلزلہ زدہ علاقوں میں یہ عید بڑی ویران اور سوگوار تھی۔ بچے اپنے ماں باپ اور والدین اپنے بچوں کو، شوہر اپنی بیوی اور، بیوی اپنے شوہر کو تلاش کر رہی تھی۔ ویران آنکھیں جس میں زندگی کی کوئی رمک دکھائی نہیں دیتی تھی وہ آنکھیں ملبوں کے ڈھیر میں اپنے پیاروں کو یوں ڈھونڈھ رہی تھیں جیسے کوئی

معجزہ ہوگا اوران کے پیارے ان کے پاس آموجود ہوں گے۔ یہ سوچ بھی کتنی معصوم ہوتی ہے خود کو بہلانے کیلئے انسان بھی بسا اوقات جانتے بوجھتے خوابوں کی جنت تعمیر کر لیتا ہے ایسی ہی کیفیت طارق کی بھی تھی۔ ایک ماہ ہونے کے باوجود اس کا دل یہ یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا کہ اس کے گھر والے اب اس دنیا میں نہیں رہے۔

گھر والوں کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر آنے کے بعد طارق نے کھانا بالکل نہیں کھایا حالانکہ اس کے چاچا اور چاچی نے بہت اصرار کیا مگر وہ نہ مانا۔ خاموشی سے اٹھ کر خیمہ بستی کی جانب روانہ ہوا وہاں کافی رش تھا، زیادہ تر لوگ اسلام آباد سے آئے ہوئے تھے۔ متاثرین میں دیگیں تقسیم ہو رہی تھیں بعض تنظیمیں عورتوں اور بچوں میں کپڑے اور تحائف تقسیم کر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے اپنے آنے والے مستقبل سے بے خبر ان تحائف کو وصول کرنے کے بعد خوشی خوشی خیموں کے اطراف دوڑتے پھر رہے تھے۔ وہ خواتین جن کے شوہر اس زلزلے میں ہلاک ہو چکے تھے، اس افراتفری میں عدت کے دن بھی گزارنے سے محروم تھیں۔ محرم اور نامحرم کا فرق تو گھروں میں ہوتا ہے، کھلے آسمان تلے ان خیموں میں ان تمام چیزوں کا خیال کیسے رکھا جا سکتا تھا؟ اس وقت تو یہاں کھانے پینے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ بچوں کی خاطر مصیبت کی ماری ماؤں کو باہر نکلنا ہی پڑتا تھا۔ امدادی کارکنوں سے کھانا لانا اور بچوں کو کھلانا ان ہی کی ذمہ داری تو تھی ورنہ اور کون کرتا؟

دوپہر کے بعد طارق اپنی کار کے ذریعے گڑھی ڈوپٹہ اپنے ماموں سے ملنے روانہ ہوا مین بازار میں اسے ایم کیو ایم کا ایک کارکن ندیم ملا۔ وہ کراچی آپریشن کے دوران اسلام آباد آیا تھا وہیں اس سے طارق کی ملاقات ہوئی تھی۔ ان دونوں میں جب سے اچھی خاصی دوستی ہوگئی تھی۔ ندیم نے اسے بتایا کہ وہ گڑھی ڈوپٹہ میں ایک ہفتے پہلے ہی کراچی سے آیا ہے۔ ان کی تنظیم کا آفس لب سڑک بنی بلڈنگ کی پہلی منزل پر واقع تھا۔ طارق نے دیکھا کہ ایم کیو ایم کا جھنڈا ان کے آفس پر لگا ہوا تھا۔ اس نے ندیم کو اپنے گھر والوں کے متعلق بتایا تو وہ بھی افسردہ ہوگیا۔

"طارق"! پیچھے سے کسی نے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آواز دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے ماموں اور ان کے دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' ماموں نے پوچھا۔

''آپ ہی کے پاس آ رہا تھا۔ اچھا ہوا آپ مل گئے، آپ کہاں جا رہے تھے؟'' طارق نے سوال کیا۔

''کچھ راشن لینے آیا تھا۔'' انہوں نے مختصر جواب دیا۔ طارق نے ماموں سے ندیم کا تعارف کرایا اور ان کے حالات بھی بتا دیئے۔ ندیم نے ان کا پتہ لیا تا کہ ہر ممکن امداد کی جا سکے پھر وہ خدا حافظ کہہ کر کسی کام سے چلا گیا

''ماموں! کیا آپ کو کوئی امدادی چیک وغیرہ ملا ہے۔'' طارق نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

''نہیں بیٹا! آرمی والے آئے تھے انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ چیک جلد دے جائیں گے مگر دس دن ہو گئے ابھی تک وہ پلٹ کر نہیں آئے۔'' ماموں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

''چلو بیٹا! گھر چلو تمہاری ممانی سے بھی مل لینا۔'' انہوں نے پیار سے کہا۔

''نہیں ماموں! میری طبیعت کچھ خراب ہے، میں اتنی اونچائی پر نہیں جا سکوں گا۔ یہ کچھ رقم ہے رکھ لیں، میں پھر کبھی آؤں گا۔'' طارق نے جیب سے ایک لفافہ نکال کر ماموں کی طرف بڑھایا اس میں چار ہزار روپے تھے۔ ماموں نے خاموشی سے رکھ لئے اس وقت یہ رقم ماموں کے لئے بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ وہ اسے دعائیں دیتے ہوئے چلے گئے واپسی پر طارق کی ملاقات دوبارہ ندیم سے ہو گئی۔ وہ اپنے دیگر ساتھیوں کے ساتھ ایک سوزوکی میں اپنے دفتر سے امدادی سامان اتار کر رکھوا رہا تھا۔

''یہ سامان کہاں جا رہا ہے؟'' طارق نے ندیم سے پوچھا۔

''یہ امدادی سامان آس پاس کے علاقوں میں پہنچانے جا رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ طارق نے دیکھا کہ اس میں کمبل، خیمے اور کھانے پینے کا سامان لدا ہوا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ لڑکے کراچی سے آ کر یہاں بڑی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں، یہ بات قابل ستائش تھی۔ اس مصیبت کی گھڑی میں ساری قوم متحد ہو کر متاثرین کے غم بانٹنے میں مصروف تھی۔

طارق جب اپنے چاچا کے گھر پہنچا تو رات ہونے والی تھی۔ ان کے بے حد اصرار پر اس نے کھانا کھایا اور سو گیا۔ صبح باسی عید تھی وہ ٹہلتا ہوا، اپنے خیمے پہنچا وہاں دادا جی اپنے کئی جاننے والوں کے ساتھ گپ شپ میں مصروف تھے۔ وہ خاموشی سے اپنے خیمے میں کچھ دیر لیٹا وہی آرٹیکل پڑھتا رہا جو اس نے انٹرنیٹ سے حاصل کیا

تھا، اس کے بعد اس نے وہ آرٹیکل لیا اور خیمہ بستی کی طرف روانہ ہوا۔ جاتے جاتے وہ ایک جگہ ٹھٹک گیا۔ اس نے دیکھا کہ امریکی عملہ پاکستانی آرمی کی نگرانی میں بچوں کو ویکسین دے رہا تھا اس کے علاوہ کچھ بچوں کو انہوں نے انجکشن بھی لگایا۔ طارق نے ان کی طرف نفرت بھری نگاہ ڈالی۔

''ہوں، یہ وہ لوگ ہیں جو چور سے کہتے ہیں چوری کرو اور شاہ سے کہتے ہیں رکھوالی کرنا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب وہ خیمہ بستی میں پہنچا تو پتا چلا کہ دو تین خیموں میں آگ لگنے کے باعث تین بچے اور دو عورتیں جھلس گئی ہیں۔

''اے اللہ! ان مصیبت کے ماروں کے ساتھ یہ بھی ہونا تھا۔'' اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔ وہ باری باری ساری خیمہ بستی کے گرد چکر لگاتا رہا پھر اوپر کی طرف سڑک پر پہنچا تو کافی تعداد میں وی آئی پی شخصیات بھی موجود تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے ذاتی فوٹوگرافرز کے علاوہ پریس فوٹوگرافرز بھی موجود تھے۔ یہ شخصیات ہیلی کاپٹر کے ذریعے یہاں پہنچی تھیں۔ طارق نے دل ہی دل میں کہا کہ یہ آنے والی شخصیات ہیلی کاپٹرز میں آئی ہیں، انہیں کیا پتا کہ مانسہرہ سے لے کر مظفر آباد، بالاکوٹ اور گڑھی ڈوپٹہ کے لوگوں پر کیا قیامت ٹوٹی ہے لوگ کتنے اپاہج اور زخمی ہیں، کچھ لوگ اگر زلزلے سے بچ گئے تھے تو وہ خوراک اور طبی امداد نہ ملنے کی وجہ سے مر چکے ہیں۔ اس میں مزید اضافے کا امکان ہے کئی شخصیات نے لوگوں کو امداد دیتے ہوئے تصویریں کھنچوائیں اور واپس لوٹ گئے واپس جانے کے بعد وہ شخصیات، یہ تصویریں مختلف اخبارات کو جاری کر دیں گی اور بس۔۔ ان کا کام پورا ہو جائے گا نیکی کی نیکی ہو گئی اور شہرت الگ ان کے حصے میں آ جائے گی بعض لوگ ایسے ہی موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔

وقت گزرتا رہا۔ عید کو بھی گزرے دس روز ہو چکے تھے۔ طارق نے ابھی تک دفتر جوائن نہیں کیا تھا۔ اسلام آباد سے اقبال کے بھی کئی فون آ چکے تھے۔ دفتر سے بھی کئی بار رابطہ کیا گیا تھا مگر وہ انہیں معقول جواب نہیں دے رہا تھا۔ اس کے چاچا الگ پریشان تھے۔ طارق نے حاصل کردہ آرٹیکل اپنے چاچا اور دیگر دوستوں کو بھی پڑھوا دیا تھا مگر اس کی باتوں کو سب نے دیوانگی کہہ کر رد کر دیا۔

جوں جوں وقت گزرتا رہا طارق کی خاموشی بڑھتی چلی گئی۔ اس نے پچیس ہزار کا چیک کیش کرا کے اپنے

ماموں کو دے دیا تھا حالانکہ چاچا نے بہت کہا یہ رقم تم رکھ لو مگر اس نے یہ کہہ کر انہیں خاموش کرا دیا کہ وہ ان روپوں کا کیا کرے گا۔ اس کا اس دنیا میں اب کوئی بھی نہیں رہا جسے رقم کی ضرورت پڑے۔ ماموں کا خاندان پریشان حال ہے انہیں اس رقم کی زیادہ ضرورت ہے۔ اس کا جواب سن کر چاچا چپ ہو گئے۔

''چاچا جی! میں اسلام آباد جا رہا ہوں، صبح جلدی اٹھانا''۔ طارق نے پہلی بار خوشگوار لہجے میں کہا۔ عید کو گزرے بیس دن ہو چکے تھے۔

''کیوں پتر! دفتر جا رہا ہے کیا؟'' چاچا نے خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں! دفتر بھی جاؤں گا مگر اصل وجہ وہ آرٹیکل ہے جس کی وجہ سے میں جا رہا ہوں۔ میں نے ایک جاننے والے کے ذریعے کسی صاحب سے رابطہ کیا تھا انہوں نے اس سلسلے میں مجھ سے ملنے کی خواہش کی ہے۔'' طارق نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے چاچا یہ جواب سن کر خاموش ہو گئے مگر انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ چلو اس بہانے طارق سوگواری کی کیفیت سے باہر آ گیا تھا۔

صبح سویرے چاچی نے پراٹھے اور انڈے پکا کر اسے ناشتہ کرایا۔ چائے وغیرہ پینے کے بعد طارق تیار ہو کر گاڑی کی طرف بڑھا تھوڑی دیر اس کی صفائی کی پھر چاچا، چاچی کو خدا حافظ کہہ کر وہ دادا جی کی طرف گیا، ان سے خیمے کا خیال رکھنے کا کہہ کر خود اسلام آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔ طارق کو گئے پورے چھ دن ہو چکے تھے ابھی تک اس کی خیریت کی اطلاع نہیں آئی تھی۔

''اجی! سنیئے! طارق کی خیریت تو معلوم کریں۔'' چاچی نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ صبح کے دس بجے تھے اس کے چاچا نے اسلام آباد طارق کے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ طارق نے ابھی تک دفتر جوائن نہیں کیا ہے پھر انہوں نے اسلام آباد اس کے فلیٹ میں فون کیا، وہاں اس کا دوست اقبال موجود نہیں تھا البتہ ملازم تھا۔ اس نے بتایا کہ طارق فلیٹ میں مظفر آباد سے ابھی تک آیا ہی نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر چاچا کے پاؤں تلے زمین ہی نکل گئی۔ وہ غمزدہ سے صوفے پر گر پڑے۔ چاچی دوڑ کر پانی لے آئیں۔ ان کا سارا گھر پریشان ہو گیا۔ انہوں نے پھر دفتر فون کیا تو یہی جواب ملا کہ وہ دفتر آیا ہی نہیں۔ طارق کے چاچا اپنی کار کے ذریعے اسلام آباد روانہ ہوئے، پہلے وہ طارق کے فلیٹ پہنچے وہاں اقبال سے ان کی ملاقات ہوئی۔ حقیقت جاننے کے بعد وہ بھی

پریشان ہو گیا پھر اقبال اور طارق کے چاچا دونوں اس کے دفتر گئے۔ دفتر میں سب ہی لوگوں نے یہی بتایا کہ طارق وہاں نہیں آیا۔ پریشانی یکدم بڑھ گئی تھی کسی نے کہا اسپتال چیک کر لو۔ دو دن لگا کے چاچا اور اقبال نے پنڈی اور اسلام آباد کے سارے چھوٹے بڑے اسپتال چیک کر لئے طارق کا پتہ نہیں چلا۔ گمشدہ کار کا نمبر بھی ٹریس کروایا۔ کار بھی نہیں ملی۔ مایوس ہو کر اس کے چاچا اور اقبال واپس فلیٹ میں آ گئے۔

اگلے روز اقبال بھی چاچا کے ساتھ مظفر آباد کے لئے روانہ ہو گیا۔ راستے میں جو بھی شہر آتا اقبال وہاں کے پولیس اسٹیشن میں جا کر طارق اور اس کی گاڑی کا نمبر بتا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ سب جگہ سے مایوس ہو کر وہ ایبٹ آباد پہنچے وہاں بھی پولیس چوکی پر انہوں نے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ دس روز قبل ایبٹ آباد اور حویلیاں کے درمیان ایک خالی کار ملی ہے جو سڑک کے کنارے لاوارث کھڑی تھی، اسے لفٹر کے ذریعے تھانے کے اندر کھڑا کیا گیا ہے۔ اقبال اور طارق کے چاچا جلدی سے تھانے کے اندر داخل ہوئے تو کار طارق کی تھی انہوں نے گاڑی کے اندر جھانک کر دیکھا تو اس میں طارق کے کپڑے، بسکٹ کے کچھ پیکٹ اس کے علاوہ ایک بیگ نظر آیا جس میں طارق نے اپنے ضروری کاغذات کے ساتھ وہ آرٹیکل بھی رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ خاص طور پر اسلام آباد جا رہا تھا۔ اقبال اور اس کے چاچا نے بمشکل کار کا دروازہ کھولا اور وہ بیگ نکال لیا مگر وہ اندر سے خالی تھا۔ اس میں سے تمام کاغذات غائب تھے۔

''چاچا جی! اللہ نہ کرے طارق کے ساتھ کوئی حادثہ پیش تو نہیں آیا کیونکہ گاڑی صحیح سلامت ہے پھر وہ خود کہاں چلا گیا؟ بیگ بھی خالی پڑا ہے اگر وہ کہیں چلا جاتا تو یہ بیگ اپنے ساتھ لے جاتا، اس میں سے کاغذات نکال کر بیگ خالی چھوڑ دینے کا مطلب کیا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے اس کے پاس پیسے تو نہیں تھے؟'' اقبال نے ایک ہی سانس میں اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

''نہیں اس کے پاس صرف پانچ ہزار روپے تھے زیادہ نہیں تھے'' چاچا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''اگر کوئی حادثہ ہوتا تو تھانے میں ضرور اطلاع آتی، اسپتال کے ذرائع سے معلوم ہو جاتا کیونکہ پولیس والوں کو حادثے کی فوری اطلاع دی جاتی ہے۔ میرا ذہن تو کام نہیں کر رہا ہے۔ آیئے یہاں کے سرکاری اسپتال میں چلتے ہیں''۔ اقبال نے تجویز پیش کی۔ وہ دونوں آدھے گھنٹے تک سرکاری اسپتال میں رہے مگر انہیں طارق کی

اطلاع نہیں ملی ۔تھک ہار کر دوبارہ واپس آنے کا کہہ کر وہ دونوں مظفر آباد روانہ ہو گئے ۔مظفر آباد پہنچ کر انہوں نے اپنے علاقے میں طارق کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ چاچی کے لئے یہ خبر بہت تکلیف دہ تھی کیونکہ ایک تو وہ ان کا بھتیجہ اور دوسرے رشتے سے داماد تھا۔ داداجی کو طارق کے متعلق معلوم ہوا تو وہ بھی بہت افسردہ ہو گئے کیونکہ وہ انہیں اچھی کمپنی دیا کرتا تھا۔

اقبال دوروز مظفر آباد رکنے کے بعد واپس اسلام آباد پہنچ گیا۔طارق کے چاچا تین دن بعد جا کر طارق کی کار لے آئے۔طارق کے ماموں کو جب اطلاع ملی تو ان کے آنسو رکنے پر ہی نہیں آ رہے تھے کیونکہ ان کی بہن کی آخری نشانی بھی چلی گئی تھی۔ طارق کے چاچا ہر روز دروازے کی ہر دستک پر چونک اٹھتے کم وبیش چاچی کا بھی یہی حال تھا۔انتظار کرتے کرتے ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔

آج پورے دس مہینے ہو چکے تھے مگر طارق کا کہیں بھی پتہ نہیں چل رہا تھا۔

''سلمٰی کے ابا! طارق کہاں چلا گیا، اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔کہاں گیا میرا بیٹا؟ جاتے ہوئے کتنا خوش تھا آخری بار میرے ہاتھ کے پراٹھے کھا کر گیا تھا پتا نہیں کہاں اور کس حال میں ہوگا''۔چاچی نے روتے ہوئے ڈوپٹے کے پلو سے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے سوال کیا

''مجھے کیا پتا کہ وہ کہاں گیا جب تک وہ نہیں مل جاتا ایک امید کے سہارے وقت گزار رہا ہوں ہر نماز کے بعد اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ خیریت سے واپس آجائے''۔چاچا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

داداجی بھی اپنے خیمے کے باہر اداس بیٹھے رہتے ۔طارق کا خیمہ اندر سے خالی تھا کیونکہ زیادہ تر سامان طارق کے چاچا لے جا چکے تھے۔اس عرصے کے دوران داداجی بھی اپنے طور پر طارق کی خبر گیری کرواتے رہے مگر انہیں بھی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔

زلزلہ 8 اکتوبر کو آیا تھا اگست تک طارق لاپتہ رہا۔ایک دن کسی نے اس کے چاچا کو خاص طور پر ان کے گھر فون پر بتایا کہ اس نے طارق کا ہمشکل بری امام کے مزار کے پاس دیکھا ہے۔اس اطلاع پر اس کے چاچا فوراً اسلام آباد کے لئے روانہ ہوئے ۔چاچی بھی ضد کر کے ان کے ساتھ ہولیں ۔انہوں نے اسلام آباد پہنچ کر طارق کے دوست اقبال کو بھی ساتھ لیا پھر بری امام کے لئے روانہ ہوئے ۔مزار پر پہنچ کر انہوں نے بہت تلاش

کیا یہاں بھی حالات اتنے اچھے نہ تھے کیونکہ تقریباً سوا سال پہلے یہاں بھی بم دھماکے میں کئی لوگ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے تقریباً تین گھنٹے کی تلاش کے بعد ایک چھوٹے سے ٹیلے کے پاس ایک نوجوان نظر آیا جس کی داڑھی کافی بڑھی ہوئی تھی، کپڑے میلے کچیلے، اس کے ہاتھوں میں اسٹیل کا ایک پیالہ تھا جس میں وہ پانی پی رہا تھا۔

''طارق!'' چاچا نے جذبات سے بے قابو ہوتے ہوئے آواز دی۔ نوجوان نے نظر اٹھا کے ان کی طرف دیکھا اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہو رہی تھیں۔ اس نے دوبارہ نظریں جھکائیں اور پانی پینے میں مصروف ہو گیا۔

''طارق جواب تو دو''۔ اس دفعہ اقبال نے اسے پہچانتے ہوئے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اب کی بار بھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''طارق! کیا ہوا پتر جواب تو دو'' چاچی نے روتے ہوئے زور سے چیخ کر پوچھا۔ اس نے پانی کا آخری گھونٹ پیا اور پیالہ نیچے زمین پر پٹخ دیا۔

''کون طارق؟ میں کسی طارق کو نہیں جانتا، تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ ورنہ پھر خطرناک زلزلہ آئے گا، تمہیں بھاگنے کی بھی مہلت نہیں ملے گی۔ وہ دیکھو! پہاڑ کے اس طرف سرخی مائل روشنی دکھائی دے رہی ہے۔ سنو غور سے سنو گڑگڑاہٹ بھی سنائی دے رہی ہے۔ اب زمین ہلنے لگے گی اور زلزلہ آئے گا'' وہ آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چیخا۔
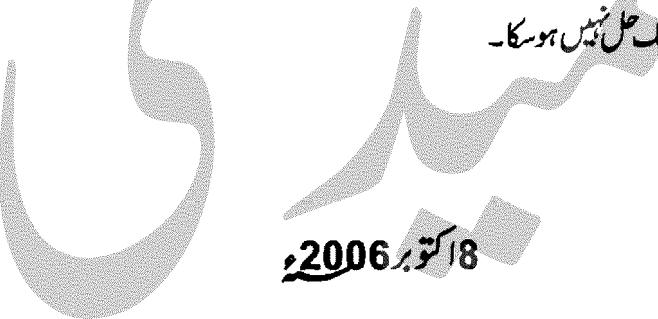
''انکل! لگتا ہے اس کی یادداشت متاثر ہو گئی ہے۔ دیکھئے کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' اقبال نے اداس لہجے میں کہا۔

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے'' چاچا نے غمناک ہوتے ہوئے کہا۔

''طارق پتر! ہوش کرو میں تمہاری چچی ہوں، ہمیں کیوں نہیں پہچان رہے ہو؟'' انہوں نے بلند آواز میں کہا۔

''میرا کوئی بھی نہیں ہے۔ سب مر گئے، تم بھی مر جاؤ گے، وہ مار دیں گے، جاؤ کہیں دور چلے جاؤ۔'' اس نے دیوانہ وار چیختے ہوئے کہا۔

''کون مار دیں گے؟'' چاچی نے زور دے کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا''۔اس نے چیختے ہوئے اپنا سر زمین سے ٹکا دیا۔ ہوا کے تیز جھونکے سے اس کی میلی قمیض اوپر کی طرف اٹھی تو اس کے پیٹ پر بڑے بڑے زخم دکھائی دیئے۔جس سے تھوڑا تھوڑا خون رس رہا تھا۔

اقبال اور چاچا نے زبردستی اسے گاڑی میں بٹھایا اور مظفر آباد کی طرف روانہ ہوئے وہاں پہنچ کر انہوں نے طارق کا حلیہ درست کروایا۔داڑھی وغیرہ صاف کروانے کے بعد اسے اسپتال لے گئے،

پندرہ دن بعد اس کے زخم ٹھیک ہو گئے اس کے بعد اس کے چاچا نے اسے ایک الگ کمرے میں رکھا،کئی عرصے بعد وہ جسمانی اعتبار سے تو ٹھیک ہو گیا تھا مگر ذہنی طور پر ٹھیک نہ ہو سکا۔وہ اپنی اور دوسروں کی شناخت ہمیشہ کے لئے کھو چکا تھا۔چاچا اور چاچی اسی بات پر خوش تھے کہ چلو ان کا بھتیجا مل تو گیا ہے،اب وہ ان کی نظروں کے سامنے موجود ہے مگر آج تک انہیں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ طارق کی یہ حالت کیسے اور کیوں ہوئی؟ یہ ایک ایسا راز تھا جس پر سے پردہ اٹھ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اصل حقیقت بتانے والا ذہنی طور پر ہمیشہ کیلئے مفلوج ہو چکا تھا۔ یہ ایک ایسا معمہ تھا جو آج تک حل نہیں ہو سکا۔

8 اکتوبر 2006ء

فاصلے جو سمٹ گئے

''کومل! اوپر A-9 میں کون لوگ ہیں جنہوں نے کرایہ پر فلیٹ لیا ہے" جمال نے کرسی گھسیٹ کر بالکونی کی طرف جاتے ہوئے پوچھا۔

''ایک بچی سمیت دو خواتین ہیں'' کومل نے چائے کی پیالی شوہر کی طرف بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔

''دو خواتین میں سے بچی کس کی ہے؟'' جمال نے معلومات کی خاطر سوال کیا

''ایک خاتون رئیسہ بیگم جو کہ پچاس سال کے قریب ہے اس کی بیٹی سبرینا ہے۔ سات سالہ بچی حنا سبرینا کی بیٹی ہے یعنی کہ رئیسہ کی نواسی، پلیز اب مزید سوال مت کرنا، مجھے اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں معلوم کیونکہ وہ لوگ پرسوں ہی یہاں شفٹ ہوئی ہیں اور وہ فلیٹ کی سیٹنگ کر رہی ہیں'' کومل نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ جمال مسکرا کر رہ گیا۔

کومل اور جمال کی سات سال قبل شادی ہوئی تھی انہوں نے اپنے لئے ایک لگژری فلیٹ بوٹ بیسن میں خریدا تھا۔ اس میں تین بیڈ روم ایک ڈرائینگ ڈائننگ اس کے علاوہ بڑا سا امریکن کچن اور لمبی سی راہداری تھی۔ فلیٹ کے دو بیڈ روم میں بالکونی تھی، یہ فلیٹ تیسری منزل پر واقع تھا جہاں سے نیچے اور باہر کا نظارہ بہت خوبصورت تھا۔ فلیٹ کے نیچے فاسٹ فوڈ ریسٹورنٹ، ویڈیو شاپز، میڈیکل اور جنرل اسٹور کے علاوہ دیگر کھانے پینے کی دکانیں، آئس کریم شاپس کے ساتھ ہی پان شاپس بھی موجود تھیں۔ فلیٹ کے بالمقابل ایک قدرتی بنی ہوئی سمندری جھیل تھی جس کا پانی کافی گہرا تھا۔ جھیل کے اختتام پر ایک بہت بڑا پارک بنا ہوا تھا جس میں رنگ برنگی پھولوں کی کیاریاں بنی ہوئی تھیں اس کے علاوہ سبزہ ہی سبزہ تھا۔ شام کے وقت ہر گر فیملی کے مرد اور خواتین یہاں روزانہ جوگنگ کیلئے آجاتے تھے جبکہ ان کے بچے جھولوں سے لطف اندوز ہوتے اور والدین اپنے اضافی وزن کو گھٹانے کے لئے چہل قدمی اس کے بعد ورزش دونوں میں مصروف نظر آتے۔ پارک کے گیٹ کے ساتھ مختلف ٹھیلے والے بچوں کی دلچسپی کا سامان کے لئے دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کی خاطر ان کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب رہتے۔

جمال اور کومل کا ایک ہی بیٹا تھا جو چھ سال کا تھا، وہ اپنی نانی کے ساتھ اسلام آباد میں رہتا تھا کیونکہ کومل اپنے والدین کی اکلوتی تھی اس کے والدین کی تنہائی کو دیکھتے ہوئے جمال نے اپنے بیٹے کو ان کے پاس چھوڑ دیا تھا۔ دانش وہیں یعنی اسلام آباد میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اکثر جمال بزنس ٹور کے سلسلے میں باہر جایا کرتا تھا، کومل بھی اس کے ساتھ ہی ہوتی یہی وجہ تھی کہ کومل کو دانش کی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ جمال نامی گرامی بزنس مین تھا، وہ دونوں ایک یا دو ماہ بعد ایک ہفتہ کے لئے اسلام آباد بیٹے کے پاس ضرور جاتے۔ اسکول کی چھٹیوں میں وہ دونوں بیٹے کے ساتھ امریکہ، لندن اور کینیڈا کا چکر لگا آتے تاکہ بیٹا والدین کی کمی کو محسوس نہ کرے۔ دو تین دن بعد وہ دونوں عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر دانش سے ٹیلیفون پر باتیں کرتے اور اس کی خیریت معلوم کرتے یہی وجہ تھی کہ دانش اپنی امی ابو سے دوری کے باوجود ذہنی طور پر ان سے قریب تھا۔ دانش کے نانا اور نانی دونوں مذہبی تھے، ان کی صحبت میں رہ کر وہ بھی مذہبی طور طریقوں سے باخبر تھا اور عمل کرنے کی کوشش کیا کرتا جمعہ والے دن وہ اپنے نانا کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے بھی جاتا تھا۔

جمال کو ضیافت میں جانے اور اپنے ہاں لوگوں کو مدعو کرنے کا بے انتہا شوق تھا یہی وجہ تھی کہ ہر پندرہ دنوں بعد ان کے ہاں چھٹی والے دن چھل پہل ہوتی۔ کومل مختلف کھانے پکا کر اور اہتمام کرتے کرتے تھک جاتی، اس کی تکلیف کو مدنظر رکھتے ہوئے جمال نے ایک خانساماں کو رکھ لیا تھا جو صبح 9 بجے آتا اور شام کو رات کا کھانا تیار کرنے کے بعد 7 بجے تک چلا جاتا کومل دو پہر کو وہ ان کے اپارٹمنٹ کے کمپاؤنڈ میں بنے گارڈ کے کمرے میں آرام کرتا۔ مارگریٹ کام والی ماسی صبح 11 بجے آنے کے بعد کپڑے دھوتی پھر برتن اور جھاڑو پونچا کر کے چلی جاتی کومل دو پہر کو عموماً آرام کیا کرتی ہاں البتہ چھٹی کے روز وہ اپنی شیراڈ کے ذریعے مختلف مارکیٹوں سے مچھلی، گوشت اور سبزیاں خرید کر لے آتی، یہ سامان وہ ایک ہفتہ تک استعمال کرتی ہمیشہ سے اس کا یہی روٹین تھا۔ اس روٹین میں تبدیلی صرف اس وقت آتی جب وہ ملک یا شہر سے باہر ہوتی، جمال کے پاس اس کی ذاتی سوک تھی وہ اپنی کار کومل کو نہیں دیتا تھا۔ اس کے لئے اس نے شیراڈ خرید کر دی تھی تاکہ گھر کا کام نہ رکے، کومل کے سامنے والے فلیٹ میں زہرا اور فریدہ دو بہنیں اپنی والدہ کے ساتھ مقیم تھیں، یہ فلیٹ ان کا ذاتی تھا۔ دونوں بہنیں غیر شادی تھیں۔ بڑی بہن فریدہ ایک قریبی اسکول میں ٹیچر تھی جبکہ چھوٹی بہن زہرا اپنے فلیٹ میں بچوں کو

ٹیوشن پڑھاتی اور گھر کا کام کاج کیا کرتی تھی جبکہ کھانا پکانے کی ذمہ داری بھی اسی پر تھی۔ فریدہ اسکول سے آنے کے بعد آرام کیا کرتی یا زیادہ سے زیادہ بازار سے ضروری سامان لانے چلی جاتی یہی وجہ تھی کہ اس کا وزن روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کا بڑا بھائی مصطفٰے شادی کرنے کے بعد الگ گارڈن روڈ پر بیوی کے ساتھ مقیم تھا۔

بوٹ بیسن کے اس لگژری اپارٹمنٹ کے ہر فلور پر دو فلیٹ بنے ہوئے تھے یہ اپارٹمنٹ چار منزلہ تھا، ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد جمال اپنے دفتر آئی آئی چندریگر روڈ کے لئے روانہ ہوا۔ کومل، مارگریٹ اور خانساماں کو ضروری ہدایت دینے کے بعد اپنے کمرے میں آ کر اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔

''مارگریٹ! کون آیا ہے؟'' کومل نے بیل کی آواز سننے کے بعد اپنے کمرے سے نکل کر پوچھا۔

''بی بی جی! اوپر والے نئے پڑوسی آپ سے ملنا چاہتے ہیں'' اس نے باورچی خانے کی طرف جاتے ہوئے جواب دیا۔ کومل بیڈ سے اپنا ڈوپٹہ اٹھالائی اور اسے ٹھیک سے اوڑھ لیا پھر دروازے پر پہنچی۔

''آیئے!'' اس نے رئیسہ بیگم، سبرینا اور اس کی بیٹی کو ڈرائینگ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ تینوں ڈرائینگ روم میں داخل ہوئیں، رئیسہ بیگم اور سبرینا صوفے پر دراز ہوگئیں جبکہ بچی حنا خوبصورت بنے ایکوریم کو دلچسپی سے دیکھنے لگی جس میں چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی مچھلیاں ایک دوسرے کے پیچھے قطار میں تیزی سے آجا رہی تھیں۔

''آپ نے اپنا نام غالباً رئیسہ بتایا تھا'' کومل نے خاتون سے پوچھا۔

''جی ہاں! میرا نام رئیسہ ہے اور یہ میری بیٹی سبرینا۔ حنا اس کی بیٹی ہے'' رئیسہ بیگم نے حنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

''آنٹی! آپ کے شوہر کہاں ہیں؟'' کومل نے بے ساختہ پوچھا۔۔

''دس سال قبل ان کا انتقال ہو چکا ہے'' رئیسہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''آئی ایم سوری، مجھے معلوم نہیں تھا'' کومل نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا

''کوئی بات نہیں تمہیں کیا معلوم۔ ہمارا تعارف تو اب ہو رہا ہے'' رئیسہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''سبرینا کے شوہر بھی یہاں نہیں رہتے وہ کہاں ہیں؟'' کومل نے پوچھا

''سبرینا کے شوہر ''ٹیپو'' لاہور میں رہتے ہیں۔ اس سے طلاق کے لئے عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے، وہ حنا کو حاصل کرنا چاہتا ہے جبکہ ہم حنا کو اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں'' رئیسہ بیگم نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ کومل نے سبرینا کو غور سے دیکھا۔ وہ چوبیس پچیس سال کی گندمی رنگت، تیکھے نقوش، پرکشش چہرے والی، لمبے قد کی دبلی پتلی سی خاتون تھی۔

''آپ لوگ لاہور سے یہاں آئے ہیں'' کومل نے اگلا سوال کیا

''سبرینا اور حنا کو میں لاہور سے کراچی لے آئی ہوں، پندرہ دن پہلے میں خود کینیڈا سے کراچی پہنچی تھی'' رئیسہ بیگم نے بتایا۔

''آپ کینیڈا میں رہتی ہیں'' کومل نے حیرت سے پوچھا۔

''جی ہاں! میرے شوہر اور بچے، ہم سب کینیڈا میں مقیم تھے۔ میرے شوہر کے انتقال کے بعد میں وہاں اپنے بھائی اختر کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ سبرینا کی پیدائش بھی کینیڈا کی ہے اور اس نے ابتدائی تعلیم کینیڈا سے ہی حاصل کی تھی۔ میں نے آٹھ سال قبل اس کی شادی لاہور میں ٹیپو سے کردی تھی۔ اس وقت سبرینا سترہ سال کی تھی اسے اس وقت اتنا شعور بھی نہ تھا۔ سسرال والوں نے سبرینا کے ساتھ بہت برا سلوک کیا، اسے تشدد کا نشانہ بنایا۔ کینیڈا میں اسے مجھ سے فون پر بات بھی نہیں کرنے دیتے تھے، مار پیٹ بھی بہت کرتے تھے۔ سبرینا کی پڑوسن نے مجھے کینیڈا فون کر کے تمام تفصیل بتائی تو میں یہاں دوڑی چلی آئی''۔ رئیسہ بیگم نے پرنم ہوتے ہوئے قصہ بیان کیا۔ کومل کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ خوش شکل لڑکی اندر سے کتنی ٹوٹی ہوئی ہے بظاہر وہ مسکراتی رہتی ہے۔

خانساماں ٹرے گھسیٹا ہوا ڈرائینگ روم میں لے آیا، اس پر نمکو، بسکٹ اور کھیر کے علاوہ چائے کا سامان بھی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔

''یہ لیجیے'' کومل نے کھیر کی پلیٹ ٹرے کے ایک طرف سرکاتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی! اتنی تکلف کی کیا ضرورت تھی ابھی تھوڑی دیر پہلے تو ہم نے ناشتہ کیا ہے'' رئیسہ بیگم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''تھوڑا سا لے لیجئے'' کومل نے ان کی طرف پلیٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ایک منٹ ٹھہریئے، آپ نے اپنا نام نہیں بتایا'' اب کی بار سبرینا نے تجسس سے پوچھا

''میرا نام کومل ہے اور میرے شوہر کا نام جمال ہے'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں آپ کے شوہر کے نام کی تختی آپ کے دروازے پر لگی ہے''۔ سبرینا نے جواباً کہا۔

'' امی! مجھے بھی تھوڑی سی کھیر دے دیجئے'' حنا نے سبرینا سے کہا۔

''لاؤ! پلیٹ آگے بڑھاؤ، میں کھیر نکال دیتی ہوں ورنہ تم قالین پر گرا دو گی'' سبرینا نے بیٹی کے ہاتھ سے پلیٹ لیتے ہوئے اسے کھیر نکال کر دی۔

''آپ کتنی شکر لیں گی آنٹی؟'' کومل نے رئیسہ بیگم سے پوچھا۔

''میں شکر نہیں کینڈرل لیتی ہوں'' اس نے وضاحت کی

''اعجاز! کچن سے کینڈرل لانا۔'' کومل نے اسے آواز دے کر کہا۔ اعجاز نے کینڈرل کی دو گولیاں اس کے کپ میں ڈال دیں، رئیسہ بیگم نے چمچے سے ہلا کر چائے کا کپ لبوں سے لگا لیا۔ سبرینا نے اپنے کپ میں شکر ڈال کر چائے کا سپ لیا۔

''حنا چائے نہیں پیتی'' سبرینا نے وضاحت کی

''اعجاز! فریج سے کولڈ ڈرنک لا دو۔'' کومل نے اسے پھر آواز دی۔ اعجاز نے پیپسی کی بوتل ٹرے پر لا کر رکھ دی

''آپ بھی ہمارے ہاں آیئے'' سبرینا نے چائے کی خالی پیالی ٹرے پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں کیوں نہیں! ضرور آؤں گی'' کومل نے جواب دیا۔ دونوں تھوڑی دیر تک گپ شپ کرنے کے بعد حنا کے ساتھ واپس چلی گئیں۔

''کومل! اوپر والی پڑوسنیں کیسی ہیں؟ آتے جاتے میری ان سے دو بار بات چیت ہوئی ہے بظاہر تو اچھی لگیں۔'' کومل کے سامنے والی پڑوسن زہرا نے اسے کریدا۔

''ہاں! اچھی ہیں مگر دکھی لگتی ہیں۔ مزید معلومات دوبارہ ملاقات پر حاصل ہوں گی'' کومل نے تبصرہ کیا۔

''یار! مجھ سے زیادہ دکھی ہوں گی کیا، میں تو آپا کی ملازمہ ہوں انہوں نے خود تو شادی نہیں کی اور میری بھی

نہیں کرنا چاہتیں'' زہرا نے منہ بناتے ہوئے کہا،

'' اگر دوسروں کے دکھ سنو اور محسوس کرو تو اپنا دکھ کم لگتا ہے'' اس نے زہرا کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

'' اچھا! سنو شام کو عظمٰی شاپنگ سینٹر چلنا ہے، مجھے وہاں سے کاٹن کے چند سوٹ خریدنا ہیں''۔ کومل نے اس کی توجہ دوسری طرف مرکوز کر دی۔

'' پانچ بجے تک بچے ٹیوشن پڑھ کر چلے جائیں گے تو پھر ہم چلتے ہیں''۔ زہرا نے اپنا پروگرام بتایا۔

'' شام کو کومل اور زہرا تیار ہو کر عظمٰی کیلئے نکل کھڑی ہوئیں، کومل نے پارکنگ سے اپنی شیراڈ نکالی اور گیٹ سے باہر نکلی اچانک سبرینا نے ہاتھ سے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ کومل نے گاڑی روک دی۔

'' خیریت، کوئی کام تھا''؟ کومل نے پوچھا۔

'' آپ کس طرف جا رہی ہیں؟'' سبرینا نے سوال کیا۔

'' ہم عظمٰی شاپنگ سینٹر جا رہے ہیں'' زہرا نے جواب دیا۔

'' مجھے آغا سپر مارکیٹ چھوڑ دیں'' سبرینا نے التجا کرتے ہوئے کہا۔

'' چلو بیٹھ جاؤ'' کومل نے رضامند ہوتے ہوئے کہا۔ وہ پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی کومل نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔

'' یہ لیں''۔ اس نے چیونگم دونوں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ان دونوں نے شکریہ کہہ کر چیونگم لیا۔

'' لاہور میں میرے پاس ٹویوٹا کرولا رہی جو میرے شوہر کی تھی مگر اسے زیادہ تر میں اپنے استعمال میں رکھتی تھی کیونکہ حنا کو اسکول چھوڑنے اور لینے جانا پڑتا تھا''۔ سبرینا نے چیونگم چباتے ہوئے کہا۔

'' تم گاڑی چلا لیتی ہو'' کومل نے پوچھا۔

'' ہاں کافی سالوں سے چلا رہی ہوں مگر میں گاڑی آپ کی طرح کم رفتاری کے ساتھ نہیں ڈرائیو کرتی بلکہ آپ سے تیز چلا لیتی ہوں''۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

'' مجھے اپنی گاڑی بہت عزیز ہے۔ یہ میرے شوہر نے مجھے گفٹ کی تھی لہٰذا میں بہت احتیاط سے ڈرائیو کرتی ہوں''۔ کومل نے وضاحت کی۔

''تمہارے شوہر اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ تو پھر تم ان سے طلاق کیوں لینا چاہتی ہو''۔ کومل نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

'' یہ شادی امی نے زبردستی ٹیپو سے کردی تھی اس کے باوجود میں نے نباہ کرنے کی کوشش کی مگر میری ساس اور سسر دونوں کی نیچر ظالمانہ ہے۔ وہ آئے دن مجھ سے گالی گلوچ کرتے اور ٹیپو سے الٹی سیدھی میری شکایت کرتے جس کی وجہ سے گھر میں جھگڑے رہتے ورنہ میرا شوہر بذات خود اچھا ہے۔ وہ گھر والوں کی باتوں میں زیادہ رہتا ہے کئی بار میں نے اس سے الگ رہنے پر اصرار کیا مگر وہ نہ مانا ہمیشہ یہی کہتا رہا کہ میں ماں باپ سے الگ ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ بات میرے ساس سسر اچھی طرح جانتے ہیں کہ ٹیپو ان کے بغیر نہیں رہ سکتا اس لئے انہوں نے پچھلے کئی سالوں سے اپنا رویہ مزید سخت کرلیا تھا، روز روز کے جھگڑوں اور پریشانیوں سے تنگ آکر میں نے یہ فیصلہ کیا''۔ سبرینا نے پوری تفصیل بیان کی۔

''پلیز روک دیں'' سبرینا نے چیخ کر کہا۔ کومل نے گاڑی روک دی

''شکریہ! مجھے سبی کہا کریں، میری امی بھی اسی نام سے پکارتی ہیں پورا نام لینے میں دقت ہوتی ہے'' سبی نے کہا اور باہر سے دروازہ بند کر کے وہ آغا سپر اسٹور میں داخل ہوگئی۔ کومل نے گاڑی شون چورنگی سے موڑی اور عظمیٰ سینٹر کی طرف آنے لگی۔

''وہ دیکھو'' زہرا نے آغا سپر اسٹور کے گیٹ پر اشارہ کیا وہاں سبی کسی نوجوان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔

وہ گورا چٹا، لمبے قد کا خوبصورت نوجوان تھا اور سفید رنگ کی شیراڈ چلا رہا تھا۔

''کومل یہ کیا ڈرامہ ہے؟ وہ ہمارے ساتھ آئی اور اس نوجوان کے ساتھ بیٹھی شاید وہ کہیں جا رہے ہیں'' زہرا نے ایک ہی سانس میں کہا۔

''یہ بات تو سبی سے پوچھیں گے تب ہی اصل حقیقت معلوم ہوگی۔ تمہیں کس بات کی پریشانی ہے'' کومل نے اسے ٹوک دیا

''یار کومل! ہمیں تو شادی کے لئے کوئی لڑکا نہیں ملتا اسے دیکھ لو، ابھی شوہر سے طلاق نہیں ہوئی ہے اور دوسرا نوجوان مل گیا'' زہرا نے سنجیدگی سے کہا

''تم بالکل پاگل ہو۔ تمہارے خاندان کے کئی لڑکوں نے تمہارے لئے رشتے بھجوائے مگر تمہاری آپا کو کام کرنا پڑے گا۔ اس لئے تمہاری شادی نہیں کرنا چاہتیں اس میں کسی کا کیا قصور؟'' کومل نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ زہرا وہ خاموش ہوگئی۔ عظمٰی سے چار کاٹن کے سوٹ خریدنے کے بعد انہوں نے گاڑی میں بیٹھ کر پیپسی پی پھر گھر کی طرف پلٹ گئیں۔ وہ سات بجے فلیٹ میں داخل ہوئیں۔

''اتنی دیر کہاں لگا دی؟'' جمال نے پوچھا۔

''سوٹ خریدنے میں دیر لگ گئی''۔ کومل نے کپڑے بیڈ پر رکھتے ہوئے کہا

''خانساماں کب گیا؟'' کومل نے پوچھا۔

''پانچ منٹ پہلے گیا ہے''۔ جمال نے مختصراً کہا۔

''آپ نے چائے پی لی۔'' کومل نے پوچھا۔

''ہاں۔ اعجاز مجھے چائے دے کر گیا ہے'' جمال نے جواب دیا۔

''اچھا سنو! میں تین چار دن کے لئے دبئی جا رہا ہوں۔ میں تمہیں ساتھ لے جاتا مگر میرا شیڈول بڑا ٹائٹ ہے تم اکیلے ہوٹل میں بور ہو جاؤ گی اگر تم چاہو تو میں تمہیں دانش کے پاس اسلام آباد بھجوا دوں''۔ جمال نے اس کی مرضی معلوم کی۔

'' نہیں میں فی الحال اسلام آباد نہیں جانا چاہتی کیونکہ دانش کا آخری سمسٹر ہے۔ میرے اس طرح جانے سے اس کا حرج ہوگا اس دفعہ چھٹیوں میں، میں اسے کراچی بلا لوں گی'' کومل نے وضاحت کی۔

''کب جانا ہے؟'' کومل نے معلوم کیا۔

''پرسوں رات سوا دس بجے ایمرٹ سے جانا ہے'' جمال نے بتایا

''ٹھیک ہے میں آپ کا سامان پیک کر دوں گی۔ مجھے صرف اتنا بتانا کہ آپ کون سے کپڑے لے جائیں گے۔'' کومل نے پوچھا۔

''میری الماری میں ہینگر پر دو سوٹ اور ایک پینٹ شرٹ لٹکی ہوئی ہے، وہ ضرور رکھ دینا اس کے علاوہ دیگر سامان اپنی مرضی سے رکھ لو'' جمال نے کہا پھر ٹی وی آن کر دیا۔

پیر کی رات آٹھ بجے جمال کے دوست اکبر نے اسے ایئر پورٹ کے لئے گھر سے لیا، اس طرح اسے دبئی روانہ ہونا پڑا۔ جمال نہیں چاہتا تھا کہ کومل اسے ایئر پورٹ چھوڑ دے کیونکہ شہر کے حالات خراب تھے۔ آئے دن ڈکیتی اور گاڑیاں چھیننے کی وارداتیں عام ہو چکی تھیں۔

''بی بی جی! اوپر والی آئی ہیں۔'' اعجاز نے بتایا۔

''اندر بھیج دو'' کومل نے بستر پر لیٹے ہی لیٹے اس سے کہا۔ سیبی اس کے بیڈ روم میں داخل ہوئی۔

''آپ کا بیڈ روم تو بہت خوبصورت ہے، دیوار پر پینٹنگ بھی دلکش لگ رہی ہے''۔ سیبی نے تعریفی انداز میں کہا۔

''میرے شوہر کو پینٹنگ جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ یہ ان ہی کا انتخاب ہے''۔ کومل نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''چلو اسی پر بیٹھ جاؤ'' کومل نے سرہانے رکھی کرسی پر اشارہ کرتے کہا سیبی کرسی آگے گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''رات جمال بھائی سوٹ کیس وغیرہ لا د کر کہاں گئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ دبئی کسی کام کے سلسلے میں گئے ہیں۔ دو دن بعد لوٹ کر آئیں گے''۔ کومل نے بتایا

''ہفتے والے روز، میں نے اور زہرا نے تمہیں آغا سپر مارکیٹ کے پاس ڈراپ کیا تھا وہاں تم ایک نوجوان کے ساتھ کسی دوسری گاڑی میں کہیں جا رہی تھیں وہ کون تھا''۔ کومل نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ سلمان تھا اس سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ اس کے والدین لاہور ہی میں رہتے ہیں اور وہ خود کراچی میں ہے۔ جیسن اپارٹمنٹ جو ہمارے اپارٹمنٹ کے سامنے ہے، اس میں وہ ملازم کے ساتھ رہتا ہے۔ طارق روڈ پر اس کی دکان ہے وہ قالین کا کاروبار کرتا ہے۔ اس کا مال امریکہ اور برطانیہ بھی جاتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ ٹیپو سے طلاق لینے کے بعد میں سلمان سے شادی کروں گی۔ وہ حنا کو بھی اپنے ساتھ رکھنے کیلئے تیار ہے'' سیبی نے بغیر کسی جھجک کے تمام باتیں کومل سے کہہ دیں۔

''سلمان کے گھر والے تم سے شادی کرنا چاہیں گے''۔ اس نے سیبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''اصل پرابلم یہی تو ہے کیونکہ سلمان کا نکاح اس کی خالہ زاد سے ہو چکا ہے اور انہوں نے سختی سے مجھ سے شادی

کی مخالفت کی ہے مگر سلمان پھر بھی مجھ سے شادی کرنے میں انٹرسٹڈ ہے''۔ سیبی نے وضاحت کی۔

''تمہاری والدہ کو اس بات کا علم ہے'' کومل نے اپنی معلومات کی خاطر پوچھا

'' ہاں! انہیں یہ بات معلوم ہے مگر وہ بھی شادی کے حق میں نہیں کیونکہ سلمان شادی شدہ ہے یعنی اس کا نکاح ہو چکا ہے۔ رخصتی کے لئے وہ ٹال مٹول کر رہا ہے۔ امی کا اعتراض ہے کہ دوسری بیوی بن کر تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ مسائل مزید بڑھ جائیں گے۔ حنا کے لئے بھی مشکلات پیدا ہوں گی''۔ اس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

''سیبی! تمہاری امی کا اعتراض بالکل بجا ہے۔ ماں اپنی اولاد کے لئے کبھی غلط فیصلہ نہیں کر سکتی، وہ اگر کہہ رہی ہیں تو تجربے کی بنیاد پر کہہ رہی ہوں گی'' کومل نے اسے مشورہ دیا۔

''میں نے خوب سوچ سمجھ کر اور حنا کے مستقبل کو محفوظ کرنے کے لئے یہ فیصلہ کیا ہے''۔ سیبی نے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''میں سلمان کو آپ سے ملانا چاہتی ہوں تاکہ آپ بھی اس کی نیچر جان لیں''۔ سیبی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہے۔ جمال واپس آجائیں تو تم سلمان کو بلوا لینا۔'' کومل نے ہامی بھرلی۔

''آپ کی عمر کتنی ہے۔ مائینڈ مت کیجئے گا۔'' سیبی نے دفعتاً پوچھ لیا۔

''ستائیسواں سال لگا ہے یعنی میں چھبیس سال کراس کر چکی ہوں'' کومل نے ہنستے ہوئے عمر بتائی۔

''دراصل میں پچیس سال کی ہوں اور میری بیٹی سات سال کی اس لحاظ سے ہم دونوں کی عمروں میں زیادہ فرق نہیں ہے یعنی آپ ستائیس سال کی ہیں اگر میں آپ کو ''تم'' کہوں تو آپ کو برا لگے گا کیا؟'' سیبی نے کومل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ہرگز نہیں''۔ کومل نے قہقہہ لگایا۔

''پھر آج سے ہم دونوں اچھے دوست ہیں، ٹھیک ہے۔'' سیبی نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''اوکے'' جواب میں کومل نے بھی کہا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں''۔ زہرا نے بیڈ روم سے اندر جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''آؤ تم بھی آجاؤ'' سیبی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا۔ زہرا اندر آ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس نے کھڑکی کا پردہ سرکایا، سامنے جھیل کا پانی چمک رہا تھا، پرندے نیچی پرواز کر کے اس میں سے چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو منہ میں دبوچ کر واپس اڑان بھر رہے تھے۔

''وہاں کیا دیکھ رہی ہو؟'' کومل نے زہرا سے پوچھا۔

''ارے یار میری بالکونی اور کھڑکی سے یہ خوبصورت نظارا نہیں دکھائی دیتا۔ تمہاری کھڑکی سے صاف نظر آتا ہے وہ دیکھ رہی ہوں'' زہرا نے دوسری کھڑکی کا پردہ بھی کھسکاتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا بات ہے؟ آج تمہیں بہت فرصت ملی ہے۔ نظارے دیکھے جا رہے ہیں۔ کھانا پکا لیا ہے کیا ورنہ تمہاری آپا تمہارا جینا مشکل کر دے گی''، کومل نے تعجب سے پوچھا۔

''جی ہاں محترمہ، میں نے مچھلی کی بریانی اور چٹنی تیار کر لی ہے۔ امی کو کھانا کھلا دیا ہے۔ میں آپا کے ساتھ کھاؤں گی۔ اس وقت میرا ریسٹ بریک ہے''۔ زہرا نے کرسی پر دراز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''سیبی! تمہارے ہاں کیا پکا ہے؟'' کومل نے پوچھ لیا۔

''امی آلو گوشت اور روٹیاں پکا رہی تھیں۔'' سیبی نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

''تمہارا خانساماں کیا پکا رہا ہے'' سیبی نے کومل سے پوچھا۔

''پالک گوشت اور ماش کی دال بنوائی ہے۔'' کومل نے مختصر جواب دیا۔

''ٹھیک ہے تم دونوں گپ شپ کرو، میں چلتی ہوں'' سیبی کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ارے بھئی، کھانا کھا کے جانا، تم اس طرح بغیر کھائے پیئے نہیں جا سکتیں''۔ کومل نے اس کا ہاتھ پکڑ کر واپس بٹھا دیا۔

''سوری! میں اس وقت نہیں کھا سکتی، حنا میرا انتظار کر رہی ہوگی دوپہر کا کھانا عموماً میں اس کے ساتھ کھاتی ہوں'' سیبی نے معذرت کر لی۔ اس کے جانے کے بعد کومل نے زہرا کو سیبی کے متعلق تمام تفصیل بتائی پھر سلمان سے شادی کا قصہ بھی بیان کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر سلمان حنا کی ذمہ داریاں اٹھانے کے لیے تیار ہے تو پھر سیبی اس سے شادی کر لے یہی بہتر ہے'' زہرا نے خیال ظاہر کیا

''میں بھی تمہاری اس بات سے متفق ہوں'' کومل نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔ جمعرات کی رات گیارہ بجے جمال نے بیل بجائی۔ کومل نے دروازہ کھولا۔ وہ ایک بڑا سوٹ کیس اٹھائے اندر داخل ہوا۔

''تم سو رہی تھیں'' اس نے کومل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں تو ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ گیارہ بجے تک پہنچ جائیں گے''۔ کومل نے اس کے ہاتھ سے شولڈر بیگ لیتے ہوئے کہا۔

''یہ بیگ اتنا بھاری کیوں ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''اب کی بار میں نے دانش کے لئے بہت سارے کپڑے اور کھلونے خریدے ہیں''۔ جمال نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد وہ دونوں بارہ بجے تک سو گئے۔

''جمال! سیبی یعنی سبرینا ایک نوجوان سلمان سے آپ کی ملاقات کرانا چاہ رہی ہے۔ وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ آپ مل لیں۔ اچھا ہے اس کا گھر دوبارہ بس جائے۔'' کومل نے ناشتے کے دوران جمال سے کہا۔

''ارے بھئی! تم مل لو۔ میرے پاس ان سب جھمیلوں کے لئے اتنا وقت کہاں ہے۔'' اس نے چائے کا سپ لیتے ہوئے مجبوری ظاہر کر دی۔ تین دن بعد سیبی نے کومل کو سلمان سے ملوایا۔

''آیئے'' کومل نے سلمان اور سیبی کو ڈرائنگ روم کی جانب لے جاتے ہوئے کہا وہاں زہرا پہلے ہی سے موجود تھی۔

''السلام وعلیکم'' زہرا نے سلمان سے مخاطب ہو کر کہا۔

''وعلیکم السلام، آپ غالباً زہرا ہیں'' سلمان نے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''جی میں زہرا ہوں'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''سیبی آپ کا تذکرہ کرتی رہتی ہے۔'' سلمان نے مختصراً کہا۔

''سیبی! تم لوگ بیٹھو میں ابھی آتی ہوں'' کومل باورچی خانے کی طرف روانہ ہوئی اس نے خانساماں اعجاز کو کافی

اور بسکٹ وغیرہ لانے کی ہدایت کی۔

''کومل میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتی ہوں۔ ٹیپو نے آج صبح مجھے طلاق نامہ بھجوایا ہے''۔ سیبی نے اطلاع دیتے ہوئے کہا۔

''چلو یہ مرحلہ بھی طے ہوگیا آگے کا کیا ارادہ ہے؟'' اس نے سلمان سے مخاطب ہوکر پوچھا۔

''انشاء اللہ چار پانچ ماہ بعد ہم دونوں شادی کرلیں گے۔'' سلمان نے سیبی کی طرف دیکھتے ہوئے وضاحت کی۔

''سیبی کی امی کو اس شادی پر اعتراض ہے۔'' کومل نے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ بلاوجہ کے اندیشوں میں مبتلا ہیں حالانکہ میں نے انہیں ہر طرح سے مطمئن کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس حوالے سے میں نے حنا کو کلفٹن گرامر اسکول میں داخل کرادیا ہے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ حنا کے تمام اخراجات میں ہی اٹھاؤں گا'' اس نے اپنے عزم کا اظہار کیا، تھوڑی دیر بعد اعجاز ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا پھر سب نے کافی پی۔

''آپ دونوں بھی میرے ہاں آئیں تاکہ میرا رہن سہن بھی دیکھ لیں'' سلمان نے اٹھتے ہوئے کومل اور زہرا سے کہا۔

''ضرور آئیں گے آپ فکر ہی نہ کریں'' زہرا نے شوخی سے کہا۔ سلمان اجازت لے کر چلا گیا سیبی اسے خدا حافظ کہنے دروازے تک گئی جب وہ جاچکا تو پھر سیبی زہرا اور کومل کی طرف آئی۔

''آپ لوگوں کو سلمان کیسا لگا؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''شکل صورت کے علاوہ عادت بھی اچھی لگی''۔ زہرا نے پہل کی۔

''حنا کے اخراجات بھی اٹھانے کے لئے تیار ہے۔ یہ بات زیادہ اہم ہے۔'' کومل نے سیبی سے مخاطب ہوکر کہا۔

''یہ تمام باتیں امی کو بھی معلوم ہیں اس کے باوجود وہ سلمان کی مخالفت کرتی ہیں۔'' سیبی نے سنجیدگی سے کہا۔

''وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہوجائے گا، پریشان مت ہو'' کومل نے اسے تسلی دی۔

وقت گزرتا رہا چار مہینے بیت گئے۔

''سیبی! سلمان نے میرے لئے کلفٹن کورٹ میں تین بیڈ روم کا فلیٹ کرائے پر لیا ہے۔ تم اور زہرا میرے ساتھ چلو، ہم تینوں وہ فلیٹ دیکھ کر آتے ہیں'' اس نے خوش ہوتے ہوئے کومل سے کہا۔ کومل نے زہرا کے فلیٹ کی بیل بجائی۔

''کیا ہے؟'' اس نے دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''سیبی کہہ رہی ہے کہ اس کا فلیٹ دیکھنے چلو'' کومل نے وضاحت کی۔

''میں دال کو بگھار رہی ہوں، پانچ منٹ بعد چلتے ہیں'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''یار! ابھی تو گیارہ بجے ہیں تم اتنی جلدی کھانا پکا رہی ہو'' سیبی نے حیرت سے پوچھا۔

''امی کو جلدی کھانے کی عادت ہے، ان کی وجہ سے مجھے جلدی پکانا پڑتا ہے'' اس نے صفائی پیش کی۔

''زہرا! میں سیبی کے ساتھ نیچے جا کر گاڑی اسٹارٹ کرتی ہوں تم جلدی سے آجاؤ'' کومل نے اس سے کہا پھر اندر سے پرس اور گاڑی کی چابی لے کر نیچے اتر گئی پانچ منٹ بعد زہرا بھی آگئی اس کے بعد وہ تینوں کلفٹن کورٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہ فلیٹ فرسٹ فلور پر تھا وہاں سلمان پہلے ہی سے ان کا منتظر تھا، وہ چند مزدوروں کے ساتھ فلیٹ کی آرائش کروا رہا تھا۔ دو بیڈ روم اس نے سیٹ کروا دیئے تھے، ڈرائنگ روم اور کچن کا مرحلہ باقی تھا، اسی سلسلے میں اس نے سیبی کو بلوایا تھا۔

''سلمان! ساز و سامان آپ ڈلوا رہے ہیں''۔ زہرا نے حیرت سے پوچھا۔

''تو پھر کون ڈلواتا۔ سیبی کی امی یہ شادی کر رہی ہیں یہی غنیمت ہے''۔ اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا سیبی شرمندہ سی ہو گئی۔

''کوئی بات نہیں۔ ایسے کاموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے''۔ کومل نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔

''کومل صاحبہ! آپ کو ہمارا فلیٹ کیسا لگا؟'' سلمان نے اچھے موڈ میں پوچھا۔

''اچھا بہت ہی اچھا ہے'' اس نے تعریف کی۔

''شکریہ! اب پندرہ دن بعد آپ کو ہماری شادی میں آنا ہے''۔ اس نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ضرور آؤں گی۔ بے فکر رہیں''۔ کومل نے مسکراتے ہوئے جملہ پورا کیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد وہ تینوں اپنے گھر کی طرف لوٹے۔

ایک ہفتے تک سیبی اپنی شادی کی شاپنگ کرتی رہی، رئیسہ بیگم نے اپنے پاس سے ایک روپیہ بھی سیبی کو شاپنگ کے لئے نہیں دیا اور نہ ہی اس نے سلمان کے لئے کوئی چیز خریدی۔ شاپنگ کے تمام پیسے سلمان نے اسے دیئے تھے۔

پندرہ دن بعد سیبی کی شادی اس کی کزن حمیرا کے گھر پر چند رشتہ داروں کی موجودگی میں ہوگئی۔ اس میں رئیسہ بیگم نے رسمی طور پر شرکت کی تھی۔ وہ مہمانوں کی طرح آئیں اور مہمانوں کی طرح واپس چلی گئیں۔ اس شادی میں کومل اور زہرا نے بھی شرکت کی۔ شادی کے بعد سیبی حنا کے ساتھ سلمان کے فلیٹ میں شفٹ ہوگئی۔ سیبی اور حنا کے ساتھ سلمان کا ذاتی ملازم خانو بھی اسی فلیٹ میں آ گیا۔ وہ گھر کے کام کاج کے علاوہ کھانا بھی پکاتا تھا۔ کومل اور زہرا سیبی سے زیادہ تر ٹیلی فون پر ہی باتیں کیا کرتیں۔ رئیسہ بیگم کی عدم توجہی اور خود غرضی کی بناء پر سلمان نے سیبی کا وہاں آنا جانا بہت ہی کم کروا دیا تھا صرف حنا کی وجہ سے اسے اپنی امی کے پاس کبھی کبھار جانا پڑتا تھا۔ شادی کے بعد سیبی اور حنا دونوں بہت خوش تھیں کیونکہ سلمان نے اسے سوزوکی ایف ایکس خرید کر دی تھی تاکہ حنا کو وہ اسکول سے واپس لے آئے ہاں البتہ صبح کے وقت وہ اسے اسکول میں خود ہی ڈراپ کر دیا کرتا۔

سلمان نے حنا کا بہت زیادہ خیال رکھا تھا اسے کوئی شکایت کا موقع نہیں دیتا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے سگے باپ ٹیپو کو بھول گئی تھی۔

کومل کا بیٹا چھٹیوں میں اپنی نانی کے ساتھ اسلام آباد سے کراچی پہنچ گیا تھا۔ اس وجہ سے کومل بہت خوش تھی۔

سیبی نے فون کیا تو کومل نے ریسو کیا۔

''کیا حال ہیں؟ تم نے اور زہرا نے میری پلٹ کر خبر نہیں لی''۔ سیبی نے شکایت کی۔

''دراصل میرا بیٹا دانش امی کے ساتھ اسلام آباد سے آیا ہے، میں اسی کے ساتھ مصروف ہوں۔ جمال بھی دفتر سے جلدی گھر آ جاتے ہیں لہٰذا وقت ہی نہیں ملتا۔'' کومل نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

''سوری، مجھے معلوم نہیں تھا کہ دانش اسلام آباد سے آیا ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے حنا کے ساتھ تمہارے گھر

آ رہی ہوں تا کہ آنٹی اور دانش سے مل لوں؟'' اس نے خواہش ظاہر کی۔

شام چار بجے۔سیبی، حنا اور سلمان کومل کے گھر آئے انہوں نے دانش کے لئے بہت ساری ٹافیاں اور کھلونے خرید لئے تھے اس کے علاوہ کومل کی والدہ کے لئے سونی سویٹ سے مٹھائی بھی لی تھی۔

''آنٹی آپ کیسی ہیں؟'' سیبی نے کومل کی والدہ کے گلے لگتے ہوئے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، تم کیسی ہو؟'' کومل کی امی آمنہ بیگم سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

''یہ تمہاری بیٹی ہے۔ بڑی پیاری ہے''۔انہوں نے حنا کی طرف اشارہ کیا۔

''ہاں! یہ میری اکلوتی بیٹی ہے اور یہ اکلوتے شوہر ہیں''۔سیبی نے شوخی سے سلمان کی طرف دیکھتے ہوئے تعارف کرایا تقریباً آدھے گھنٹے بعد سیبی اور سلمان حنا سمیت واپس اپنے گھر روانہ ہوئے۔

''یہ تمہاری دوست اچھی عادت کی لگتی ہے، کہاں رہتی ہے''؟ آمنہ نے کومل سے پوچھا۔

''ہاں قریب ہی رہتی ہے۔اس کی والدہ ہمارے فلیٹ کے اوپر والی منزل میں مقیم ہیں''۔کومل نے مزید تفصیل بتائی تھوڑی دیر بعد زہرا نے بیل بجائی۔

''آؤ! کوئی خاص بات ہے، تم شام کو میرے پاس بہت کم آتی ہو یقیناً کوئی اہم بات کہنا چاہ رہی ہو''۔کومل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''میں یہ کہنے کے لئے آئی تھی کہ سیبی پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوگئی ہے اس کے علاوہ سلمان نے اسے کافی زیورات بنوا دیئے ہیں۔ وہ بہت خوش ہے''۔اس نے سرگوشی کی۔

''ظاہر ہے سلمان نے اسے خوش رکھا ہے۔اس کا اور حنا کا بہت خیال رکھتا ہے سیبی پرسکون ہے وہاں اسے ہر طرح کا آرام ہے پھر وہ کیسے نہ نکھرتی''۔کومل نے اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا۔

''کہاں سے آ رہی ہو؟'' سیبی کی امی رئیسہ بیگم نے کومل کو زینے سے اوپر آتے ہوئے پوچھا وہ کسی کام سے نیچے کی طرف جا رہی تھی۔

''دانش کو آئسکریم دلوانے گئی تھی''۔اس نے مختصر جواب دیا اسی دوران دانش بھاگ کر اپنے فلیٹ میں داخل

ہوا۔

''پرسوں تمہارے پاس سیبی آئی تھی، حنا بھی اس کے ساتھ تھی نا''۔ رئیسہ بیگم نے کنفرم کرنے کی کوشش کی۔

''ہاں وہ سلمان اور حنا کے ساتھ آئی تھی'' کومل نے جواباً کہا۔

''حنا کو میرے پاس بھی نہیں بھیجا، میں کوئی اس کی دشمن تھوڑی ہوں بس میں سلمان کو پسند نہیں کرتی اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ مجھ سے ملنا ہی چھوڑ دے''۔ رئیسہ بیگم نے شکوہ کیا۔

''آنٹی اب آپ کو سلمان سے کمپرومائیز کر لینا چاہیئے۔ وہ دونوں اس کے ساتھ بہت خوش ہیں والدین کے لئے اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟'' کومل نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''سیبی کو میری باتوں کا اور اعتراض کا اندازہ اس وقت ہوگا جب سلمان اپنی خالہ زاد کو رخصت کرا کے اپنے گھر لے جائے گا۔ دیکھنا بیٹا! جیسن اپارٹمنٹ میں اس کا فلیٹ بالکل خالی پڑا ہے۔ وہ سیبی کو وہاں بھی لے جا سکتا تھا جبکہ وہ فلیٹ اس کا ذاتی ہے، کلفٹن کورٹ میں کرائے کے فلیٹ میں سیبی اور حنا کو رکھا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گھر والوں کے پریشر میں ہے۔ میں نے اپنے تجربے کی بنیاد پر اس شادی کی مخالفت کی تھی۔ اللہ کرے آگے سب ٹھیک ہی ہو''۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے زینے اترنے لگی کومل اسے دیکھتی رہی۔

''اللہ کرے سب ٹھیک ہی ہو'' کومل نے زیر لب کہا اور اندر کمرے میں داخل ہوئی۔

''خانو! آپ نے سلمان کی پہلی بیوی کو دیکھا ہے''۔ سیبی نے سلمان کے ملازم کو کریدا۔

''ہاں! بی بی جی میں نے دیکھا ہے'' اس نے جواب دیا۔

''وہ کیسی ہے''۔ سیبی نے تجسس سے پوچھا۔

''وہ گورے رنگت کی دبلی پتلی سی لڑکی ہے''۔ خانو نے مزید بتایا۔

''سلمان کے والدین اس سے خوش ہیں''۔ سیبی نے معصومیت سے پوچھا۔

''کیوں خوش نہیں ہوں گے وہ ان کی اپنی ہے۔ سلمان صاحب کی خالہ زاد ہے۔ اس کے علاوہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اور کافی جائیداد کی مالک ہے''۔ خانو نے معلومات فراہم کیں۔ یہ سننے کے بعد سیبی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ آنے والے وقت کا تصور کر کے وہ کانپ سی گئی۔ اس کا دل دکھی ہو گیا۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔

بیل کی آواز پر خانو نے دروازہ کھولا، کومل اور زہرا دانش کے ساتھ اندر داخل ہوئیں۔

''ارے بھئی آج سورج کہاں سے طلاع ہوا کہ تم دونوں آ گئیں''۔ سیبی نے حیرت سے پوچھا۔

''کافی دنوں سے تمہاری یاد آ رہی تھی سوچا کہ آج تم سے مل لیں'' زہرا نے وضاحت کی۔

''دانش آپ حنا کے ساتھ اس کے کمرے میں جائیں اور کھیلیں''۔ سیبی نے دانش کو حنا کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بھیجا وہ دوڑ کر اس کمرے میں داخل ہوا۔

''چلو آؤ تم دونوں یہاں بیٹھو'' سیبی نے کومل اور زہرا کو اپنے بستر پر بٹھایا۔

''تمہارا بیڈ روم کافی خوبصورت ہے، ڈریسنگ ٹیبل بھی اچھی ہے''۔ زہرا نے تعریف کی۔

''شکریہ!'' سیبی نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے کہا۔

''کیا بات ہے سیبی تم کچھ پریشان سی لگ رہی ہو'' کومل نے سوال کیا۔

''دراصل سلمان کے گھر والے اس پر رخصتی کے لئے دباؤ ڈال رہے ہیں''۔ اس نے اداس لہجے میں کہا۔

''تمہاری امی اس لئے اس شادی سے خوش نہیں تھیں۔ بڑوں کی باتوں میں وزن ہوتا ہے اسے مان لینے ہی میں عافیت تھی خیر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سلمان اچھے کردار کا مالک ہے۔ وہ تم سے کوئی زیادتی نہیں کرے گا''۔ کومل نے اسے تسلی دی۔

''کومل! سلمان تو اچھا ہے مگر اس کی بیوی کی رخصتی سے میں ذہنی اذیت کا شکار ہوں۔ مجھے اس سے جلن محسوس ہو رہی ہے، میں سلمان کے ساتھ اس کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتی۔'' سیبی نے اپنے دلی کیفیت کا اظہار کیا۔

'سیبی یہ بات ذہن نشین کر لو کہ سلمان کا نکاح تم سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔ تم اس کی جگہ پر خود کو رکھ کر دیکھو کہ اس کے دل پر تمہاری شادی کا سن کر کیا گزر رہی ہوگی۔'' کومل نے اسے احساس دلایا۔

''مگر سلمان نے اپنی پہلی بیوی ماریہ اور اپنے گھر والوں کو مجھ سے شادی کا نہیں بتایا۔ وہ اس بات سے لاعلم ہیں ہاں انہیں یہ معلوم ہے کہ سلمان مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے''۔ سیبی نے تفصیل بتائی۔

''جو بھی ہو ماریہ کو یہ پتا ہے کہ اس کا شوہر کسی اور میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اس کے دل پر ان باتوں کا کتنا اثر ہوا

ہوگا۔ یہ بھی سوچ لو''۔اس نے سیبی کو باور کرایا۔وہ چپ ہوگئی۔

''خانو! چائے لے آؤ'' سیبی نے ملازم سے کہا۔تھوڑی دیر بعد خانو چائے لے آیا اس کے علاوہ اس نے دانش کے لئے کولڈ ڈرنک گلاس میں انڈیل کر اسے دے دی۔ایک گھنٹے وہاں گزارنے کے بعد کومل اور زہرا اپنے گھر کے لئے روانہ ہوئے۔

یار! یہ سیبی تو مشکل میں پھنس گئی ہے اس کا چہرہ بھی مرجھا سا گیا ہے۔اسے پریشان دیکھ کر میں اداس ہوگئی ہوں''۔زہرا نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں بات تو واقعی پریشانی والی ہے اب تو سیبی کے لئے اپنے میکے واپسی کا بھی کوئی راستہ نہیں رہا رئیسہ آنٹی اس شادی سے خوش نہیں تھیں وہ تو سیبی کا حشر کر دیں گی ویسے بھی وہ سخت گیر خاتون ہیں''۔کومل نے خدشہ ظاہر کیا۔

''چلو چھوڑو ان باتوں کو اللہ سے دعا کرو کہ وہ بہتر کرے''۔زہرا نے تکلیف دہ پہلو کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی۔

چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں، کومل اپنی امی اور بیٹے کے ساتھ اسلام آباد روانہ ہوئی۔جمال نہیں گیا وہ وہاں پندرہ دن رہنے کے بعد پی آئی اے کے ذریعے کراچی پہنچی۔وہ اتوار کی رات ساڑھے دس بجے گھر آ گئی تھی۔

پیر کی صبح جمال دفتر کے لئے روانہ ہوا تو کومل نے زہرا کے دروازے پر ہلکے سے دستک دی تو اس نے دروازہ کھولا۔

''تم کب پہنچیں؟ میں تو سمجھی کہ اب تم اسلام آباد میں ہی رہو گی''۔زہرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''کافی دنوں کے بعد گئی تھی نا۔ابو نے زبردستی روک لیا تھا اس لئے پندرہ دن رکنا پڑا۔'' کومل نے صفائی پیش کی۔

''اور سناؤ سیبی کیسی ہے؟ اس سے ملاقات ہوئی تھی کیا۔'' کومل نے اس کے متعلق پوچھا۔

''وہ بہت پریشان ہے۔سلمان رخصتی پر آمادہ ہوگیا ہے کیونکہ اس کی والدہ مسلسل رخصتی کا کہہ رہی تھیں۔اگلے ہفتے اس کا ولیمہ سبزہ زار میں ہو رہا ہے''۔زہرا نے اداس لہجے میں سیبی کے متعلق بتایا۔کومل بھی افسردہ ہوگئی۔

''شام کو ہم اس کی طرف چلیں کیا''۔اس نے زہرا سے پوچھا۔

''ایسے موقع پر ہمیں اس کے پاس ضرور جانا چاہئے تاکہ اس کی گھٹن کم ہو''۔ زہرا نے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔

شام پانچ بجے کے قریب وہ دونوں تیار ہو کر سیبی کے گھر پہنچیں۔ کومل اور زہرا کو دیکھتے ہی سیبی سسک پڑی۔

''چپ ہو جاؤ سب بہتر ہو گا۔ پریشان ہونے سے تمہاری صحت متاثر ہو گی اور حنا پر اس کا برا اثر پڑے گا۔ خود کو سنبھالو''۔ کومل نے اسے تسلی دی۔

''کومل! سوچ سوچ کر میرا ذہن تھک گیا ہے سلمان نے بھی حوصلہ دیا ہے مگر کیا کروں۔ مجھے کسی پل بھی قرار نہیں ہے۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''اس اتوار کو اس کا ولیمہ ہے۔ اب وہ میرے پاس صرف دن کے وقت آیا کرے گا۔ یہ بات میرے لئے تکلیف دہ ہے''۔ سیبی نے اپنے خوبصورت بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''سیبی خود کو سنبھالو ایسے پریشان ہونے سے کام نہیں چلے گا۔ ہمت سے کام لو۔ تم صرف حنا کے متعلق سوچو''۔ کومل نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی ہمت کو بڑھانے کی کوشش کی مگر وہ ان باتوں سے قائل نہیں ہو سکی وہاں ایک گھنٹہ رکنے کے بعد کومل زہرا کے ساتھ واپس آ گئی۔ تمام راستے وہ دونوں خاموش رہیں کیونکہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا۔

اتوار کے دن سیبی تمام دن روتی رہی۔ حنا اس کیفیت سے ناواقف تھی۔ وہ بھی پریشان ہو گئی۔ اس پریشانی کے عالم میں حنا نے اپنی نانی کو فون کیا وہ فوراً کلفٹن کورٹ دوڑی چلی آئی۔ سیبی کو اس حال میں دیکھ کر وہ گھبرا گئی۔ خانو نے تمام قصہ ان سے کہہ دیا۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ سلمان سے شادی مت کرنا مگر تم نے میری بات نہیں مانی۔ اب رونے پیٹنے سے کیا ہو گا اپنی صحت خراب کرو گی اس سے حنا پر بھی برا اثر پڑے گا لہٰذا میں اسے اپنے ساتھ لے جا رہی ہوں۔ اس کا اسکول ہمارے گھر کے سامنے ہے، میں اسے صبح اسکول چھوڑ دیا کروں گی، تم چھٹی کے وقت لے آنا''۔ رئیسہ بیگم نے حکم صادر کیا پھر حنا کے کپڑے پیک کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ سیبی منہ دیکھتی ہی رہی۔

رات کے نو بج گئے، آج تمام دن سلمان نے اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

سیبی تیار ہو گئی اور گاڑی نکال کر سڑکوں پر پھرتی رہی۔ اس طرح گھومتے پھرتے رات کے ساڑھے دس بج گئے

وہ وہاں سے سیدھی سبزہ زار پہنچی۔ سبزہ زار میں مہمانوں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا اسے دیکھ کر کئی لوگوں نے مہمان سمجھ کر اندر بلوایا وہ اسٹیج سے دور کھڑی دلہا اور دلہن کو دیکھتی رہی، تقریباً پانچ سو سے اوپر مہمان سبزہ زار میں موجود تھے۔ یہ تقریب بڑی رنگا رنگ تھی۔ یہ منظر دیکھ کر وہ اندر ہی اندر جلتی اور کڑھتی رہی کیونکہ اس کی شادی چند مختصر سے لوگوں کے درمیان گھر میں ہی ہوئی تھی اسے اپنی پہلی شادی کا بھی اتنا شعور نہیں تھا کیونکہ وہ اس وقت کم عمر تھی۔ جب کھانا شروع ہوا تو وہ خاموشی سے باہر چلی آئی پھر گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف روانہ ہوئی، راستے میں گاڑی روک کر اس نے ویلم فائیو کی تین گولیاں خریدیں اور گھر آ گئی۔ خانو نے کھانا لگایا مگر اس نے نہیں کھایا۔ پانی منگوا کر اس نے تین ویلیم فائیو کی گولیاں اکٹھے ہی نگل لیں اور بستر پر دراز ہوگئی۔

دوپہر بارہ بجے سلمان نے اسے جھنجھوڑا تو وہ اٹھ بیٹھی مگر غنودگی کی وجہ سے اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔

سلمان نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے تب وہ بیدار ہوئی۔

''یہ کیا پاگل پن ہے۔ یہ گولیاں تمہیں کس نے دیں''۔ سلمان نے خالی ریپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کو اس سے کیا؟ یہ میں نے خریدیں تھیں''۔ سیبی نے چیخ کر کہا۔

''خانو! یہاں آئیں، آئندہ رات کے وقت اسے باہر مت جانے دینا سمجھے''۔ سلمان نے غصے کے عالم میں ملازم سے کہا۔

''جاؤ ناشتہ لے آؤ''۔ سلمان نے ملازم سے چیخ کر کہا۔

سیبی جاؤ! باتھ روم سے فریش ہو کر آ جاؤ''۔ سلمان نے سختی سے کہا۔ سیبی پندرہ منٹ بعد منہ ہاتھ دھو کر غسل خانے سے باہر نکلی۔ سلمان اسے ڈائننگ ٹیبل تک لے آیا تاکہ وہ ناشتہ کر لے۔

''حنا کو اسکول کون لے کر گیا تھا''۔ اس نے دفعتاً پوچھا۔

''امی حنا کو اپنے ساتھ گھر لے گئی ہیں''۔ سیبی نے دھیرے سے کہا۔

''کیوں؟ انہیں یہاں کس نے بلایا تھا''۔ سلمان نے چیختے ہوئے پوچھا۔

''حنا نے فون کر کے بلوایا تھا، میرے رونے سے وہ ڈر گئی تھی''۔اس نے وضاحت کی۔

''تمہیں رونے کی کیا ضرورت تھی، ایسا کیا ہو گیا تھا، اب تمہاری امی حنا کا برین واش کر دیں گی''۔سلمان نے ہاتھ میز پر مارتے ہوئے کہا۔

''یہاں میری حالت بُری ہو رہی ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ رونے کی کیا ضرورت تھی۔اس وقت مجھے خود پر اختیار نہیں ہے''۔بیبی نے کمزور اور نقاہت بھری آواز میں کہا۔

''اچھا چلو ناشتہ کر لو! مجھے بھی جلدی جانا ہے''۔سلمان نے ٹوس پر مکھن لگا کر اس کے پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''اب کہاں جانا ہے؟ ابھی تو آئے ہیں''۔اس نے شکایتاً کہا۔

''میرے فلیٹ میں مہمان پنجاب سے آ کر ٹھہرے ہوئے ہیں اس کے علاوہ امی اور ابو بھی موجود ہیں۔ان سب کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرانا ہے۔اس سے فارغ ہو کر میں چکر لگاؤں گا۔تم پریشان مت ہونا''۔سلمان نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔بیبی نے خاموشی سے ناشتہ کیا اور بیڈ روم میں آ گئی،تھوڑی دیر بعد سلمان چلا گیا۔بیس منٹ بعد اس نے حنا کو گھر کے پاس ڈراپ کیا اور خود وہیں سے واپس لوٹ گیا۔

دستک پر خانو نے دروازہ کھولا تو حنا اسکول بیگ لئے اندر داخل ہوئی

''تمہیں کون اسکول سے لایا؟''بیبی نے اس کا بیگ ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ابو نے ڈراپ کیا ہے''۔اس کا اشارہ سلمان کی طرف تھا''۔بیبی نے الماری سے اس کے کپڑے نکالے اور اسے یونیفارم بدلنے کے لئے کہا۔

''رات نانی نے کیا کھلایا''۔اس نے حنا کے جوتے مسہری کے نیچے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''دال، چاول اور آلو کی سبزی پکائی تھی وہ ہم دونوں نے کھائی''۔حنا کا جواب مختصر تھا۔

''اور کچھ کہہ رہی تھیں''۔بیبی نے پوچھا۔

''ہاں! وہ کہہ رہی تھیں کہ سوتیلے ابو اچھے نہیں ہوتے،تم میرے پاس رہو میں تمہیں کینیڈا لے جاؤں گی اور وہاں اچھی تعلیم دلواؤں گی''۔حنا نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

یہ جواب سننے کے بعد سبی کا موڈ یکدم خراب ہو گیا۔ وہ غصے سے اٹھی گاڑی اسٹارٹ کی اور سیدھی اپنی امی کی طرف روانہ ہوئی۔

''امی! آپ کیا کر رہی ہیں؟ میری بیٹی کو میرے اور سلمان کے خلاف کر رہی ہیں۔ میں ویسے ہی سلمان کی شادی سے پریشان ہوں بجائے اس کے کہ میرا حوصلہ بڑھائیں، آپ میری مشکلات میں مزید اضافہ کر رہی ہیں''۔ سبی نے حنا کا بیگ الماری سے نکالتے ہوئے کہا۔

''یہ بیگ کہاں لے جا رہی ہو؟'' رئیسہ بیگم نے پوچھا۔

''میں اپنی بیٹی کو اپنے ہی ساتھ رکھوں گی۔ میں اسے آپ کے ساتھ نہیں رکھ سکتی۔ آپ اس کا برین واش کر دیں گی، لائیے میرا پاسپورٹ دے دیجیے۔'' اس نے چیختے ہوئے کہا۔ رئیسہ بیگم نے الماری سے اس کا پاسپورٹ نکال کر دیا۔ وہ پاسپورٹ لئے واپس لوٹی۔

ایک ہفتے کے دوران رئیسہ بیگم نے بڑی خاموشی سے گھر کا فرنیچر فروخت کر دیا، کومل اور زہرا کو خبر تک نہ ہو سکی۔

''آنٹی آپ کہاں جا رہی ہیں؟'' کومل نے رئیسہ بیگم کو سوٹ کیس سمیت ٹیکسی میں سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں کینیڈا واپس جا رہی ہوں''۔ انہوں نے مختصر سا جواب دیا۔

''سبی سے ملاقات نہیں کریں گی۔'' کومل نے حیرت کا اظہار کیا۔

''میرا اس سے کوئی تعلق نہیں''۔ انہوں نے غصے میں کہا۔

''وہ اس وقت مشکل میں ہے بحیثیت ماں آپ اس کا دکھ بانٹیں۔ آپ اسے اس حال میں چھوڑ کر جا رہی ہیں''۔ کومل نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔

''خود کو اس حال میں پہنچانے والی وہ خود ہی ہے میں کیا کر سکتی ہوں۔ میں نے بہت سمجھایا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اب بھگت رہی ہے۔ میں اس کی وجہ سے یہاں زیادہ عرصے نہیں رہ سکتی، وہ جانے اس کا کام جانے''۔ رئیسہ بیگم نے دل کی بھڑاس نکالی اور ٹیکسی ڈرائیو کو چلنے کا اشارہ کیا۔

کومل انہیں دور تک جاتے دیکھتی رہی اوپر آنے کے بعد اس نے سبی کو فون پر رئیسہ بیگم کے جانے کی اطلاع دی۔ یہ جاننے کے بعد سبی کو صدمہ سا ہو گیا وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی، وہ خود کو تنہا محسوس کرنے

لگی۔

''پلیز! سبی چپ ہو جاؤ، رونے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا، ہوش سے کام لو خود کو تنہا مت سمجھو۔ ہم ہیں نا تمہارے ساتھ جو ہم سے ہو سکا وہ کریں گے''۔ کومل نے اسے تسلی دی۔

سلمان ولیمے کے بعد سے سبی کے پاس صرف دن کے وقت ہی آتا اور رات کے وقت وہ ماریہ کے ساتھ جیسن اپارٹمنٹ میں ہی ٹھہرتا۔ اس کے والدین بھی وہیں اس کے ساتھ مقیم تھے۔ اس تبدیلی نے سبی کی صحت پر بہت برا اثر ڈالا تھا وہ کمزور ہو گئی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے چہرے کی شادابی ماند پڑ گئی تھی۔ اس بات کو سلمان بھی محسوس کر رہا تھا مگر وہ بھی اپنی جگہ مجبور تھا۔ اس کے اور سبی کے درمیان سرد جنگ جاری تھی، حنا اس صورت حال سے ڈسٹرب ہو گئی تھی۔

''سبی! میں امی ابو اور ماریہ کو لاہور لے جا رہا ہوں ایک ہفتے بعد لوٹ آؤں گا اس دوران حنا کو اسکول چھوڑنے اور لانے کی ذمہ داری تمہاری ہے''۔ سلمان نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''ظاہر ہے حنا میری ہی ذمہ داری ہے اور میں اپنی ذمہ داری کو اچھی طرح سمجھتی ہوں''۔ سبی نے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس جواب پر سلمان نے اسے گھور کر دیکھا اور ایک انگریزی کے میگزین کی ورق گردانی کرنے لگا۔

دو دن بعد سلمان ماریہ اور اپنے والدین سمیت پی آئی اے کی پرواز سے لاہور کے لئے روانہ ہوا۔

اس کے لاہور جانے سے سبی مزید اداس ہو گئی۔ اب وہ رات کو بغیر نیند کی گولیاں استعمال کئے نہیں سو سکتی تھی۔ ان گولیوں کی وجہ سے اس کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تھی۔ وہ صبح حنا کو اسکول ڈراپ کرنے کے بعد گھر واپس آ جاتی، دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد گھر کا سودا وغیرہ خریدنے چلی جاتی اس کے بعد واپسی پر حنا کو اسکول سے پک کر لیتی۔ کھانے سے فراغت کے بعد حنا کو وہیں محلے میں ٹیوشن کے لئے بھیج دیتی اور خود کومل سے ملنے چلی جاتی یا پھر بغیر کسی مقصد کے سڑکوں پر آوارہ گردی کرتی۔

اچانک سرخ سگنل ہو گیا سبی نے یکدم گاڑی روک دی۔ پوری قوت سے بریک لگنے کے باعث پہیوں کی رگڑ سے شور پیدا ہو گیا کئی لوگوں نے مڑ کر اس کی کار کی طرف دیکھا۔ اس کی گاڑی کے برابر ایک سفید رنگ کی ہنڈا سوک آ کر رکی۔ اس میں ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان نیلے رنگ کے سوٹ میں ملبوس ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ سبی

کو دیکھ کر مسکرایا جواب میں سیبی بھی مسکرادی۔گرین سگنل پر دونوں گاڑیاں آگے بڑھ گئیں تھوڑی دور جانے کے بعد سیبی نے اپنی سوزوکی ایف ایکس کا رخ کلفٹن کورٹ کی طرف موڑ کرلیا۔وہ تمیرین چورنگی سے ہوتی ہوئی اپنے گھر کی طرف آنے لگی تو دفعتاً سوک اس کی گاڑی کے آگے آ کر رکی۔سیبی نے یکدم بریک لگائے۔

''یہ کیا بدتمیزی ہے؟'' سیبی نے گاڑی سے گردن باہر نکال کر کہا۔

''آپ سے دوستی کرنے کے لئے مجبوراً یہ کرنا پڑا''۔اس نے دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے کہا۔

''آپ کو یہ خوش فہمی کیسے ہوگئی کہ میں آپ سے دوستی کرلوں گی''۔سیبی نے گاڑی ریورس کرتے ہوئے پوچھا۔

''مجھے یقین ہے کہ آپ مجھ سے دوستی ضرور کریں گی''۔نوجوان نے یہ بات زور دے کہ کہی اور آگے نکل گیا۔

سیبی نے اس کی گاڑی کا نمبر نوٹ گیا۔نمبر پلیٹ پر صرف 555 لکھا ہوا تھا۔یہ نمبر دیکھ کر وہ زیرلب مسکرائی۔

گھر پہنچ کر اس نے حنا کا ہوم ورک چیک کیا۔چائے پی اس کے بعد بستر پر دراز ہوگئی۔

سلمان کو لاہور گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا اس دوران اس نے صرف دوبار سیبی کو فون کیا تھا۔اس نے فون پر بتایا تھا کہ لاہور میں اس کے رشتہ داروں نے دعوتوں کا سلسلہ شروع کررکھا ہے جس کی وجہ سے فون کرنے کا وقت نہیں ملتا۔اس بات نے سیبی کو سلمان سے مزید بدظن کردیا تھا۔

جمعہ کا دن تھا۔کئی دنوں سے حنا پارک چلنے کی ضد کررہی تھی۔شام چار بجے کے بعد سیبی نے حنا کو تیار کیا پھر گاڑی کے ذریعے بوٹ بیسن پارک لے آئی۔اس نے اپنی گاڑی باہر ایک طرف پارک کی پھر حنا کے ساتھ پارک کے گیٹ کے اندر داخل ہوئی وہاں بہت سارے جوڑے اپنے بچوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے اس کے علاوہ کچھ بچے جھولا جھول رہے تھے، کچھ پاپ کورن اور آئسکریم سے لطف اندوز ہورہے تھے۔

سیبی کو سلمان کی یاد ستانے لگی مگر وہ اسے صرف اپنا نہیں کہہ سکتی تھی، وہ بٹا ہوا تھا۔اس وقت وہ اس کا نہیں بلکہ ماریہ کا سلمان تھا جس پر اس کا بس نہیں تھا۔دنیا کی نظروں میں حقیقتاً ماریہ ہی اس کی بیوی تھی جبکہ سلمان نے سیبی کے ساتھ اپنے والدین سے چھپ کر شادی کی تھی۔اس کی شادی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔یہ سوچتے ہوئے سیبی کی آنکھیں بھر آئیں۔اس نے ٹشو سے آنکھیں پونچھ لیں۔

''امی! میں آئسکریم کھاؤں گی''۔حنا نے ضد کی۔

''یہ لو پیسے اور وہاں جا کر خرید لو''۔ اس نے پرس سے پچاس کا نوٹ حنا کو دیتے ہوئے کہا۔ وہ خوش ہو کر آئسکریم خریدنے چلی گئی۔

''ہیلو کیا حال ہے''؟ کسی نے پشت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ وہ پلٹ کر اسے دیکھنے لگی وہ سوک والا نوجوان تھا جو دو دن پہلے سگنل پر ٹکرایا تھا۔ سبی نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی، بلکہ وہ حنا کو دیکھتی رہی کہ آیا وہ آئسکریم خرید چکی ہے یا نہیں۔

''میں نے کہا، کیا حال ہیں؟ کہاں کھوئی ہوئی ہیں'' وہ پشت کی جانب سے نکل کر سبی کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''میں اجنبی لوگوں کے سوالوں کا جواب نہیں دیا کرتی''۔ اس نے اپنے سر کے بالوں کو پیچھے کی طرف جھٹکتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''یہ کس نے آپ سے کہہ دیا کہ ہم اجنبی ہیں، یہ ہماری دوسری ملاقات ہے، دوسری ملاقات میں بندہ اجنبی نہیں رہتا''۔ اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

''کیا چاہتے ہیں آپ؟'' سبی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا

''میں آپ کا نام اور حدود اربعہ جاننا چاہتا ہوں''۔ اس نے سبی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''جی میرا نام سبرینا ہے، وہ رہا میرا حدود اربعہ''۔ اس نے حنا کی طرف اشارہ کیا جو آئسکریم خرید کر سبی کی طرف واپس آ رہی تھی۔ اس نے گہری نظروں سے سبی کی طرف دیکھا پھر حنا کا جائزہ لیتا رہا۔

''نام بتانے کا شکریہ! میرا نام محسن ہے۔ میں ڈیفنس خیابان سحر میں رہتا ہوں''۔ اس نے سنجیدگی سے کہا پھر آگے بڑھ گیا سبی نے اس کی اچانک تبدیلی نوٹ کی اور مسکرا دی۔

''بڑا آیا حدود اربعہ معلوم کرنے والا بیٹی کے انکشاف پر سیٹی گم ہوگئی اور سارا عشق کا بھوت اتر گیا''۔ وہ بڑبڑائی پھر پرس سے چیونگم نکال کر منہ میں ڈال لیا۔

''امی! مجھے پوپ کورن چاہئے''۔ حنا نے آئسکریم ختم کرنے کے بعد دوبارہ فرمائش کی۔

''اچھا چلو میں تمہیں پوپ کورن دلوا دوں'' اس نے سیمنٹ کی بنی بینچ سے اٹھتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ چہل قدمی کرتی ہوئی مطلوبہ ریڑھی تک پہنچیں جہاں سے سبی نے پوپ کورن خریدا اور حنا کو دیا۔ ڈیڑھ دو

گھنٹے پارک میں گزارنے کے بعد سیبی اور حنا دونوں اپنے گھر پہنچیں۔ ان کی غیر موجودگی سے ان کا ملازم خانو پریشان ہو رہا تھا۔

''کافی دیر لگا دی'' خانو نے حنا کے جوتے اسٹینڈ پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی! حنا آؤٹنگ پر جانا چاہ رہی تھی میں اسے لے گئی تھی۔ سیر سپاٹوں میں تو دیر ہو ہی جاتی ہے''۔ سیبی نے پرس کو بستر پر اچھالتے ہوئے جواب دیا۔

''حنا! جاؤ کپڑے بدل لو!'' اس نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''اچھا امی! میں تھوڑی دیر بعد کپڑے بدل لوں گی۔ پہلے پاپ کورن تو ختم کرلوں ورنہ ٹھنڈے ہو جائیں گے''۔ حنا نے بچے کچے کورن کو چباتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! دال، چاول اور تیل ختم ہو چکا ہے کل یاد سے لے آنا ورنہ کھانا نہیں پکے گا۔'' خانو نے اسے یاد دلایا۔

''او کے بابا کل لا دوں گی، آپ ٹینشن نہ لیں''۔ سیبی نے مسکرا کر کہا۔

تھکن کی وجہ سے سیبی کی آنکھ دیر سے کھلی اس نے جلدی جلدی حنا کو ناشتہ کرایا پھر اسے تیار کرنے کے بعد اسکول چھوڑ آئی۔ گھر آنے کے بعد اس نے کپڑے بدلے اور اخبار کا مطالعہ کرنے لگی۔ خانو نے سامان کی لسٹ اسے پکڑا دی۔ سیبی نے الماری سے پیسے نکالے اور پرس میں رکھ لئے تقریباً گیارہ بجے وہ گھر سے نکلی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے میں پانچ منٹ لگ گئے کیونکہ کار میں پیٹرول کم تھا۔ وہ بمشکل پیٹرول پمپ تک پہنچی۔ پیٹرول کار میں ڈلوانے کے بعد وہ آغا سپر مارکیٹ پہنچی وہاں سے اس نے کافی سارا راشن خریدا پھر وہ کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کی غرض سے پہنچی تو وہاں پر محسن کو کھڑے کسی سے باتیں کرتے دیکھا۔ وہ کوئی معمر سی خاتون تھی جس کے ہاتھ میں دو تین بڑے شاپرز تھے۔ سیبی نے بل ادا کیا اور خاموشی سے سامان لئے باہر نکل گئی۔ اس نے تمام سامان اپنی ایف ایکس میں رکھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی جونہی اس نے گاڑی اسٹارٹ کی محسن اس کی گاڑی کے سامنے آ گیا۔ سیبی نے انجن بند کر دیا۔

''جی فرمائیے! آپ کو کیا تکلیف ہے؟'' سیبی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''تکلیف یہی ہے کہ آپ مجھے نظر انداز کر کے چلی آئیں''۔ محسن نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''غالباً میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا کہ میں اجنبی لوگوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتی لہٰذا برائے مہربانی آپ ہر بار مجھ سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کریں یہی بہتر ہے''۔اس نے ایک ہی سانس میں کہا اور دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کردی۔

محسن مزید کچھ کہنا چاہتا تھا مگر وہ تیزی سے نکل گئی وہ پلٹ کر دوبارہ سپر مارکیٹ میں داخل ہو گیا۔

''خانو! میں راشن اور دیگر سامان لے آئی ہوں ۔ یہ لیں چابی، گاڑی سے تمام سامان نکال کر اوپر لے آئیں پھر میں حنا کو اسکول سے لانے جاؤں گی۔'' سیبی نے چابی ملازم کو دیتے ہوئے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد سیبی حنا کو پک کرنے چلی گئی، اس دوران خانو نے کھانا پکا لیا تھا۔اسکول سے واپس آنے کے بعد سیبی اور حنا نے کھانا کھالیا، وہ دونوں تھوڑی دیر تک آرام کی غرض سے لیٹی رہیں۔چار بجے کے قریب حنا اپنے کمرے میں ہوم ورک مکمل کرنے کی غرض سے گئی سیبی بستر پر ہی لیٹی رہی۔

دفعتاً بیل کی آواز پر وہ چونکی۔خانو نے دروازہ کھولا تھا۔

''کون ہے؟'' سیبی نے اس سے پوچھا

''صاحب آئے ہیں''۔خانو نے باہر ہی سے جواب دیا۔اتنے میں سلمان بیڈ روم میں آچکا تھا۔

''کیسی ہو؟'' اس نے خوش دلی سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں''۔سیبی نے روکھائی سے جواب دیا۔اتنے میں حنا بھی ابو کہتی ہوئی کمرے میں پہنچی۔

''کیسی ہو بیٹا!! امی کو تنگ تو نہیں کیا تھا'' اس نے حنا کو گلے لگاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بالکل نہیں'' حنا نے مختصر سا جواب دیا۔

''خانو! میرا سوٹ کیس لادو''۔سلمان نے ملازم سے کہا۔خانو نے سوٹ کیس لا کر کمرے میں رکھا اور خود چائے بنانے چلا گیا۔

سلمان نے سوٹ کیس کھولا، اس میں سے تین خوبصورت فراکیں اور ایک باربی ڈول حنا کو دے دیں۔

''تھینک یو ابو! آپ بہت خوبصورت فراکیں اور گڑیا لائے ہیں''۔ حنا نے خوش ہوتے ہوئے کہا پھر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

''یہ تمہارے لئے ہے''۔سلمان نے دوسوٹ پیس اور دوخوبصورت ریشمی ساریاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!خدا کا شکر ہے کہ وہاں جا کر آپ مجھے نہیں بھولے اور یہ چیزیں میرے لئے لانا یادر ہیں''۔سیبی کا انداز طنز یہ تھا۔

''یہ روپے بھی رکھ لوتا کہ تمہیں پریشانی نہ ہو''۔سلمان نے اپنے ویلٹ سے دس ہزار روپے نکال کر سیبی کے ہاتھ میں تھما دیئے۔اس نے وہ روپے الماری میں رکھ دیئے۔

''میری غیر موجودگی میں کیا مصروفیات رہیں''۔سلمان نے بستر پر دراز ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کوئی خاص نہیں ہاں البتہ جمعہ کے روز میں حنا کو پارک لے گئی تھی''سیبی نے مختصر سا جواب دیا۔

''امی! کا کوئی فون تو نہیں آیا تھا''۔سلمان کا انداز سوالیہ تھا۔

''نہیں''۔سیبی نے سنجیدگی سے کہا۔

''خانو!''سلمان نے آواز دی۔

''جی! کیا بات ہے؟''خانو نے پوچھا۔

''آج شام کو کھانا مت پکانا۔ہم رات کا کھانا باہر کھائیں گے''۔سلمان نے اسے اپنا پروگرام بتایا۔اس دوران سیبی بالکل خاموش رہی کوئی تبصرہ نہیں کیا اتنے میں خانو چائے لایا۔ان دونوں نے چائے پی۔

''خانو! میرے ساتھ تھوڑی دیر کے لئے جیسن چلو وہاں فلیٹ کی صفائی کرنی ہے''۔سلمان نے ملازم سے کہا جو کچن میں برتن دھو رہا تھا، یہ بات سیبی نے بھی سن لی تھی۔وہ دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتی رہی۔

''سیبی تم اور حنا تیار رہنا میں فلیٹ کی صفائی کروا کے آ رہا ہوں پھر ہم باہر کھانا کھائیں گے''۔اس نے ہدایت دی اور خانو کے ساتھ چل دیا۔

رات نو بجے سیبی اور سلمان تیار ہو کر شیرٹن کے لئے روانہ ہوئے۔سلمان نے اپنی شیراڈ پارکنگ میں کھڑی کر دی پھر وہ تینوں ہوٹل میں داخل ہوئے۔

''کیا کھاؤ گی؟''سلمان نے حنا سے پوچھا۔

''میں چائنیز کھاؤ گی''۔ حنا نے چاروں طرف نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ اس وقت ہوٹل میں کافی رش تھا۔ فانوس سے جھلکنے والی روشنی سے ماحول سحر انگیز تھا اس کے علاوہ ہلکی ہلکی موسیقی روح کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی۔ سیبی نے گہری کاسنی کلر کی ساڑی پہنی تھی، اس کے کانوں میں سلور آویزے جھول رہے تھے۔ سلمان کی نظریں مسلسل اس کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں کیونکہ وہ اس وقت بہت دلکش لگ رہی تھی دور نزدیک بیٹھے لوگ بھی چپکے چپکے اس کی طرف دیکھ رہے تھے مگر وہ خود کہیں دور کھوئی ہوئی تھی۔ جیسن اپارٹمنٹ کا وہ فلیٹ جو کہ سلمان کی ملکیت تھا اس کی صفائی نے سیبی کو مزید نئے کسی آنے والے اندیشوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ مسلسل اس کے متعلق ہی سوچ رہی تھی۔

''سیبی! تم کیا کھاؤں گی۔'' سلمان نے اسے جھنجھوڑا۔

''کچھ بھی کھالوں گی''۔ اس نے ہڑبڑا کر کہا۔

''کہاں کھوئی ہوئی ہو۔ انجوائے کرو۔ موڈ بھی درست کرلو'' سلمان نے اس پر گہری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''میں بھی چائنیز کھاؤں گی''۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

سلمان نے ویٹر کو سوپ لانے کا آرڈر دیا۔ سوپ کے بعد انہوں نے چائنیز رائس اور چکن چلی ود ویجی ٹیبل منگوایا۔ کھانے کے بعد حنا نے آئسکریم کھائی جبکہ سیبی اور سلمان نے گرین ٹی پی۔ بل ادا کرنے کے بعد وہ تینوں باہر نکلے پھر سلمان پارکنگ سے گاڑی لے آیا۔ گھر جانے سے پہلے سلمان نے پی آئی ڈی سی کے پاس سے دو پان خریدے ایک سیبی کو دیا اور دوسرا اس نے کھایا اس طرح وہ پونے گیارہ بجے گھر پہنچے۔ سلمان جیسن نہیں گیا بلکہ سیبی کے پاس ہی رک گیا۔

اسی طرح ایک ہفتہ بیت گیا۔ اب سیبی کا بھی موڈ ٹھیک ہو گیا تھا کیونکہ سلمان اس کے ساتھ تھا جبکہ اس کی پہلی بیوی ماریہ لاہور میں تھی۔ اس دوران حنا بھی پرسکون تھی کیونکہ گھر کا ماحول بہت اچھا تھا۔

''سیبی! میں آج سے رات کو گھر نہیں آؤں گا بلکہ دن کے وقت چکر لگا لیا کروں گا''۔ سلمان نے ناشتے کے بعد تیار ہوتے ہوئے کہا۔

''کیوں بھئی؟'' سیبی نے حیرت سے پوچھا

''اس لئے کہ آج شام ماریہ کراچی پہنچ رہی ہے اور وہ جیسن میں رہے گی۔ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا''۔ سلمان نے سنجیدگی سے کہا

''یہ کیوں کراچی آ رہی ہے اسے تو لاہور میں رہنا تھا۔ آپ اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتے تھے مجھے تو کافی دنوں تک اکیلا چھوڑ دیا تھا'' سیبی نے غصے کے عالم میں کہا۔

''تم اکیلی کہاں تھی، تمہارے ساتھ حنا اور خانو بھی تو رہے''۔ سلمان نے صفائی پیش کی۔

''آپ خانو کو ماریہ کے پاس چھوڑ دیں۔ میں گھر کا کام خود ہی کر لوں گی'۔ سیبی نے فیصلہ سنایا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اس کو ہماری شادی کا علم نہیں ہے ورنہ میرے لئے مشکل ہو جائے گی اگر یہ بات امی ابو کو پتہ چل گئی تو وہ قیامت برپا کر دیں گے۔ میری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرو'۔ سلمان نے وضاحت کی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی بھر چوروں کی طرح زندگی گزارتے رہیں، میری نہ کوئی حیثیت ہے اور نہ ہی کوئی مقام، اس سے تو بہتر تھا کہ ہم شادی ہی نہ کرتے۔ کم از کم ٹینشن تو نہ ہوتی''۔ اس نے چیخ کر کہا اور بیڈ روم میں جا کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ سلمان کافی دیر تک دروازے پر دستک دیتا رہا پھر خانو کو کچھ ہدایات دے کر جیسن کی طرف روانہ ہوا۔

سلمان رات نہیں آیا۔ سیبی صبح حنا کو اسکول چھوڑ آئی پھر گھر پر ہی رہی۔ بارہ بجے کے قریب سلمان گھر آیا۔ سیبی نے اس سے کوئی بات نہیں کی جبکہ وہ کوشش کرتا رہا کہ اس کا موڈ ٹھیک ہو جائے۔ حنا کو اسکول سے وہ خود لے آیا۔ دوپہر کا کھانا اس نے حنا کے ساتھ کھایا مگر سیبی نے نہیں کھایا۔ تین بجے وہ اپنے دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ رات نہیں آیا۔

اب سیبی سلمان اور اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکی تھی، اسے رہ رہ کر اپنی امی کا خیال آ رہا تھا انہوں نے سلمان سے شادی کی شدید مخالفت کی تھی۔ سیبی کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے سیبی کے دل سے سلمان کی محبت ختم ہو رہی تھی۔ اب اسے سلمان کا ہر انداز برا لگتا تھا، اس کی باتوں اور گفتگو سے چڑ سی ہو گئی تھی۔ ان دونوں کے درمیان فاصلے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ حنا بھی اداس رہنے لگی تھی اسے نانی کی یاد شدت

سے آتی مگر وہ بہت دور تھیں۔ سیبی کے رویے نے سلمان کو بہت ڈسٹرب کیا تھا۔ اب وہ دو دن کے بعد سیبی کی طرف آتا مگر بہت مختصر وقت کے لئے، سیبی اسے روکنے کی کوشش بھی نہ کرتی۔ سیبی نے اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے اس نے کومل اور زہرا سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ہاں البتہ کبھی کبھار ان دونوں کے فون آتے تو وہ اپنے دل کی بھڑاس نکالا کرتی۔

وقت گزرتا رہا ایک دن اسے اطلاع ملی کہ ماریہ ماں بننے والی ہے۔ اس بات نے اسے مزید سلمان سے دور کر دیا۔ سیبی کو ماں کی یاد نے بے چین کیا تو اس نے تہہ کر لیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے ان کے پاس کینیڈا جائے گی تا کہ اس کا ڈپریشن کم ہو جائے۔

''ہیلو! کون؟'' رئیسہ بیگم نے پوچھا

''میں سیبی بول رہی ہوں''۔ اس نے دھیمے سے کہا

''آج آٹھ مہینے بعد تمہیں میری یاد آئی''۔ انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔ سیبی کے ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ رونے لگی۔ بیٹی کے رونے کی وجہ سے رئیسہ بیگم کا دل پسیج گیا آخر وہ ماں تھی اسے دلاسے دیئے انہوں نے حنا اور اسے کینیڈا آنے کے لیے کہا۔ سیبی نے وعدہ کر لیا کہ وہ جلد وہاں آئے گی۔

''سلمان! میں کچھ دنوں کے لیے امی کے پاس جانا چاہتی ہوں، حنا بھی انہیں بہت مس کر رہی ہے۔ اسکول کی چھٹیاں بھی ہونے والی ہیں، میں چھٹیاں وہاں گزار کر واپس آ جاؤں گی''۔ سیبی نے دوپہر کے کھانے پر اس سے کہا۔

''ابو! پلیز ہمیں نانی کے پاس بھجوا دیں۔ ان کی بہت یاد آتی ہے''۔ حنا نے سلمان سے مخاطب ہو کر کہا۔ اس نے تھوڑی دیر کچھ سوچا

''ٹھیک ہے میں تم دونوں کو بھجوا دیتا ہوں پہلے تو ضروری کاروائی کے لئے اسلام آباد وہاں کی ایمبیسی جانا پڑے گا۔ میں پیر والے روز تم لوگوں کو اسلام آباد لے جاؤں گا اپنی تیاری کر لینا'' سلمان نے سنجیدگی سے کہا۔ حنا خوش ہو گئی۔

حسب وعدہ سلمان پیر کے دن حنا اور سیبی کے ساتھ اسلام آباد کے لیے روانہ ہوا۔ ماریہ کو اس نے اتوار کے دن

لاہور بھجوا دیا تھا۔ سفر کے دوران سیبی اور سلمان زیادہ تر خاموش رہے۔ اسلام آباد میں سلمان نے ان دونوں کے ساتھ ہوٹل میں قیام کیا تقریباً ایک ہفتے کے دوران سیبی اور حنا کو کینیڈا جانے کی اجازت مل گئی کیونکہ سیبی ٹورنٹو میں ہی پیدا ہوئی تھی لہٰذا اسے جانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ایک ہفتہ اسلام آباد قیام کے دوران سلمان نے سیبی اور حنا کو پورے شہر کی سیر کرائی تھی۔ وہ تینوں مری اور ایبٹ آباد بھی گئے تھے۔ سلمان نے پنڈی باڑہ مارکیٹ سے ان دونوں کو اچھی خاصی شاپنگ بھی کروادی تھی تقریباً دس روز بعد وہ کراچی پہنچے۔ کراچی پہنچ کر سلمان نے کینیڈا کے لئے ایمرٹ ائیر لائن کے دو ٹکٹ ایک ہفتے کے بعد کا لیا۔ اس دوران سیبی نے اپنی تیاری مکمل کر لی۔ بیل کی آواز پر کومل نے دروازہ کھولا۔

''ارے! آپ لوگ اتنی رات گئے کیسے آ گئے۔'' کومل نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔

''سیبی اور حنا کل رات کینیڈا جا رہی ہیں''۔ سلمان نے وضاحت کی

''خیریت کوئی خاص بات ہے، اتنی ایمرجنسی میں پروگرام بنا لیا۔'' اس نے سیبی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا

''دراصل حنا کئی دنوں سے نانی کے پاس جانے کے لیے مچل رہی تھی''۔ سیبی نے مختصر سا جواب دیا

''اچھا چلیں اندر بیٹھ تو جائیں یوں ہی کھڑے کھڑے خدا حافظ کہنا ہے کیا؟'' کومل نے مسکراتے ہوئے پوچھا پھر اس نے زہرا کو بھی بلوا لیا، وہ سب بارہ بجے تک گپ شپ کرتے رہے کافی عرصے بعد وہ اکٹھے ہوئے تھے اس لئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہو سکا۔

سیبی نے اپنی امی کے لیے سونی سوئٹس سے بہت ساری ڈبہ پیک مٹھائیاں خریدیں اس کے علاوہ کچھ ڈرائی فروٹ اور کچھ کاٹن کے سوٹ بھی خرید لئے۔ شام تک تمام تیاری مکمل ہو گئی۔ سوٹ کیس بھی لاک کر دیئے گئے آج سلمان بہت اداس تھا طرح طرح کے اندیشوں نے اسے پریشان کر رکھا تھا، سیبی ان تمام باتوں سے بے خبر اپنی تیاری میں لگی رہی جب ساری تیاری مکمل ہو گئی تو سلمان اپنے دوست عمران کی ہنڈا سوک لے آیا تا کہ سوٹ کیس اس میں رکھے جا سکیں۔ سیبی نے اپنے تمام زیور اور روپے پیسے بھی رکھ لئے تھے، سلمان نے اسے ایک ہزار ڈالر دیئے تھے تا کہ وہاں اسے پریشانی نہ ہو۔ ایئر پورٹ پر سلمان نے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر دی

سبی اور حنا کو سوٹ کیس سمیت اس نے پہلے ہی اتار دیا تھا۔ گاڑی پارک کرنے کے بعد وہ ان کی طرف لوٹ آیا۔ ایئر پورٹ انٹری پاس اس کے پاس موجود تھا لہٰذا وہ سبی اور حنا کو لئے اندر داخل ہوا۔ پاسپورٹ اور سامان کی چیکنگ کے بعد وہ لاؤنج میں کھڑا رہا۔

''اچھا بھئی! تم لوگ اپنا خیال رکھنا، ٹورنٹو پہنچنے کے بعد مجھے فون کر دینا اور ہاں سبی حنا کے اسکول کھلنے سے پہلے کراچی پہنچ جانا ورنہ اس کی پڑھائی کا حرج ہوگا۔'' اس نے تاکید کی۔ سبی نے ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا وہ نم تھیں، وہ اداس ہوگئی مگر دوسرے ہی لمحے ماریہ کا خیال آتے ہی اس کی آنکھوں میں نفرت کی جھلک سلمان بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تڑپ اٹھا۔ سبی اس سے دور جا رہی تھی۔ اس احساس نے اسے افسردہ کر دیا تھا حالانکہ وہ خود کئی بار امریکہ اور کینیڈا جا چکا تھا۔ وہ کبھی بھی جا سکتا تھا کیونکہ وہ بزنس مین تھا مگر کاروباری مصروفیات سیر سپاٹوں کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

''او کے سلمان! اللہ حافظ'' سبی نے حنا کی انگلی پکڑ کر اندلاؤنج میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''اللہ حافظ'' جواب میں اس نے بھی کہا، پھر وہ نظروں سے اوجھل ہوگئی

سلمان بوجھل قدموں سے ایئر پورٹ سے باہر نکلا اور پارکنگ کی طرف بڑھ گیا تا کہ گاڑی نکال سکے۔

گھر پہنچ کر سلمان نے خانو کو چائے لانے کے لیے کہا۔ چائے پینے کے بعد وہ یہیں سو گیا۔

صبح دیر تک سوتا رہا پھر تیار ہو کر بارہ بجے دفتر کے لیے روانہ ہوا۔ دوپہر دو بجے کے قریب لاہور سے ماریہ کا فون آیا۔ وہ کراچی آنے کی ضد کر رہی تھی۔ سلمان نے اسے مصروفیات کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

دو دن گزر گئے، کینیڈا سے سبی کا فون نہیں آیا، سلمان کو پریشانی لاحق ہوگئی۔ مزید دو دن بیت گئے مختلف قسم کے وسوسوں اور آنیوالے کسی خطرے نے اسے بے چین کر دیا۔ سبی کے کینیڈا پہنچنے کے پانچویں روز سلمان نے فون کیا۔

''ہیلو!'' رئیسہ بیگم نے دھیرے سے کہا۔

''میں کراچی سے سلمان بول رہا ہوں آنٹی! آپ کیسی ہیں۔ سبی پہنچ گئی ہے''۔ اس نے ایک ہی جملے میں کئی سوالات کیے۔

''الحمد للہ میں ٹھیک ہوں، سیبی پہنچ گئی ہے مگر اس وقت حنا کے ساتھ باہر نکلی ہوئی ہے، گھنٹے دو گھنٹے بعد آ جائے گی۔ رئیسہ بیگم نے سپاٹ لہجہ میں کہا

''ٹھیک ہے اسے کہہ دینا کہ مجھے فون کر لے'' پھر اس نے فون بند کر دیا۔

''نانی! کس کا فون تھا''؟ حنا نے بیڈ روم سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

''میری دوست نفیسہ کا فون تھا تم لوگوں کے متعلق پوچھ رہی تھی''۔ اس نے صاف جھوٹ بولا۔

سیبی کو ٹورنٹو آئے ہوئے پندرہ دن گزر چکے تھے اسے رہ رہ کے سلمان پر غصہ آ رہا تھا کہ اتنے دن ہو گئے اس نے ابھی تک فون کیوں نہیں کیا جبکہ وہ کئی بار سلمان کے جیسن اپارٹمنٹ میں فون کر چکی تھی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اپنے فلیٹ میں بھی ملازم خانو سے رابطہ کرنا چاہا مگر اس سے بات نہ ہو سکی۔ وہ مسلسل ذہنی اذیت کا شکار تھی۔

''امی! کئی دن ہوئے سلمان نے فون نہیں کیا'' سیبی نے اپنی امی سے ناشتے کے دوران کہا۔

''وہ انتہائی غیر ذمہ دار شخص ہے اس کے علاوہ شادی شدہ بھی یعنی ماریہ اس کی بیوی ہے۔ تمہارے یہاں آنے کے بعد وہ لاہور اس کے پاس چلا گیا ہوگا۔ تم اس کی اکلوتی بیوی تھوڑی ہو جو وہ فکر کرتا پھرے گا''۔ رئیسہ بیگم نے حنا کی طرف آملیٹ کی پلیٹ بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ سیبی نے بیچارگی سے ماں کی طرف دیکھا۔

'' ارے بیٹا! پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے میں اور تمہارے ماموں یہاں اچھی پوزیشن میں ہیں۔ میں اب بھی تمہارا اور حنا کا خرچہ برداشت کر سکتی ہوں فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے!''۔ رئیسہ بیگم نے فخریہ انداز میں کہا۔ سیبی ناشتہ کے بعد اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وہ خاموشی سے لیٹ گئی۔ اپنے اور حنا کے متعلق مختلف انداز میں منصوبے بناتی رہی، وہ دل ہی دل میں امی کی باتوں پر غور کرتی رہی۔

''امی چلیں نا باہر چلتے ہیں ماموں کے اسٹور پر چلیں، مجھے وہاں بہت مزہ آتا ہے۔'' حنا نے سیبی کو جھنجوڑا۔ سیبی کے ماموں کا اسٹور چھوٹا مگر بڑا خوبصورت تھا۔ وہاں سے اچھی خاصی آمدنی تھی یہ ان کے گھر سے قریب تھا۔ رئیسہ بیگم دوپہر کے بعد اسٹور کی نگرانی کرتی تھیں، ماموں غیر شادی شدہ اور 40۔50 سال کے لگ بھگ تھے۔

''حنا! تم کراچی میں رہنا پسند کرو گی یا کینیڈا میں'' سیبی نے اچانک بیٹی سے پوچھا۔

''امی! ہم یہاں رہیں گے نانی اور آپ کے ماموں مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں، میرے لئے اچھی اچھی چیزیں لاتے ہیں، شام کو سیر بھی کراتے ہیں یہاں کے لوگ بھی اچھے ہیں، پڑھے لکھے اور صاف ستھرے اس کے علاوہ یہاں اسکول بھی اچھے ہیں'' حنا نے اپنی رائے دیدی۔

سلمان نے سیبی کو کراچی سے کئی فون کئے مگر اس سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ سیبی نے سلمان کی بے رخی کی بنا پر اسے فون نہیں کیا۔ وہ اپنے طور پر اسے بے وفا سمجھتی رہی۔ رئیسہ بیگم موقع محل دیکھ کر اس کا برین واش کرنے کے فرائض انجام دیتی رہی۔ وہ ہر وقت سیبی کو سلمان کی طرف سے بدظن کرنے کی کوشش کرتی اور اس میں کافی حد تک کامیاب ہوچکی تھی۔

سیبی کو کینیڈا گئے ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ بیت چکا تھا۔ ماریہ اپنے طور پر لاہور سے کراچی پہنچ گئی تھی۔ سلمان ماریہ کے کراچی آنے سے خوش نہیں تھا کیونکہ وہ سیبی کے پاس کینیڈا جانا چاہ رہا تھا۔

''صاحب! کینیڈا سے آپ کا پارسل آیا ہے۔'' خانو نے سلمان کو دفتر فون کرکے بتایا۔

''کس پتے پر آیا ہے؟'' اس نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''کلفٹن کورٹ والے پتے پر آیا ہے۔ میں وہاں صفائی کرنے گیا تھا تو ایک آدمی نے دستک دے کر وہ پارسل مجھے دیا اور میرے دستخط بھی لئے تھے'' خانو نے پوری تفصیل بتائی۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' سلمان نے بیتابی سے پوچھا۔

''کلفٹن کورٹ میں ہوں'' خانو نے کہا۔

''اچھا سنو! تم وہیں رکو میں پہنچ رہا ہوں۔'' سلمان نے اسے پابند کیا تقریباً آدھ گھنٹہ بعد سلمان پہنچ گیا۔

خانو نے دروازہ کھولا اور وہ پارسل اس کے ہاتھ میں دیا۔ وہ پارسل نہیں بلکہ ایک لفافہ تھا جس میں کئی کاغذات تھے۔ اس نے جلدی جلدی میں لفافہ چاک کیا اور اسے پڑھنے لگا۔ یکدم اس کا سر چکرا گیا کیونکہ یہ سیبی کے وکیل کی طرف سے نوٹس تھا جس میں اس نے طلاق کا مطالبہ کیا تھا۔ وہ کافی دیر تک گم سم بیٹھا اس نوٹس کو دیکھتا رہا تھوڑی دیر بعد جب حواس بجا ہوئے تو اس نے کال بک کرائی اور کینیڈا فون کیا۔

''ہیلو! کون'' یہ سبی آواز تھی۔

''میں سلمان بول رہا ہوں'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔

''اتنے عرصے بعد میری یاد آئی۔ اب بھی فون نہ کرتے''۔ اس نے تیز لہجے میں جملہ پورا کیا۔

''کس نے کہا کہ میں نے فون نہیں کیا۔ میں نے تمہارے کینیڈا پہنچنے کے پانچ، چھ دن بعد فون کیا تھا۔ تمہاری امی سے بات ہوئی تھی انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ تم اور حنا گھر پر نہیں ہو۔ اس کے علاوہ کئی بار اور بھی فون کئے تھے مگر تم سے رابطہ نہیں ہوسکا''۔

''آپ جھوٹ بول رہے ہیں اگر آپ فون کرتے تو امی مجھے ضرور بتادیتیں بلاوجہ امی پر الزام عائد نہ کریں''۔ سبی نے غصے سے کہا۔

''میری بات پر یقین کرو۔ آنٹی نہیں چاہتیں کہ ہم اکٹھے رہیں، وہ مجھے بالکل پسند نہیں کرتیں تم اپنی امی پر اندھا اعتماد نہ کرو''۔ سلمان نے وضاحت کی۔

''مجھے میری امی کے خلاف ورغلانے کی ضرورت نہیں یہ بتائیں آپ نے فون کس لئے کیا؟'' اس نے درشت لہجہ میں جواب دیا۔

''یہ طلاق کا مشورہ کس نے دیا ہے۔ کیا پاگل پن ہے؟''۔ سلمان نے اسے ڈانٹا۔

''یہ مشورہ کسی نے نہیں دیا بلکہ اس میں میری اپنی مرضی شامل ہے، میں آپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی برائے مہربانی آئندہ مجھے فون نہ کرنا''۔ اس نے سختی سے کہا۔

''میں تمہیں طلاق نہیں دوں گا۔ یہ بات اپنے ذہن سے نکال دو''۔ سلمان نے فون بند کردیا۔

سبی سے گفتگو کے بعد وہ بہت ڈسٹرب ہوگیا اسے رئیسہ بیگم کی چالبازیوں کا اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس حد تک گر جائے گی کہ بیٹی کو طلاق پر آمادہ کرلے۔ سلمان نے فلیٹ سے خانو کو ماریہ کے پاس بھجوایا اور خود سڈ کو سینٹر سے لاہور کی دو ٹکٹ پی آئی اے کی لی اور گھر آگیا۔

''ماریہ! تیاری کرلو ہمیں کل صبح لاہور جانا ہے۔'' سلمان نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''خیریت! کیا ہوا؟'' ماریہ نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے اگلے ہفتہ ایک ضروری کام سے کینیڈا جانا ہے ہوسکتا ہے وہاں کافی دن لگ جائیں''۔اس نے جوتے کے تسمے کھولتے ہوئے جواب دیا۔

دو دن بعد سلمان ماریہ کو لاہور چھوڑنے کے بعد اسلام آباد روانہ ہوا وہاں ایک ہفتہ رکنے کے بعد اسے کینیڈا جانے کی اجازت ملی کیونکہ بزنس کے سلسلے میں وہ اکثر امریکہ، برطانیہ اور کینیڈا جاتا رہتا تھا۔اس کے سیبی کا پتہ موجود تھا۔دروازے پر بیل بجی تو حنا نے دروازہ کھولا۔

''ارے ابو آپ!'' حنا نے حیرت سے پوچھا۔

''امی کو بلاؤ'' سلمان نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اب یہاں کیوں آئے ہو؟'' رئیسہ بیگم کمرے سے نکل کر آئیں۔اس کے پیچھے سیبی بھی تھی۔

''میں اپنی بیوی اور بچی سے ملنے آیا ہوں'' سلمان نے ترکی بترکی جواب دیا۔

''بیوی تھی۔اب وہ تمہارے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اچھا ہوا تم آگئے۔طلاق کا مرحلہ آسان ہو جائے گا''۔رئیسہ بیگم نے سیبی کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ پورا کیا۔

''سوری آنٹی! آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہوسکتی اور ہاں سیبی کینیڈا پہنچ گئی تھی اس کے پانچویں روز میں نے فون کیا تھا تو آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ سیبی اور حنا گھر پر موجود نہیں ہیں، گھنٹے دو گھنٹے بعد وہ دونوں واپس آئیں گی یہ بات آپ نے سیبی کو کیوں نہیں بتائی''۔سلمان نے تنک کر پوچھا۔

''تم نے کب فون کیا تھا؟ میری تم سے بات اب ہو رہی ہے، اگر تم فون کرتے تو میں سیبی کو ضرور بتاتی''۔رئیسہ بیگم نے معصومیت سے کہا۔

''آپ بہت جھوٹی اور سازشی ہیں، میں پہلے آپ کی تھوڑی بہت عزت کرتا تھا مگر اب آپ میری نظروں سے بالکل ہی گر چکی ہیں''۔اس نے نفرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''سلمان! یہ کیا بدتمیزی ہے، آپ ہمارے ہی گھر میں میری امی کی توہین کر رہے ہیں برداشت کی بھی انتہا ہے۔'' سیبی نے چیخ کر کہا۔

''سیبی! تم اپنی امی کو پہچاننے میں غلطی کر رہی ہو۔یہ تمہاری زندگی برباد کر دیں گی ساتھ ہی ساتھ حنا بھی پریشان

ہو جائے گی، فیصلہ کرنے میں جلدی نہ کرو۔ دل و دماغ کا استعمال کرو ورنہ زندگی بھر پچھتاتی رہو گی پھر وقت پلٹ کر نہیں آئے گا۔'' سلمان نے اسے تنبیہہ کی۔

''آپ یہاں سے چلے جائیں مجھے میری امی کے خلاف ورغلانے کی کوشش نہ کریں، وہ میری ماں ہیں اور کوئی ماں بچوں کے لئے برا نہیں چاہتی، وہ میری دشمن نہیں ہیں سمجھے''۔ سیبی نے واضح کیا۔

''یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کون دشمن ہے اور کون دوست''۔ سلمان نے افسردگی سے کہا۔

''آپ پلیز طلاق نامے پر دستخط کر دیں'' سیبی نے التجا کی۔

''یہ میرے اختیار میں نہیں اور مجھ سے یہ توقع بھی مت رکھنا، میں نے تمہیں کیا تکلیف دی ہے ماریہ سے نکاح کے متعلق تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا اس کے علاوہ تم سے شادی کے بعد میں نے تمہاری ہر ذمہ داری نباہی، روپیہ پیسہ اور گاڑی سب کچھ تمہیں دے دیا بلکہ کینیڈا آنے کے اخراجات بھی برداشت کئے اور بتاؤ کہ میں کیا کروں'' اس نے بے چارگی سے پوچھا۔

''یہ تکلیف کیا کم ہے کہ تم ماریہ کو سیبی پر اہمیت دیتے ہو، اس کے ساتھ رہنا بسنا ہے اور میری بچی کے لئے دن کے وقت تھوڑا سا وقت نکال لیتے ہو''۔ اب کی بار رئیسہ بیگم نے لقمہ دیا۔

''یہ تمام باتیں سیبی کو پہلے سے معلوم تھیں جہاں تک مستقل اس کے ساتھ رہنے کا تعلق ہے اکثر و بیشتر کافی عرصے تک ہم اکٹھے رہے ہیں اور آئندہ بھی رہتے ہی رہیں گے۔ اصل ایشو تو یہ نہیں ہے اصل مسئلہ نان نفقہ کا ہے اور وہ میں پوری کر رہا ہوں''۔ سلمان نے سوالیہ انداز میں سیبی کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہی۔

''ٹھیک ہے تم ہمارے وکیل سے مل لو پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے''۔ رئیسہ بیگم نے مزید گفتگو سے گریز کیا۔

سلمان دروزے کی طرف بڑھا تاکہ باہر نکل جائے۔

''ابو!'' حنا نے آواز دی۔ وہ پلٹا

''ہاں بولو بیٹا!'' سلمان نے پوچھا۔

''کچھ بھی نہیں'' حنا نے خوفزدہ ہوتے ہوئے نانی کی طرف دیکھا۔ سلمان نے رئیسہ بیگم پر ایک نفرت بھری نظر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

شام کو وہ سیبی کے وکیل نعیم ڈار سے ملا وہ کشمیری مگر معقول آدمی تھا۔ سلمان نے اسے پوری تفصیل بتائی اس کے علاوہ رئیسہ بیگم کے کردار پر بھی تبصرہ کرتا رہا۔

نعیم نے وعدہ کیا کہ وہ مصالحت کرانے کی کوشش ضرور کرے گا۔ تین دن بعد نعیم ڈار نے سیبی اور سلمان کو اپنے دفتر میں بلوایا، رئیسہ بیگم بھی ساتھ آئیں، اس نے رئیسہ بیگم کو باہر ہی بٹھا دیا جبکہ سلمان اور سیبی کے ساتھ وہ خود اندر کمرے میں دونوں کے درمیان مصالحت کرانے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک گھنٹہ گزر جانے کے باوجود سیبی مصالحت پر آمادہ نہیں ہوئی اس طرح یہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔ سلمان مایوس کمرے سے باہر آ گیا۔

''آپ نے یہ اچھا نہیں کیا۔ آپ کی بیوقوفی سیبی اور حنا دونوں کی زندگی برباد کر دے گی۔ آپ نے پہلے سیبی کو ٹیپو سے طلاق دلوائی اور اب مجھ سے بھی یہی چاہ رہی ہیں مگر کان کھول کر سن لیں، میں آپ کی یہ خواہش پوری نہیں ہونے دوں گا۔'' سلمان بڑبڑاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ایک ہفتے بعد وہ کراچی آ گیا پھر ماریہ کو کراچی بلوالیا۔

ایک ماہ یوں ہی گزر گیا۔ گرمیوں کی چھٹیاں ختم ہوگئیں اور اسکول کھل گئے مگر حنا اور سیبی کراچی نہیں آئیں۔

سلمان نے کومل اور زہرا کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔ ان دونوں کو بھی سیبی کے فیصلے سے کافی دکھ پہنچا۔

کلفٹن کورٹ کا فلیٹ بند تھا۔ سلمان نے اسے کسی امید پر خالی نہیں کیا تھا بلاوجہ کرایہ بھرتا رہا۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ وہاں نہیں گیا تھا، ایک دن وہ خانو کے ساتھ صفائی کی غرض سے فلیٹ میں داخل ہوا۔ دروزاہ کھولتے ہی اسے تین خطوط پڑے ملے، یہ نعیم ڈار کی طرف سے تھے جس میں اس نے لکھا تھا کہ سیبی نے اسلامی شرعی عدالت میں خلع کی اپیل کی ہے پاکستانی اسلامی قوانین کے مطابق وہ خلع حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس خبر نے سلمان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا، وہ یکدم اپ سیٹ ہوگیا۔ اس نے پندرہ دنوں میں گھر کا تمام سامان بیچ دیا اور فلیٹ واپس کر دیا۔

شادی کا البم اور چند ضروری تصویریں اس نے اپنے دفتر کی الماری میں حفاظت سے رکھ دیں۔ ایک ماہ بعد اس نے نعیم ڈار کو فون کیا تو پتہ چلا کہ سیبی نے کورٹ سے خلع حاصل کر لی تھی۔ سلمان کی زندگی میں سیبی کا چیپٹر ختم ہو چکا تھا۔ اس نے بددل ہو کر کراچی سے اپنی رہائش ختم کر لی تھی اس کے بعد وہ لاہور شفٹ ہوگیا تھا۔ اس نے حیسن کا فلیٹ بیچ دیا ہاں البتہ کراچی کا آفس رہنے دیا یہاں صرف رابطہ آفس رہ گیا تھا۔

دن گزرتے رہے اس بات کو بارہ سال بیت گئے ان بارہ سالوں کے دوران سلمان کے ہاں دو بیٹے اور ایک پیاری بیٹی پیدا ہوئی۔

سلمان سے خلع لینے کے بعد سیبی نے کینیڈا میں ایک پاکستانی نوجوان اکبر سے شادی کر لی تھی، یہ شادی رئیسہ بیگم نے خود کرائی تھی اکبر شادی سے پہلے اکثر ان کے اسٹور پر آیا کرتا تھا۔

رئیسہ بیگم کی غیر موجودگی میں کبھی کبھار وہ ان کے اسٹور میں رئیسہ بیگم کی ذمہ داریاں نبھایا کرتا۔ اس بات سے متاثر ہو کر اس نے سیبی کا رشتہ اس سے جوڑ دیا۔ شادی کے بعد پتہ چلا کہ اکبر بیروزگار اور کام چور تھا۔ اس کی کام چوری سے مجبور ہو کر سیبی نے وہاں کی ایک فرم میں نوکری کر لی۔ اس کے کمائے پیسوں سے اکبر شراب نوشی کر کے اسے مارتا پیٹتا اور ذہنی اذیت دیتا رہا۔ اپنے حالات کے پیش نظر سیبی ہر ممکن طور پر اس سے گزارہ کرنے کی کوشش کرتی رہی۔

اکبر سے شادی کرانے اور سلمان سے علیحدگی پر مجبور کرنے کی وجہ سے سیبی اور رئیسہ بیگم کے درمیان اختلافات بڑھتے ہی رہے۔ رئیسہ بیگم نے حنا کو خود سے الگ نہیں ہونے دیا بلکہ سیبی کی طرف اسے مسلسل بدظن کرتی رہی ایک دن اکبر نے اسے شدید تشدد کا نشانہ بنایا تو اس نے پولیس کی مدد سے سزا دلوانے کے بعد اس سے بھی طلاق حاصل کر لی پھر اپنی امی کے گھر پر آ گئی یہاں بھی لڑائی جھگڑے رہتے تھے۔

وہ اب اپنی امی کی تمام سازشوں سے واقف ہو چکی تھی حنا اس سے بدظن تھی۔ رئیسہ بیگم کے طنز کے نشتر اس کے وجود کو پارہ کرنے کے لئے ہی کافی تھے تنگ آ کر وہ دو پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ ایک الگ اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئی تھی، وہ تقریباً آٹھ برس حنا اور رئیسہ بیگم سے الگ رہی۔ اس کی لاتعلقی کا فائدہ اٹھا کر رئیسہ بیگم نے حنا کی شادی کر دی۔ سیبی سے تذکرہ بھی کرنا گوارہ نہ کیا۔

رمضان کی عید کے بعد سلمان بزنس ٹور پر کراچی آیا، اب کی بار وہ دو ہفتوں کے لئے آیا تھا، یہاں کلفٹن میں وہ اپنے دوست شکیل کے گھر قیام کی غرض سے ٹھہر گیا اچانک اسے سیبی کی یاد آئی۔ وہ جلدی اپنے دفتر پہنچا وہاں اس نے ڈائری سے نمبر نکال کر ٹورنٹو میں سیبی کے وکیل نعیم ڈار کو فون کیا۔

''ہیلو'' نعیم نے پوچھا۔

''میں کراچی سے سلمان بول رہا ہوں''۔اس نے گرمجوشی سے کہا۔

''کون سلمان؟''نعیم نے حیرت سے پوچھا۔

''سیمی کا سابقہ شوہر''اس نے یاد دلایا۔

''ہاں پہچان گیا،برخودار تم کیسے ہو؟''اس نے سلمان سے پوچھا۔

''میں بھی ٹھیک ہوں سیمی اور حنا کے متعلق کچھ جانتے ہیں تو بتائیں''اس نے تجسس سے پوچھا۔

''ان کے متعلق جان کر کیا کرو گے۔خبریں کچھ اچھی نہیں ہیں۔تمہیں بہت دکھ ہوگا''۔نعیم ڈار نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔سلمان کا دل دھک سے رہ گیا اسے اب بھی سیمی سے محبت تھی وہ اس سے متعلق بری خبر سننے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔طرح طرح کے وسوسے گھر کرنے لگے۔

''کیا بات ہے پلیز جلدی بتائیے''۔اس نے بے چینی کا اظہار کیا۔

''تم سے خلع لینے کے بعد سیمی نے نوکری کر لی تھی۔حنا کی تعلیم کا خرچہ رئیسہ بیگم اور سیمی پورا کرتے رہے۔اس دوران سیمی نے یہاں ایک پاکستانی سے شادی کر لی،شادی کے بعد پتہ چلا کہ وہ کام چور تھا،کماتا نہیں تھا مجبوراً سیمی نے ملازمت جاری رکھی اس نے اس شخص سے نباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر وہ شرابی بھی تھا اس کے علاوہ اسے مارتا پیٹتا بھی رہا تنگ آ کر اس نے اس سے بھی طلاق لے لی۔یہ شادی چار سال تک قائم رہی اس تمام عرصے میں حنا رئیسہ بیگم کے پاس ہی تھی۔اس نے سیمی کی طرف سے حنا کو بھی بد دل کر دیا تھا لہٰذا وہ اپنی امی سے شدید نفرت کرتی تھی۔سیمی حنا کی بے رخی برداشت نہیں کر سکی۔اس عرصہ میں سیمی کو رئیسہ بیگم کی تمام سازشوں کا علم ہو چکا تھا۔وہ دو بار مجھ سے ملنے آئی تھی اور تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔اس نے تسلیم کیا کہ سلمان سے علیحدگی میں اس کی امی کا نمایاں کردار تھا،دونوں طلاقیں انہوں نے کرائی تھیں اگر وہ چاہتیں تو ٹیپو سے بھی اس کی مصالحت کراتی مگر جلدی میں اس کی طلاق کرائی پھر سلمان سے تو زبردستی جھوٹی سچی باتیں بتا کر اس سے بھی طلاق پر مجبور کیا۔

آخری ملاقات میں وہ تمہیں بہت یاد کرتی رہی۔آج کل وہ دو پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ الگ ایک اپارٹمنٹ میں رہ رہی ہے اس کی ملازمت برقرار ہے ہاں البتہ اس نے رئیسہ بیگم اور حنا سے تعلق سے ختم کر لیا ہے۔رئیسہ

بیگم نے حنا کی شادی اپنی ایک ملنے والی دوست کے نواسے سے کردی ہے۔اس سے حنا کا ایک بیٹا ہے۔سیبی کو اس کی شادی سے لاعلم رکھا گیا تھا۔شادی کے چھ ماہ بعد سیبی کو بیٹی کی شادی کا پتا چلا اس پر سیبی اور رئیسہ کے درمیان کافی دنوں تک جھگڑا رہا۔حالات کی سنگینی اور اکیلے پن نے سیبی پر برا اثر ڈالا ہے وہ ڈرگز لینے لگی ہے۔اس کی صحت بھی متاثر ہوگئی ہے۔اسے دیکھ کر مجھے بہت دکھ ہوتا ہے''۔نعیم ڈار نے ایک آہ بھرتے ہوئے پوری تفصیل سلمان کو بتائی۔سیبی کی حقیقت جاننے کے بعد سلمان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی وہ بے چین ہوگیا۔ رہ رہ کر اس کی یاد ستانے لگی

''نعیم صاحب! آپ کو سیبی کا ایڈریس اور فون نمبر معلوم ہو تو مجھے بتا دیں'' سلمان نے افسردگی سے کہا۔

''ہاں! کیوں نہیں مجھے اس کا نمبر یاد ہے اور ایڈریس بھی موجود ہے''نعیم نے انسانیت کے جذبے سے سرشار ہو کر کہا۔

سلمان نے فون نمبر اور ایڈریس نوٹ کرلیا۔اس کے بعد وہ اپنے ضروری کام نمٹانے کی غرض سے مختلف لوگوں سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔شام گئے وہ دفتر پہنچا۔چائے سے فارغ ہونے کے بعد اسنے کینیڈا فون کیا۔

''ہیلو کون''؟ یہ ایک سریلی آواز تھی،اس نے اردو میں بے ساختہ پوچھا تھا۔

''جی میں سلمان، پاکستان سے بات کر رہا ہوں۔آپ کون؟''اس نے پوچھا

''میں ڈولی ہوں فرمائیے! آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟''اس نے نے شستہ لہجہ میں پوچھا۔

''مجھے سیبی سے بات کرنی ہے''۔سلمان نے حاصل کلام بیان کیا۔

''پلیز ہولڈ کریں میں بلاتی ہوں'' غالباً وہ اندر کہیں چلی گئی تھی۔

''ہیلو'' سیبی کی آواز تھی۔

''تم کیسی ہو؟''اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''ابھی تلک تو زندہ ہی ہوں''۔اس نے مایوسی سے کہا۔

''کیوں اس قسم کی باتیں کرتی ہو۔مجھے تمہارے متعلق سب کچھ معلوم ہوگیا ہے۔ایک جذباتی فیصلے نے تمہیں کہاں لاکر کھڑا کر دیا کاش کہ میں نے تمہیں کینیڈا نہ بھجوایا ہوتا ورنہ یہ نوبت ہی نہ آتی ''سلمان نے افسردگی

سے جملہ پورا کیا۔

''قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے جو ہونا تھا وہ ہو چکا، اسے میری ہی حماقت سمجھ لیں''۔اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''خیر چھوڑیں ان باتوں کو یہ بتائیں کہ آپ کیسے ہیں کتنے بچے ہوئے''؟ سیبی نے تجسس سے پوچھا۔

''دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے''۔سلمان نے مختصر جواب دیا۔

''تم بتاؤ حنا کیسی ہے؟''سلمان نے اگلا سوال کیا۔

''اس شادی ہوگئی ہے۔اس کا ایک بیٹا ہے وہ اپنے شوہر کیساتھ یہیں رہ رہی ہے مگر مجھ سے ملنا پسند نہیں کرتی۔ای کے گھر آنا جانا ہے۔میں تو اولاد کے ہوتے ہوئے بھی بے اولاد ہوں''۔وہ سسک پڑی۔

''اچھا سنو! زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔میں تمہیں لینے کے لیے آرہا ہوں۔ہم دوبارہ شادی کریں گے۔۔اب میں زیادہ تر تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔ماریہ مستقل طور پر لاہور ہی میں ہے۔اس کے ساتھ میرے امی ابو رہ رہے ہیں۔انشاءاللہ میں پندرہ دن بعد ٹورنٹو پہنچ رہا ہوں' سلمان نے اپنا فیصلہ سنایا۔

سیبی کی ہچکی بندھ گئی۔وہ کافی دیر تک فون پر روتی رہی۔سلمان اس کو سمجھاتا رہا۔

''سلمان! میں نے آپ کو بہت غلط سمجھا۔مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ مجھے اتنا چاہتے ہیں کہ میری غلطیوں کو بھی یوں آسانی سے معاف کر دینگے کاش کہ میں امی کی باتوں میں نہ آتی ورنہ میرے گھر کا شیرازہ اس طرح نہ بکھرتا۔مجھے پلیز معاف کر دیں گے''اس نے جذبات میں بہت سی باتیں کہہ ڈالیں۔

دوسری جانب سلمان اس کی زندگی کے گزرے بارہ سالوں کے کرب کو محسوس کرتا رہا۔

آج سیبی بارہ سال بعد قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر اترتے ہوئے اپنے بھیانک ماضی کو کینیڈا ہی چھوڑ آئی تھی۔سلمان نے ٹورنٹو میں اس سے شادی کر لی تھی ہوائی سفر کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی کا ایک نیا خوشگوار اور دلفریب سفر بھی شروع ہو چکا تھا اس طرح جوں جوں جہاز منزل کی طرف بڑھ رہا تھا سیبی اور سلمان کے برسوں پر محیط فاصلے بھی سمٹ رہے تھے۔